ایوب خان کی آپ بیتی

ایوب خان کی آپ بیتی

تصنیف

فیلڈ مارشل محمد ایوب خان

شاہکار بک فاؤنڈیشن

حاجی بلڈنگ حسن علی آفندی روڈ کراچی نمبر ۱

ٹیلی فون : ۲۱۸۵۱۵

طباعت

انٹرنیشنل پریس

۱ آئی آئی چندریگر روڈ، کراچی

شاہکار یہ

پندرہ سولہ برس پہلے جب یہ خبر آئی کہ پاکستان رائٹرز گلڈ کے ایک رکن محمد ایوب خان کی سوانح حیات ایک غیر ملکی ادارے اسفورڈ یونیورسٹی پریس سے بڑی شان و شوکت اور تمام جھام کے ساتھ عنقریب چھپنے والی ہے تو بعض اور لکھنے والوں کی طرح میں نے بھی مارے حسد کے ایک فریادی مضمون لکھ مارا تھا اور گلڈ کے اُس وقت کے سربراہوں (جناب قدرت اللہ شہاب، جمیل الدین عالی، ابن انشا، شوکت صدیقی وغیرہم) سے دست بستہ اپیل کی تھی کہ اگر گلڈ کا ایک رکن اپنی اعلیٰ سرکاری حیثیت و مرتبے کو بروئے کار لاتے ہوئے کسی بڑے غیر ملکی ادارے سے کتاب چھپوایا کرے گا تو گلڈ کے دوسرے غریب ارکان کو ایک خلش، شکایت، محرومی اور سبکی محسوس ہوگی۔ شاید اپنی ناداری کا بھی خیال پیدا ہو جس کے ڈانڈے اپنے ملک کی ناداری سے ملتے ہوئے نظر آئیں بس چاہیئے کہ آپ لوگ اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے مصنف کو یہ کتاب اپنے ہی ملک کے کسی اشاعتی ادارے سے چھپوانے کی ترغیب دیں۔

بہر صورت یہ کتاب انگریزی میں بھی اور اردو میں بھی ڈی لکس ایڈیشن میں بھی اور لائبریری ایڈیشن میں بھی شائع ہوئی تھی۔ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس نے اپنی دیرینہ روایات کے مطابق بلاشبہ بڑی خوبصورتی اور دیدہ زیبی سے پیش کی تھی۔ لیکن جیسا کہ عام طور پر کہا جاتا ہے حکومت کے کاموں میں برکت نہیں ہوتی۔ اس کتاب کا بھی یہی حشر ہوا کہ محمد ایوب خان ابھی کرسئ صدارت ہی پر متمکن تھے کہ یہ کتاب فٹ پاتھوں پر ردی فروشوں کے ہاتھوں کوڑیوں کے مول فروخت ہوتی رہی اور اس کی جو صحیح قدر و منزلت ہونی چاہیئے وہ نہ ہو سکی۔

کتاب کی صحیح قدر و منزلت کیا ہے؟ یہ کہ وہ پڑھی جائے۔ وہ کتاب ہی کیا جو مفت تقسیم ہو یا کوڑیوں کے مول فروخت ہو یا اداروں کو زبردستی بھیجی جائے۔ کتاب خواہ کتنی بھی حسین و جمیل اور دلکش اور بلند پایہ ہو، اگر پڑھی نہ جائے تو میرے خیال میں وہ کتاب کی تعریف سے باہر ہے۔ ہم یہ کتاب اب اس یقین کے ساتھ شائع کر رہے ہیں کہ اس کا یہ شاہکار

ایڈیشن پڑھا بھی جائے گا۔
یہ کتاب ہم پیپر بیک کی صورت میں اس لیے شائع نہیں کر رہے کہ ثابت کیا جائے کہ محمد ایوب خان ڈکٹیٹر تھے یا رحم دل جمہوریت نواز۔ یہ دانش وروں کی بحث ہے یا پڑھے لکھوں کی چھیڑ۔ وجۂ اشاعت صرف اتنی ہے کہ یہ کتاب ہماری رائے میں پاکستانی سیاسیات کی تاریخ میں ایک اہم اور ضروری منزل کا درجہ رکھتی ہے۔ خالص عوامی سطح پر آج بھی مرحوم کو چاہا جاتا ہے۔ اُن کی عزت کی جاتی ہے۔ ملک کے ہر شہر اور قصبے میں لاریوں اور بسوں میں حجاموں، پان فروشوں حلوائیوں اور دوسری چھوٹی موٹی دکانوں اور بازاروں میں ایوب خان کی رنگین تصویریں احتراماً آویزاں نظر آتی ہیں۔ عامتہ الناس کا حافظہ بھی عجیب چیز ہے۔ وہ ایک دوسرے سے یہ اکثر کہتے سنے جاتے ہیں کہ پاکستان میں ایک ایوب خان کا زمانہ ہی سنہری زمانہ تھا۔
اُن کی خوبیوں اور خامیوں سے قطع نظر اُن کی حب الوطنی اور شرافت نفسی کی قسم کھائی جاسکتی ہے۔ موجودہ سیاسی خلا کو عام شہری کا لاشعور جن جن چیزوں سے پُر کر لیتا ہے اُن میں ایوب خان کی یاد بھی شامل ہے۔ اس قیمتی سیاسی دستاویز کو گاؤ خُردنہ ہونا چاہیے۔ اس کا محفوظ رہنا ضروری ہے کیونکہ اس کے مطالعے سے ہماری سیاست، ہمارے سیاست دانوں کی افتادِ طبع اور ہمارے سیاسی رویوں کی شناخت و تشخیص میں مدد ملتی ہے۔
اس کتاب کی ایک بڑی خوبی، جو اُس زمانے کی پبلسٹی کے نیچے دب کر رہ گئی تھی، اس کا اُردو ترجمہ ہے جو "آنندی" کے خالق اور اُردو کے عظیم افسانہ نگار جناب غلام عباس کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے۔ فنِ ترجمہ کے لحاظ سے یہ کتاب اُردو کے بڑے تراجم کی فہرست میں شامل ہونی چاہیئے۔ صحت، سلاست، روانی، ابلاغ اور لب و لہجے کے اعتبار سے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اُردو ترجمہ اصل انگریزی پر حاوی ہو گیا ہو۔
"شاہکار" چونکہ اپنی مطبوعات میں ارزانی قیمت پر زور دیتا ہے اس لیے پورے متن کو دس روپے کی لگی بندھی حدود میں رکھنے کی خاطر ہمیں مجبوراً وہ باب حذف کرنا پڑا جو خارجہ پالیسی سے متعلق ہے۔
باقی آپ جانیں، کتاب جانے۔

آپ کا
سید قاسم محمود

فیلڈ مارشل جنرل محمد ایوب خان اپنی والدہ محترمہ کی خدمت میں

بچپن سے جوانی تک

اکثر اوقات لوگوں نے مجھ سے فرمائش کی ہے کہ میں اپنے سوانح حیات قلم بند کروں، بھلا ہین ہنگامۂ حیات کے درمیان یہ کیسے ممکن ہوا کرتا ہے؟ پھر اشاعت کے لیے جو چیز لکھی جاتی ہے اس میں کچھ نہ کچھ نمود و نمائش کا شائبہ ضرور پیدا ہو جاتا ہے، اور یہ بات میری طبیعت کے خلاف ہے میں زندگی بھر اپنے فرائض کے تقاضے سے جو کچھ بھی کیا وہ خاموشی و کم گوئی کے ساتھ کیا اور اپنے تجربے و مشاہدے کی باقاعدہ یادداشت بھی نہیں رکھی۔

حکومت کے ساتھ مجھے ۱۹۵۱ء سے گہرا تعلق رہا ہے، جبکہ میں پاکستانی افواج کا کمانڈر ان چیف مقرر کیا گیا تھا۔ اور اکتوبر ۱۹۵۸ء کے انقلاب کے بعد سے تو میں ہی حکومت کے نظم و نسق کا ذمہ دار ہوں۔ اس عرصے میں بہت سی باتیں واقع ہوئیں، اچھی بھی اور بُری بھی۔ شاید اس کو تحریر میں لانا مفید ہوتا۔ لیکن سوال یہ تھا کہ ماضی کا جائزہ لینے کے لئے وقت کہاں سے آئے۔ قدرت نے یہ مسئلہ یوں حل کر دیا کہ جون ۱۹۶۴ء میں جب میرا آپریشن ہوا تو مجھے صحت کی بحالی کیلئے مجبوراً کچھ دن مری میں آرام کرنا پڑا۔

میری زندگی ہمیشہ مصروف، باعمل اور واقعات و مشاغل سے پُر رہی ہے۔ بے عملی کا ایک مختصر وقفہ مجھے اس وقت یاد آتا ہے، یعنی وہ گھنٹہ جو میں نے ایک شام کاکس بازار کے مہمان خانے کے احاطے میں اکیلے بیٹھ کر گزارا تھا۔ میں چپ چاپ بیٹھا اپنے ارد گرد کی خاموشی کو اپنے میں جذب کرتا رہا۔ دور سمندر کی بے خروش موجیں خلیج بنگال کے ساحل کی نرم ریت پر دھیرے دھیرے بل کھا رہی تھیں۔ لمحہ بھر کے لئے زندگی کے ہنگامے جیسے تھم گئے اور میں سمندر کی خاموشی میں ڈوب گیا۔ اس مختصر سے تجربے کے ماسوا مجھے زندگی میں ہمیشہ فرائض کے مسلسل اور شدید تقاضوں کا سامنا رہا ہے۔

میں ۱۴ مئی ۱۹۰۷ء کو ریحانہ نامی گاؤں میں پیدا ہوا تھا۔ یہ رمضان کے مہینے کا آخری

دن تھا اور گھر کے لوگ عید الفطر کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ میرے والد کے چار بچے پہلی بیوی سے تھے، جو فوت ہو چکی تھیں۔ میں ان کی دوسری بیوی سے پہلی اولاد تھا۔

بچپن کی جو باتیں میرے ذہن پر نقش ہیں ان میں ایک پرندے کی یاد بھی ہے جو ہر روز صبح سویرے آکر چہچہایا کرتا تھا۔ یہ اس بات کا اشارہ ہوتا کہ مدرسے جانے کا وقت آگیا۔ اب بستر سے اٹھا دیا جائے گا۔ اور جلد از جلد منہ ہاتھ دھو کر خچر کی پیٹھ پہ چار میل کا سفر طے کرنا ہو گا۔ اب بھی جب کبھی اس پرندے کی آواز میرے کان میں پڑتی ہے، مجھے گھبراہٹ سی ہونے لگتی ہے۔

ریحانہ مغربی پاکستان میں راولپنڈی سے کوئی پچاس میل شمال کی طرف ایک چھوٹا سا خوش منظر گاؤں ہے۔ اس کے ارد گرد اونچی نیچی پہاڑیوں کا ایک سلسلہ ہے اور کچھ دور پہ ہمالیہ کی ڈھلانیں دکھائی دیتی ہیں جو صنوبر کے پیڑوں سے ڈھکی ہوئی ہیں میرے آباؤ اجداد افغانستان سے آکر اسی علاقے میں بس گئے تھے۔

میری والدہ ایک سیدھی سادی خاتون تھیں جنہوں نے اپنی ساری زندگی گاؤں میں ہی گزاری تھی۔ وہ مرتے دم تک ہمارے چھوٹے سے آبائی گھر ہی میں رہیں۔ اور مقدور بھر گاؤں والوں کی خدمت کرتی رہیں۔ وہ بڑے مضبوط ارادے کی خاتون تھیں۔ ان کے ہوش و حواس آخری وقت تک بجا رہے۔

مجھے اپنے چھوٹے بھائی کی پیدائش اچھی طرح یاد ہے۔ میری عمر اس وقت کوئی دو ڈھائی برس کی تھی۔ پہلی مرتبہ جب میں نے اس بچے کو اپنی ماں کے پہلو میں لیٹے دیکھا تو بے اختیار چھڑی اٹھائی، اور اسے مارنا چاہا۔ لیکن مجھے فوراً وہاں سے ہٹا دیا گیا۔ اپنی ماں کے پہلو میں کسی اور بچے کو سوتے دیکھنا میرے لیے بڑی اذیت کی بات تھی۔ مجھے اس احساس کو اپنے دل سے نکالنے میں بڑا وقت لگا۔ یہ واقعہ میرے ذہن میں آج تک محفوظ ہے۔

میں اپنی والدہ سے بہت مانوس تھا لیکن جس شخص نے میری سیرت میرے خیالات اور زندگی کے بارے میں میرے نقطہ نظر پر سب سے زیادہ اثر ڈالا وہ میرے والد مرحوم تھے۔ وہ مشہور رسالے "ہوڈسن ہارس" میں رسالدار میجر تھے۔ جسمانی لحاظ سے وہ بڑے طاقتور انسان تھے۔ گاؤں والے ان سے ڈرتے اور ان کی بڑی عزت کرتے تھے۔ لیکن میرے ذہن میں ان کی جو تصویر ابھرتی ہے وہ ایک انتہائی شریف، پاکباز اور شفیق دوست

کی ہے۔ وہ ذی احساس ہمدرد اور وضعدار آدمی تھے۔ ان کے پاس بیٹھ کر مجھے ہمیشہ بڑی ذہنی آسودگی ہوتی تھی۔

ان کے اندر مسلم قومیت کا ایک مبہم مگر گہرا احساس اور بڑا قومی جذبہ تھا۔ مجھے یاد ہے ایک دفعہ ۱۹۱۹ء یا ۱۹۲۰ء میں ایک عالم صاحب مانسہرہ سے ان سے ملنے آئے اور کہنے لگے "ہندوستان دارالحرب ہے۔ اس کے حکمران کافر ہیں۔ اس لئے ہم کو اس ملک سے ہجرت کر جانا چاہیئے۔"

میرے والد نے کہا "مولوی صاحب میری یہ بڑی آرزو ہے کہ میں اسلام کے جھنڈے کے نیچے جان دوں۔ لیکن وہ جھنڈا ہے کہاں؟ آج کوئی ایسا اسلامی ملک نہیں جو آزاد ہو۔ سب مغربی طاقتوں کی ہوس ملک گیری کا شکار ہیں۔"

میرے والد صوم و صلوٰۃ کے بڑے پابند تھے۔ نماز کبھی قضا نہ ہونے دیتے اور خاصی باقاعدگی سے تہجد بھی پڑھا کرتے تھے۔ مجھے یاد ہے ایک مرتبہ آدھی رات کو میری آنکھ کھل گئی تو میں نے دیکھا کہ ان کا بلند و بالا ہیکل میری چارپائی کے پاس کھڑا ہے اور سر دعا میں جھکا ہوا ہے۔ میں جانتا تھا کہ وہ میرے ہی لئے مصروف دعا ہیں لیکن میں نے بستر پر جنبش تک نہ کی، تاکہ ان کا دھیان نہ بٹے۔

مجھے اپنے خاندانی حالات زیادہ تر اپنے والد ہی سے معلوم ہوئے۔ ہمارا تعلق ترین قبیلے سے جو ہزارہ اور کیمبل پور۔ ضلع کے بعض حصوں پر حکمران تھا اور مدتوں سکھوں اور انگریزوں کے خلاف برسرپیکار رہا۔ اس قبیلے کے لوگ پشین سے آئے تھے، جو اب بلوچستان میں ہے اور ابتداء میں افغانی سلطنت کا ایک حصہ تھا۔

اپنے بزرگوں میں سے ایک شخص کے حالات زندگی مجھے بہت محو حیرت کرتے تھے۔ اس شخص کا نام سردار محمد خان ترین تھا۔ یہ شجاعت اور بلند ہمتی میں اپنی مثال آپ تھا۔ یہ سردار نجیب اللہ خان ترین کا سب سے بڑا بیٹا تھا۔ اسے مقامی قبائل گوجر، دلازاک، جدون اور اتمان زئی کے ہاتھوں بڑی پریشانیاں اٹھانی پڑیں مگر اس نے ان بغاوتوں کو کچل کر انہیں زیر کر لیا۔ انیسویں صدی کے ابتدائی بیس پچیس سالوں میں سکھوں نے کئی مرتبہ اس پر چڑھائی کی مگر اس نے کمال شجاعت سے ان کا مقابلہ کیا۔ ۲۲ء میں ہری سنگھ نلوہ جو کشمیر کا گورنر تھا ترین سردار کو نیچا دکھانے کے لئے ہزارہ پر چڑھ آیا۔ مگر اس کی کوشش ناکام ثابت ہوئی۔ اس پر مہاراجہ رنجیت سنگھ کو طیش آیا اور اس نے خود ایک بھاری فوج لے کر ہزارہ پر چڑھائی

کر دی۔ سردار محمد خان گرفتار ہو کر لاہور میں لایا گیا۔ ہری سنگھ نے اسے پچاس ہزار روپے میں خرید لیا۔ اور ضلع راولپنڈی کے مقام روات میں لے گیا۔ ہری سنگھ چاہتا تھا کہ سردار اپنے علاقے میں سکھوں کی فرماں روائی قبول کرلے مگر اس نے منظور نہ کیا۔ آخر اسے ایک اندھے کنوئیں میں ڈال دیا گیا۔ وہاں اسے نمکین روٹی کھانے کو دی جاتی۔ مگر پینے کو پانی نہ دیا جاتا۔ سردار نے بھوک پیاس سے جان دے دی مگر سکھوں کی اطاعت قبول نہ کی۔

کچھ عرصے بعد جب انگریزوں نے ضلع ہزارہ پر قبضہ کرنا چاہا تو ہمارے قبیلے کے لوگوں نے ان کا بھی سخت مقابلہ کیا۔ خاندان کے سردار اور اس کے ساتھیوں کو گرفتار کر لیا گیا اور الہ آباد کے قلعہ میں قید کر دیا گیا۔ میں نے ۱۹۲۶ء میں ان کی قبریں دیکھیں۔ میں نے سنا کہ سردار قبیلہ کو تو توپ کے دھانے سے باندھ کر اڑا دیا گیا تھا اور باقیوں کو سخت اذیتیں پہنچائی گئی تھیں۔

میرے والد کا کنبہ وسیع تھا اور پنشن اور زمینوں کی آمدنی محدود۔ لیکن انہوں نے اپنے جی میں ٹھان رکھی تھی کہ مجھے اچھی تعلیم دلوائی جائے۔ اس کے علاوہ انہیں اس کا بھی بڑا خیال تھا کہ میں اسلامی اصول و عقائد سے بے بہرہ نہ رہوں۔ وہ مجھے حافظ قرآن بنانا چاہتے تھے۔ اس مقصد کے لیے گاؤں کے مولوی صاحب کو منتخب کیا گیا۔ پہلے روز جب مجھے قرآن شریف پڑھنے مسجد میں بھیجا گیا تو گھر میں بہت چہل پہل رہی۔ میری عمر اس وقت چار سال چار مہینے اور چار دن کی تھی۔ مٹھائی بانٹی گئی اور مجھے مولوی صاحب کے سپرد کیا گیا۔ لیکن یہ انتظام کچھ زیادہ کامیاب نہیں ہوا۔ میں مولوی صاحب کی نگرانی میں دو تین مہینے میں قرآن کی جس قدر سورتیں حفظ کر سکا ان کا بھی تلفظ صحیح نہ تھا۔ مولوی صاحب مجھ سے کچھ زیادہ خوش نہ تھے۔ کیونکہ وہ مجھے جو کچھ پڑھاتے تھے میں ان سے اس کے معنی پوچھا کرتا تھا۔

ایک دفعہ ایک ایسے ہی موقع پر انہوں نے مجھے چانٹا رسید کر دیا۔ جواب میں میرا ہاتھ بھی اٹھ گیا۔ میری یہ حرکت کچھ اچھی تو نہ تھی لیکن اس طرح مولوی صاحب سے میرا استاد شاگردی کا رشتہ جس کو قائم ہوئے کچھ زیادہ دن نہیں ہوئے تھے۔ اچانک ٹوٹ گیا۔

اس کے بعد مجھے ایک اور گاؤں میں بھیجا گیا جو دو میل کے فاصلے پر تھا۔ اس گاؤں کا نام کوکا تھا۔ وہاں کے مولوی صاحب بڑے بزرگ آدمی تھے۔ میں ان کا بہت ادب کیا کرتا تھا۔ مگر ساتھ ہی ان سے ڈرا بھی بہت کرتا تھا۔ میں نے کچھ عرصہ ان سے قرآن شریف پڑھا۔ اور اتنا کچھ پڑھ لیا جتنا کہ میری عمر کا بچہ پڑھ سکتا تھا۔ لیکن اس عرصے میں میرے والد اس نتیجہ پر پہنچ چکے تھے کہ اور چاہے جو کچھ بن جائے حافظ قرآن نہیں بن سکتا۔

اب میرے گھر والوں کی رائے ہوئی کہ مجھے کسی باقاعدہ اسکول میں بھیجنا چاہیئے چنانچہ مجھے ایک اسکول میں داخل کر دیا گیا جو ہمارے گھر سے چار میل کے فاصلے پر سرائے صالح میں تھا۔ اب ہر روز تڑکے تڑکے جگایا جانا اور خچر پر سوار کرایا جانا میرا معمول بن گیا جو خاصا کٹھن تھا۔ میری والدہ ہر روز میرا قاعدہ اور قلم دوات اور کچھ کھانے کی چیزیں جنہیں وہ میرا "راشن" کہا کرتیں، ایک تھیلے میں رکھ دیتیں اور میں روانہ ہو جاتا۔

وہ سڑک جو بل کھاتی ہوئی ہمارے گھر سے اسکول تک جاتی تھی بڑی خوبصورت تھی، لیکن خچر کی ٹھکیلیاں مجھے اتنا موقع ہی نہ دیتیں کہ میں دور دور تک پھیلے ہوئے ہرے بھرے کھیتوں یا پہاڑیوں سے لپٹے ہوئے نرم بادلوں کے نظارے سے لطف اٹھا سکتا۔ میں سہ پہر کو تین بجے کے قریب تھکا ہارا گھر واپس آیا کرتا۔ خوش قسمتی سے میری نانی نے میرے والد کو اس بات پر راضی کر لیا کہ مجھے ہری پور کے ایک اسکول میں داخل کرا دیا جائے اور میں نانی اماں کے ساتھ درویش میں رہا کروں جہاں سے یہ اسکول قریب ہی تھا۔

میں پڑھنے میں کچھ تیز نہیں تھا۔ اور نہ لکھنے پڑھنے میں میرا جی کچھ زیادہ لگتا تھا۔ مجھے کھلی ہوا کی زندگی بے حد پسند تھی۔ میرے ایک رشتے دار باز اور کتے پالا کرتے تھے۔ مجھے اور کیا چاہیئے تھا میں اسکول سے کھسک جاتا۔ اور ان کے بازوں کی دیکھ بھال کیا کرتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں چھٹی جماعت کے امتحان میں فیل ہو گیا۔ اس وقت میری عمر گیارہ برس کی تھی۔ جب والد کو علم ہوا کہ میں کس طرح وقت گنواتا رہا ہوں تو انھوں نے میری خوب مرمت کی۔ اس کے بعد پڑھنے لکھنے میں دھیان دینے ہی لگا اور خاصی آسانی سے پڑھنے میں دل لگ گیا۔ میں نے اسکول کی تعلیم سیکنڈ ڈویژن میں اچھے نمبر حاصل کر کے پوری کر لی۔ مجھے اس کے لئے کچھ زیادہ محنت نہیں کرنی پڑی۔ میں حساب یا جیومیٹری میں تو زیادہ ہوشیار نہیں تھا۔ البتہ الجبرا میری سمجھ میں زیادہ اچھی طرح آتا تھا اور جغرافیہ، انگریزی، فارسی، اور اردو پڑھنے میں مجھے لطف آتا تھا۔

اس اسکول میں کھیلوں کا کوئی انتظام نہیں تھا لیکن ہم سب لڑکے گلی ڈنڈا اور گولیوں کے کھیل میں خاصی دلچسپی رکھتے تھے۔ بعد میں میں نے ہاکی کھیلنا بھی سیکھ لیا۔

گھوڑے کی سواری تو گویا میری گھٹی میں پڑی تھی۔ ہر صبح خچر کی سواری نے ضروری مشق بھی بہم پہنچا دی۔ اس زمانے میں فوج کا محکمہ زمینداروں سے گھوڑے خریدا کرتا تھا اور میرے والد کے پاس بھی ان کی خاصی تعداد موجود تھی۔ میری عمر کوئی آٹھ یا نو سال کی ہو گی کہ ایک دن میں نے والد کی اجازت کے بغیر اصطبل سے پولو کا ایک ٹٹو نکالا اور اس پر سوار ہو کر اپنی بہن سے

سے ملنے چل کھڑا ہوا جو قریب ہی کے ایک گاؤں میں رہتی تھی۔ ہمارے علاقے میں پہاڑیوں کے دامن کی زمین بڑی سنگلاخ ہوتی ہے۔ میں واپسی پر ایک نشیب سے اتر رہا تھا کہ اچانک جھاڑی سے ایک پرندہ زور سے پھڑپھڑا کر اڑا۔ اس سے گھوڑا بدک کر اپنی پچھلی ٹانگوں پہ کھڑا ہو گیا۔ میں نیچے آ رہا اور میرا بایاں پاؤں رکاب میں پھنس کر رہ گیا۔ گھوڑا بھاگا اور میں اس کے ساتھ ساتھ کافی دور تک خاردار جھاڑیوں میں گھسٹتا رہا۔ اس کو میری خوش قسمتی کہیے کہ رکاب کا کلپ اپنے آپ سیدھا ہو گیا۔ رکاب باہر نکل آئی اور ساتھ ہی میرا پاؤں بھی آزاد ہو گیا۔ میں گھنٹوں زمین پر بے ہوش پڑا رہا۔

ادھر گھوڑا جب سوار کے بغیر گھر پہنچا اور اس کی ایک رکاب بھی غائب پائی گئی تو سب کو بے حد فکر ہوئی۔ اور لوگ میری تلاش میں نکلے۔ آخر مجھے جھاڑیوں میں سے ڈھونڈ نکالا گیا۔ اگر میں چار منٹ اور یونہی گھسٹتا رہتا تو ہرگز زندہ نہ بچتا۔ میری ہڈی پسلی تو کوئی نہیں ٹوٹی۔ ہاں پیٹھ پر بری طرح خراشیں آگئی تھیں جس کی وجہ سے مجھے چھ ہفتے تک سینے کے بل سونا پڑا۔

مجھے اسکول کی زندگی کافی پرلطف معلوم ہوئی۔ یہ اسکول سکھوں نے جاری کر رکھا تھا۔ اس میں جتنے استاد تھے ماسٹر سبحان سنگھ کو چھوڑ کر باقی سب بے حد شفیق تھے اور ہر ایک سے بڑی رواداری برتتے تھے۔ ماسٹر سبحان بڑے ظالم آدمی تھے۔ مانیٹر سمیت ساری جماعت کی پٹائی کر دینا ان کے لیے معمولی بات تھی۔ اور مجھے کئی بار مانیٹر بننے کا شرف حاصل ہو چکا تھا۔ جماعت میں جب کوئی اونچ نیچ ہو جاتی تو سب سے پہلے مانیٹر ہی کی شامت آتی تھی۔

مجھے یاد ہے ایک دن جبکہ خوب بارش ہوئی تھی ماسٹر صاحب اسکول تشریف نہیں لائے۔ لڑکے کہنے لگے خدا کرے وہ مر گئے ہوں۔ اور انہوں نے یہ کام میرے سپرد کیا کہ میں جاکر ماسٹر صاحب کے نہ آنے کا سبب معلوم کروں۔ جب میں ان کے گھر کے قریب پہنچا تو دیکھا کہ وہ ملبے کی ڈھیریوں کے درمیان زندہ سلامت کھڑے ان کا معائنہ کر رہے ہیں مگر کس قدر بدحواس ہیں۔ وجہ یہ تھی کہ بارش کی وجہ سے ان کے مکان کی چھت گر پڑی تھی۔ میں نے عرض کیا "سب لڑکے آپ کے اسکول نہ آنے سے سخت فکرمند ہو رہے ہیں۔ اب اگر آپ اجازت دیں تو ہم سب آکر آپ کا مکان بنانے میں مدد دیں۔" انہوں نے بڑے اکھڑ لہجے میں ہماری پیش کش کو نامنظور کر دیا۔ اور کہا بس تم واپس اسکول جاؤ۔ چنانچہ میں فوراً واپس پہنچا کہ اپنے ساتھیوں کو یہ خوشخبری سناؤں۔ ماسٹر صاحب دو ہفتے اسکول سے غیر حاضر رہے اور ہم نے یہ زمانہ بڑے سکھ چین سے گزارا۔

سکھ بڑی کشادہ دل قوم ہے۔ مجھے ان کی مذہبی رسوم اور ان کے پنجابی گیت بڑے دلچسپ معلوم ہوتے تھے۔ ایک گیت جو مجھے بہت پسند تھا اس کا ایک بول مجھے ابھی تک یاد ہے:

سو رنگ تماشے تکدے اکھیاں نئیں رجیاں

"زندگی ایک رنگارنگ تماشا ہے۔ آنکھیں طرح طرح کے نظارے دیکھتی ہیں مگر سیر نہیں ہوتیں"۔

میں نے اسکول میں ایک بہت اہم سبق سیکھا۔ وہ یہ کہ ہمیں انسان کو پرکھنے میں یہ نہیں دیکھنا چاہیئے کہ اس کی بود و باش کہاں کی ہے اس کا رنگ در وپ کیسا ہے اور وہ کس طبقے سے تعلق رکھتا ہے۔ میں نے زندگی بھر کبھی ان باتوں کو اہمیت نہیں دی۔ میرا یہ ایمان ہے کہ انسان کی قدر و قیمت کا اندازہ اس کی ذاتی قابلیت سے کرنا چاہیئے اس کے بہت عرصے بعد ایک مرتبہ مجھے خود اپنے بھائی کے خلاف جو فوج میں میجر تھا اور جس سے ایک سنگین بے قاعدگی سرزد ہوئی تھی۔ فیصلہ دینا پڑا کہ وہ یا تو استعفیٰ دے دے یا پھر فوجی عدالت میں پیش ہو۔ اس نے استعفیٰ دیدیا۔

میں ابھی اسکول ہی میں تھا کہ والد صاحب مجھ سے پوچھنے لگے "تم علی گڑھ جانا پسند کروگے؟" مجھے اچھی طرح معلوم نہ تھا کہ علی گڑھ کیا جگہ ہے اور کہاں واقع ہے؟ والد نے مجھے بتایا کہ وہاں مسلمانوں کی بڑی مشہور درسگاہ ہے۔ اس کا ماحول بڑا اسلامی ہے اسے مسلمانوں نے بڑی محنت اور صرفے سے قائم کیا ہے۔ وہ مجھے علی گڑھ بھیجنا چاہتے تھے تاکہ میرے دل میں اسلامی جذبہ پیدا ہو۔ ۱۹۲۲ء میں میں نے میٹرک پاس کیا۔ انہوں نے مجھے علی گڑھ جانے کا حکم دے دیا۔ انہیں اس بارے میں اتنی جلدی تھی کہ یونیورسٹی کھلنے سے ایک مہینہ پہلے ہی مجھے وہاں بھیج دیا۔

میں ایک ملازم کو ساتھ لے کر علی گڑھ پہنچا تو میں نے دیکھا کہ چار ہوسٹل پاس پاس تھے جن کو منٹو سرکل کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ یہ خالی پڑے تھے۔ اور خاصی دور دور الگ تھلگ واقع تھے۔ یہ جگہ بالکل ویران تھی۔ دو چار چوکیداروں کے سوا وہاں آدم زاد کی صورت نظر نہ آتی تھی۔ بس ہم تھے یا گیدڑ، کوّے اور جنگلی جانور۔ ہم نے ایک چوکیدار سے پوچھا کہ کیا ہمیں کہیں سے دو چار پائیاں مل سکتی ہیں۔ اس نے ایک کوٹھڑی کھولی تو اس میں چارپائیاں ہی چارپائیاں بھری تھیں۔ مگر کسی میں بھی ادوائن نہ تھی۔ چوکیدار نے بتایا کہ جب لڑکے گھروں کو جانے لگتے ہیں تو وہ سامان باندھنے کے لیے چارپائیوں سے ادوائن نکال لیتے ہیں۔ غرض ہم ان بے ادوائن کی چارپائیوں ہی پر سوئے، اس طرح کہ ہمارا دھڑ تو چارپائی پر تھا اور ٹانگیں زمین پر لٹک رہی تھیں۔

ہوسٹل میں ہم دونوں تقریباً تنہا تھے۔ ہمیں کھانے پینے کی چیزیں خریدنے کے لئے کافی دور چل کر جانا پڑتا تھا۔ میرے ملازم نے رائے دی کہ چونکہ یونیورسٹی ابھی مہینہ بھر تک بند رہے گی اس

لیے گھر لوٹ چلنا مناسب ہوگا۔ جی تو میرا بھی یہی چاہتا تھا لیکن والد صاحب کا سامنا کرنے کی ہمت نہ تھی۔ بھلا میں انھیں کیسے یقین دلاسکوں گا کہ میں علی گڑھ سے بھاگ نہیں آیا ہوں۔ میں نے ملازم سے کہا "نا بھائی میں واپس نہیں جاسکتا۔" چنانچہ یونیورسٹی کے کھلنے تک میں وہیں رہا۔

جوں جوں وقت گزرتا گیا میرے دل میں یہاں کے لوگوں اور یونیورسٹی کی محبت گھر کرتی گئی۔ یونیورسٹی کئی لحاظ سے اپنی مثال آپ تھی۔ یہاں ہندوستان کے کونے کونے نیز ایران اور افریقہ سے بھی لڑکے پڑھنے آتے تھے۔ وہ مختلف طبقوں سے تعلق رکھتے تھے۔ پھر ان کی بولیاں اور زبانیں بھی جدا جدا ہوتی تھیں مگر ان سب کو علی گڑھ کے ماحول سے خود کو مانوس کرنا پڑتا تھا۔ ان میں سے بعض کو یہاں کی زندگی بڑی کٹھن معلوم ہوتی تھی اور وہ بھاگ جاتے تھے۔ لیکن جو رہ جاتے، ان میں آپس میں مساوات، بھائی بندی اور رفاقت کا گہرا احساس پیدا ہوجاتا تھا۔ ان میں بعض ایسے بھی تھے جو کسی صورت یونیورسٹی کو چھوڑکر جانا ہی نہیں چاہتے تھے۔ جیسے اسلم صاحب، یہ خود تو دسویں جماعت میں تھے اور ان کا صاحبزادہ نویں میں پڑھتا تھا۔ وہ ہر سال باقاعدہ امتحان میں بیٹھتے تھے۔ جس زمانے میں میری ان سے ملاقات ہوئی وہ نو مرتبہ فیل ہوچکے تھے۔ وہ کہا کرتے "ان سب طالب علموں میں فقط میں ہی ایسا ہوں کہ بغیر کسی ذاتی غرض کے بغیر امتحان میں شریک ہوتا ہوں۔"

یہ جگہ اپنے اندر ایک خاص دل آویزی رکھتی تھی۔ مجھے اپنی ایک خامی کی وجہ سے یہاں شروع شروع میں خاصی پریشانی رہی۔ بات یہ تھی کہ میرا اردو کا تلفظ اور لب و لہجہ دوسرے لڑکوں سے کسی قدر مختلف تھا۔ اور میں اکثر مذکر و مونث کو گڈمڈ کردیا کرتا تھا۔ لڑکے اس پر ہنستے مگر میری سمجھ میں نہ آتا کہ ہنسی کی کیا بات ہے۔ بعض اوقات میں آزردہ بھی ہوجاتا۔ رفتہ رفتہ میں نے اپنے تلفظ کی خاصی اصلاح کرلی۔ ادھر وہ لوگ بھی میرے لب و لہجہ سے مانوس ہوگئے۔

یونیورسٹی میں قواعد کی پابندی اور باہمی سلوک کی ذمہ داری زیادہ تر طلباء کے اپنے ہی ہاتھ میں تھی۔ استادوں اور چھوٹی جماعت کے طالب علموں کے درمیان حقیقی رابطہ بہت کم تھا۔ استاد صاحبان مہربان تھے اور ہر طرح مدد دیتے تھے۔ مگر ان کی توجہ زیادہ تر پڑھانے ہی پر صرف ہوتی تھی۔ روزمرہ کے کام جن میں کھانے پینے کا انتظام، لباس اور لڑکوں کا ایک دوسرے کے ساتھ برتاؤ شامل تھا، ان کی دیکھ بھال اونچی جماعتوں کے طلباء کے سپرد تھی، اور یہ اس امر میں بہت سخت گیر تھے۔ اگر کوئی معیار یا روایات کے خلاف کوئی حرکت

کرتا تو اس سے سخت باز پرس کرتے تھے۔

یونیورسٹی کی زندگی میں ہنسی دل لگی کا عنصر بھی خاصا شامل تھا۔ ایک مقبول شرارت "فاختہ اڑانا" ہوا کرتی تھی۔ اس سے مراد یہ تھی کہ آدھی رات کو اچانک آپ کی چارپائی الٹ دی گئی اور رنگمسر یا خلافت میں لت پت پڑے ہیں۔ میں جانتا تھا کہ ایک نہ ایک دن میری باری بھی آنے والی ہے اور میں اس کے خیال سے ڈرتا رہتا تھا میری نیند بڑی ہلکی ہے۔ ایک رات میں نے کچھ یونہی سی آہٹ سنی تو میری آنکھ کھل گئی۔ دیکھتا کیا ہوں کہ چار پانچ لڑکے بالٹیاں اٹھائے میری چارپائی کے پاس کھڑے ہیں۔ میں یکبارگی ان میں سے ایک پر جھپٹ پڑا اور اسے تان کر گھونسا مارا۔ دوسرے لڑکے کو میں نے ایک لات لگائی۔ وہ لوگ اس کے لیے تیار ہو کر نہ آئے تھے اس لیے وہ میرا غصہ دھیما کرنے کے لیے بولے: "ارے بھئی تم تو ہمارے ہی ساتھیوں میں ہو۔ پھر یہ لڑنا بھڑنا کیسا؟"

میں یہ تو نہیں جانتا کہ میں نے علمی حیثیت سے علی گڑھ یونیورسٹی سے کیا کچھ سیکھا، لیکن یہ ضرور جانتا ہوں کہ میں نے وہاں دوسروں کے ساتھ مل جل کر رہنا سیکھ لیا۔ دوسروں کے نقطۂ نظر کو سمجھنا سیکھ گیا۔ علی گڑھ یونیورسٹی کی حیثیت میرے لئے ہمیشہ ایک مقدس زیارتگاہ کی سی رہی ہے۔

زندگی میں آگے چل کر ایک موقع ایسا آیا کہ میں یونیورسٹی کی کسی قدر خدمت کر سکا۔ یہ ۱۹۴۱ء کی بات ہے جب میں حیدرآباد میں اسسٹنٹ ریذیڈنٹ کا ایڈی کانگ تھا۔ سر راس مسعود علی گڑھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے وہ نظام سے یونیورسٹی کے لیے عطیہ لینے حیدرآباد آئے۔ نظام برطانیہ کے اس قدر زیر اثر تھے کہ ریذیڈنٹ کی اجازت کے بغیر کسی کام کی جرأت نہ کرتے تھے۔ راس مسعود ریذیڈنٹ سے ملنے آئے مگر اس کا یہ ہمدردانہ نہ تھا۔ کچھ عرصے کے بعد وہ پھر آئے۔ اب کے مجھے ان سے ملاقات کا موقع مل گیا۔ یونیورسٹی کے لیے ان کے دل میں جو درد تھا اس سے میں بہت متاثر ہوا۔ ادھر ریذیڈنٹ سر راس مسعود سے اب کچھ خیر بنرسا ہونے لگا تھا۔ میں نے موقع پا کر اس سے کہا: "آپ شاید یہ خیال کرتے ہوں گے کہ یہ شخص پیچھے پڑ گیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ اپنے دل میں یونیورسٹی کی خدمت کا بے پناہ جذبہ رکھتا ہے۔ اس یونیورسٹی کو اس کے دادا نے قائم کیا تھا۔ پھر اس کے والد نے بھی ساری عمر دہیں گزار دی تھی۔ نظام اپنا روپیہ ضائع ہی کریں گے کیوں نہ انہیں ایک اچھے مقصد کے لیے کچھ خرچ کرنے کا موقع دیا جائے؟"

آخر میں ریذیڈنٹ مان گیا، اور سر راس کو نظام سے مطلوبہ چندہ مل گیا۔ اس واقعے سے سر راس مسعود کے ساتھ میرے خاصے دوستانہ مراسم قائم ہو گئے میں اکثر ان سے ملنے جایا کرتا۔ وہ اگرچہ عمر میں مجھ سے بہت بڑے تھے، لیکن ہمیشہ التفات سے پیش آتے۔ ایک دفعہ میں نے انہیں لکھا کہ مسلمانوں میں سپاہ گری کا اعلیٰ جوہر موجود ہے۔ یونیورسٹی کو چاہیئے کہ وہ طلباء کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں ٹریننگ کور میں شامل ہونے کی ترغیب دے تاکہ فوج کیلیے موزوں نوجوان مہیا کیے جا سکیں۔

علی گڑھ میں میرے قیام کے آخری دنوں میں ایک کمیشن یونیورسٹی آیا۔ اس کے سربراہ جنرل سکین تھے جو فوج کے ایڈجوٹنٹ جنرل تھے۔ ان کے ساتھ دو تین ہندوستانی افسر تھے ان لوگوں کو ایسے نوجوانوں کی تلاش تھی جنہیں فوج میں بطور افسر بھرتی کیا جا سکے۔ اس زمانے میں ملک میں اس بات پر کافی ہیجان تھا کہ ہندوستانیوں کو فوج میں مناسب نمائندگی نہیں دی جاتی۔ جنرل سکین اور ان کے مشیروں نے اسٹریچی ہال میں ایک عام دربار کیا۔ یہ ۱۹۲۶ء کے ابتدائی زمانے کی بات ہے۔ میں اس وقت یونیورسٹی کی ٹریننگ کور کا ایک ممبر تھا۔ جنرل سکین نے مجھ سے پوچھا "کیا تم فوج میں جانا پسند کرو گے؟" میں نے کہا "ضرور پسند کروں گا" پوچھنے لگے "کیوں" اس پر میں نے اپنے خاندانی حالات بیان کئے اور اپنے والد کی فوجی خدمات کا ذکر کیا۔ کہنے لگے "تم عرضی بھیجو"۔ اس کے بعد ڈپٹی کمشنر نے اور پھر صوبے کے گورنر نے میرا انٹرویو لیا۔ آخری امتحان اور انٹرویو شملہ میں لیے گئے، جو گرمیوں میں فوج کا صدر دفتر ہوا کرتا تھا۔

میجر ڈین نے جو انٹرمیڈیٹ کالج کے پرنسپل تھے، مجھے سینڈہرسٹ کے امتحان کے لیے تیار کیا۔ یہ صورت ایک عجیب اتفاق سے پیدا ہوئی۔ ایک دن جب میں کلاس روم سے باہر نکل رہا تھا تو میجر ڈین نے مجھے غلام گردش میں روک لیا، اور چلا کر کہا "تم ابھی تک یہیں ہو میں نے تم سے کہا نہیں تھا کہ فوراً چلے جاؤ؟"

میں بھونچکا رہ گیا۔ میں نے کہا "آپ نے مجھ سے ایسا کبھی نہیں کہا تھا۔ آخر میں کیوں چلا جاؤں؟ میں نے کیا قصور کیا ہے؟"

اب میجر ڈین کی باری بھونچکا ہونے کی تھی۔ انہوں نے چار پانچ طالب علموں سے میری شناخت کرائی اور انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ واقعہ یوں تھا کہ کسی اور لڑکے کو جس کی صورت مجھ سے ملتی جلتی تھی، یونیورسٹی سے نکالا گیا تھا۔

میجر ڈین بہت سٹ پٹائے۔ وہ چاہتے تھے کہ کوئی موقع ملے تو اپنی اس حرکت

کی تلافی کریں۔ ایک دن جب ہم دینیات کا درس لے رہے تھے تو وہ جماعت میں داخل ہو کر میرے پاس آکھڑے ہوئے۔ ہمارے مولوی صاحب کی توند بہت نکلی ہوئی تھی اور ڈاڑھی بھی بڑی تھی جس سے وہ بالکل "سانٹا کلاز" معلوم ہوتے تھے۔ وہ ہمیں بس دینیات ہی سا پڑھایا کرتے تھے۔ میجر ڈین ان سے کہنے لگے "مولانا صاحب! مہربانی کر کے ذرا اپنا لیکچر بند کیجئے۔" پھر وہ میری طرف مخاطب ہو کر بولے "اس دن جو مجھ سے وہ بے رحمی کی بات ہو گئی تھی میں اس کی تم سے معافی چاہتا ہوں۔"

میجر ڈین نے مجھے سینڈھرسٹ کے امتحان کے لیے تیار کرنے کا ذمہ لیا۔ وہ ہر روز اپنا دو تین گھنٹے کا وقت مجھ پر صرف کرتے۔ یہ سلسلہ تین چار مہینے تک جاری رہا۔ اس وقت تک میں یونیورسٹی کے درجے تک پہنچ گیا تھا۔ چنانچہ وہ یا تو میرے کمرے میں آجایا کرتے یا مجھے اپنے ساتھ گھر لے جاتے۔

آخر جون ۱۹۲۷ء میں مجھے اطلاع ملی کہ مجھ کو سینڈھرسٹ میں داخلے کے لیے چن لیا گیا ہے۔ قدرتی طور پر میری خوشی کا کچھ ٹھکانا نہ تھا۔ ساتھ ہی اس بات پر بھی میں نے اطمینان کا سانس لیا کہ اب مجھے بی۔ اے کا امتحان نہیں دینا پڑے گا۔

اپنے ذاتی جذبات اور فوج میں اپنی دلچسپی سے قطع نظر میں نے یہ بھی اندازہ کیا کہ بہت کم ہندوستانیوں اور خاص کر مسلمانوں کو فوج میں کمیشن دیا گیا ہے۔ میں جانتا تھا کہ جب ہمیں آزادی ملے گی تو ہمیں اس کی حفاظت کرنا بھی لازم ہو گا، اور اس طرح میری سینڈھرسٹ کی فوجی تربیت سے ہمارا ملک پورا پورا فائدہ اٹھا سکے گا۔

سینڈھرسٹ جانے کا فیصلہ میں نے خود کیا تھا۔ والد صاحب کی رائے یہ تھی کہ پہلے میں اپنی تعلیم مکمل کر لوں، اور پھر اپنے لیے پیشے کا انتخاب کروں۔ ایک اور بات جس سے وہ پریشان تھے یہ تھی کہ اس تعلیم کا خرچ بہت زیادہ تھا۔ مجھے سینڈھرسٹ کے کورس کے لیے کوئی پچیس ہزار روپے کی ضرورت تھی۔ میرے والد کو زمینوں سے کافی آمدنی ہوتی تھی لیکن ان کی کئی اولادیں تھیں جن کو تعلیم دلانا ضروری تھا۔ اس لیے اتنی بڑی رقم صرف مجھ پر صرف کر دینا آسان بات نہ تھی۔ انہوں نے اس مسئلے کا وہ حل سوچا جو وہی سوچ سکتے تھے۔ کہنے لگے "میں اپنی ساری زمینیں اور جائداد بیچ ڈالوں گا تاکہ تمہاری آرزو پوری ہو جائے۔" خوش قسمتی سے میں سینڈھرسٹ میں بہت کامیاب رہا۔ میں نے کئی وظیفے حاصل کئے۔ چنانچہ اس قربانی کی ضرورت ہی نہ پڑی۔

فوجی زندگی کا ابتدائی دور

میں جولائی ۱۹۲۶ء میں انگلستان روانہ ہوا۔ مجھے ابھی تک یاد ہے کہ جب میں سینڈہرسٹ جانے کے لیے بمبئی سے جہاز ایس۔ ایس۔ راولپنڈی میں سوار ہوا تو میرے جوش و خروش کی حد نہ تھی۔ یہ مون سون کا زمانہ تھا۔ جیسے ہی جہاز بندرگاہ سے روانہ ہوا موسم طوفانی ہو گیا۔ بہت سے مسافروں کو متلی ہونے لگی۔ میں بھی ان ہی لوگوں میں تھا۔ میں نے اپنا بستر اٹھایا اور عرشے پر پہنچ گیا اور تین دن اور تین راتیں وہیں گزاریں یہاں تک کہ ہم عدن پہنچ گئے۔ اس کے بعد ہر بات میں بڑے ڈرامائی انداز سے تبدیلی ہو گئی۔ موسم اچھا ہو گیا۔ سمندر میں سکون آگیا اور ہم کو سفر میں مزا آنے لگا۔

جب ہم سینڈہرسٹ پہنچے تو کالج ابھی کھلا نہیں تھا۔ ہمیں دس روز تک ایک چھوٹے سے ہوٹل میں رہنا پڑا جس کا نام ڈیوک آف یارک تھا۔ اس ہوٹل کا انتظام ایک بوڑھی خاتون کے ہاتھ میں تھا۔ ان خاتون کی انتہائی کوشش تھی کہ ہم لوگ یہاں قاعدے سے رہیں۔ چنانچہ وہ دن رات ہمیں نصیحتیں کیا کرتیں اور لمبے لمبے لیکچر دیا کرتیں کہ ہم لوگوں کو کیا کیا باتیں کرنی چاہئیں اور کیا نہ کرنی چاہئیں۔ مجھے یاد ہے ہم نے سمجھ لیا تھا کہ ہمیں انگلستان میں بہت ہی احتیاط سے اور بہت ہی سنبھل کر رہنا ہو گا۔

یہ تو مجھے پہلے ہی سے اندازہ تھا کہ سینڈہرسٹ کی زندگی آسان نہ ہو گی۔ لیکن یہ جس قدر سخت نکلی اس کا ہمیں پہلے سے کسی گمان نہ تھا۔ پہلے پہل تو مجھے شک گزرا کہ میں اتنی محنت برداشت بھی کر سکوں گا یا نہیں۔ لیکن جلد ہی میں نے خود کو یہاں کے حالات کے مطابق ڈھال لیا۔

میری جسمانی صحت اعلیٰ درجے کی تھی۔ اس پر سینڈہرسٹ کی محنت مشقت کی زندگی نے مجھے اور بھی چاق و چوبند بنا دیا اور میں پندرہ میل کی دوڑ سے بھی لطف لینے لگا۔

ہمارے قیام کے پہلے دو ہفتوں میں دوسرے درجے کے کیڈٹوں نے ہمیں ہتھیاروں کے ساتھ قواعد کا نمونہ دکھایا۔ ہم ان کی ہنرمندی اور چابکدستی پر ششدر رہ گئے۔ لیکن ایک ہی

مہینے کے اندر جب ہمارا ان سے مقابلہ ہوا تو ہم نے ان سے بازی جیت لی۔

اگرچہ وہاں کی زندگی بڑی جفاکشی کی تھی لیکن کبھی کبھی اس میں خوش دلی کے موقعے بھی نکل آتے تھے۔ میرا ایک اردلی تھا جس کا نام کنگ تھا۔ وہ سر سے پیر تک انگلستان کا روایتی "بوڑھا سپاہی" تھا۔ ایک دفعہ ہم رات کے نو بجے تک پریڈ کرتے رہے۔ رات کا کھانا کھا کر میں وردی سمیت ہی بستر پر لیٹ گیا۔ تھکا ہارا تھا ہی، جلد نیند آگئی۔ صبح کو جب کنگ آیا تو اس نے مجھے باوردی گہری نیند سوتے ہوئے پایا۔ اس پر وہ حیران ہو کر اپنے فوجی روزمرہ میں کہنے لگا "مسٹر خان! یہ جلدی افسری تم سے نہیں چل سکتی۔" پھر اس نے مجھے بستر سے اٹھایا اور صبح کی پریڈ کے لیے تیار کرایا۔

اس زمانے میں سینڈہرسٹ میں ہندوستانی کیڈٹوں کا اچھا خاصا جتھا جمع ہو گیا تھا۔ ہم سب مل جل کر رہا کرتے تھے۔ یہ تو ہم نے محسوس کر لیا ہی تھا کہ یہاں ہم کو گھٹیا درجے کی قوم سمجھا جاتا ہے۔ انگریز دوسرے ملکوں کی طرح کھلم کھلا رنگ اور نسل کے امتیاز کو روا نہیں رکھتے لیکن دل میں اس کا اتنا ہی احساس رکھتے ہیں۔ ان دنوں جب کسی محکوم قوم کا کوئی شخص وہاں جاتا تھا تو اس کو کم درجے کا انسان سمجھتے تھے۔ مجھے یہ حقیقت بڑی تلخ معلوم ہوتی تھی۔ خصوصاً انگلستان کی آزاد فضا میں محکوم قوم کی یہ حالت کی کیفیت ہمیں بہت افسردہ کرتی تھی۔ بحالوی افسروں کے ساتھ میرے تعلقات عموماً تکلف کی حد میں رہے۔ میں فطری طور پر خاموش اور تنہائی پسند تھا۔ اس پر سینڈہرسٹ میں علیحدگی کا احساس جس کا سب کو تجربہ ہوتا تھا مجھے انگریزوں سے میل جول بڑھانے سے باز رکھتا تھا۔ ویسے اپنے ہم عمروں کے ساتھ ہم بہت خوش تھے۔ خوب ہنسی مذاق اور اچھل کود کرتے لیکن ہمارے درمیان ذہنی ربط کبھی پیدا نہیں ہوا۔

سینڈہرسٹ میں میں پہلا غیر انگریز کیڈٹ تھا جس کو ترقی دے کر کارپورل بنایا گیا اور دو فیتے دیے گئے۔ یہ ترقی جس طرح عمل میں آئی اس کا بیان دلچسپی سے خالی نہیں۔ کمپنی کے سارجنٹ میجر نے حسب معمول اپنے اکھڑ لہجے میں مجھ سے کہا "مسٹر خان! تم ٹھیک ساڑھے دس بجے کمانڈنٹ کے دفتر میں حاضر ہو جاؤ۔"

کمانڈنٹ تھا میجر جنرل اور بے چارہ مسٹر خان تھا ایک معمولی کیڈٹ۔ میں دل ہی دل میں یہ سوچتا ہوا کہ نہ جانے مجھ سے کیا قصور ہوا ہے اور اب مجھ سے کیا سلوک کیا جائے گا، کمانڈنٹ کے دفتر میں پہنچا۔ میرے سامنے ایک میز کے پاس میجر جنرل اپنا پورا رسمی لباس پہنے بیٹھا تھا۔ اس کے علاوہ اسسٹنٹ کمانڈنٹ بھی تھا جو ایک پورا کرنل تھا، اور میری کمپنی کا کمانڈر بھی میں

ان کے سامنے فوجی قاعدے سے تن کر کھڑا ہو گیا۔ مگر دل میں دھکڑ پکڑ موجود تھی۔ آخر کمانڈنٹ نے بڑے گمبھیر لہجے میں مجھ سے یوں خطاب کیا۔

"جنٹل مین کیڈٹ ایوب خان! تم کو ایک بھاری ذمہ داری سونپی جا رہی ہے ہم کو امید ہے کہ تم خود کو اس کا اہل ثابت کرو گے۔ آج ہم نے اپنی پرانی روایت کو توڑ کر تم کو دو فیتے دینے اور کارپول بنانے کا فیصلہ کیا ہے ہم یہ تجربے کے طور پر کر رہے ہیں تاکہ دیکھیں کہ غیر ملکی کیڈٹ اس ذمہ داری کے بھاری بوجھ کو اٹھا سکتے ہیں یا نہیں۔"

میں بھونچکا رہ گیا۔ دل میں سوچتا تھا خدا جانے یہ ذمہ داری کیا ہو گی۔ لیکن جلد ہی مجھے معلوم ہو گیا کہ یہ ذمہ داری جو اس قدر پر وقار انداز سے مجھے سونپی گئی ہے اس سے زیادہ کچھ معنی نہیں رکھتی کہ جہاں اور کیڈٹوں کی رائفلوں کا معائنہ ہر روز ہوا کرے گا وہاں میری رائفل پر یہ پابندی عائد نہ ہو گی۔ مجھے کسی پر کمان حاصل نہ تھی۔ مجھے محض ایک اعزازی کارپول بنایا گیا تھا اور کسی برطانوی کیڈٹ کو میرے ماتحت نہیں رکھا گیا تھا۔ یہ تھا لب لباب اس بھاری ذمہ داری کا جس سے میری عزت افزائی کی گئی تھی۔ میں اپنے اور فرائض تو باقاعدگی کے ساتھ انجام دیتا رہا لیکن رائفل کی طرف سے غفلت برتنے لگا۔ ادھر دوسرے کیڈٹوں نے ہر روز لگاتار اپنی رائفلوں کی نالیوں کو پالش کر کر کے شیشے کی طرح چمکا دیا تھا۔

ایک دن وہ افسر جو ہمارے ہتھیاروں کا معائنہ کیا کرتا تھا اچانک آ دھمکا اور ہماری رائفلوں کا معائنہ کرنے لگا۔ اس نے بہت سے کیڈٹوں کی رائفلوں کو ناکارہ قرار دے دیا کیونکہ روز روز پالش کرنے اور رگڑنے سے ان کی نالیاں کافی گھس گئی تھیں۔ میری رائفل کچھ میلی تو ضرور تھی مگر کارآمد تھی۔

سینڈھرسٹ میں ہمیں محنت تو بہت کرنی پڑی مگر ہمارا وقت دلچسپی سے کٹا۔ ہمیں بہت سی چھٹیاں ملتی تھیں۔ اور ہمارا ایک جتھا جس میں زیادہ تر ہندوستانی کیڈٹ تھے اکثر سیر و سیاحت کے لیے یورپ اور عام طور پر فرانس اور سوئٹزرلینڈ جایا کرتا تھا۔ میں نے اس سیر و سفر کو تعلیمی لحاظ سے بہت مفید پایا۔

کیڈٹوں میں میری کسی سے گہری دوستی نہ تھی۔ یوں نامہ۔ بھونسلے، ناگرا، ورکی اور لوگوں سے میری خوب جان پہچان تھی۔ چودھری جو بعد میں انڈین آرمی کے کمانڈر ان چیف بنے اسی کمپنی میں تھے جس میں میں تھا۔ وہ ایک اچھے اور محنتی کیڈٹ تھے۔ لیکن کسی وجہ سے ہندوستانی کیڈٹوں میں مقبول نہ تھے۔

میں نے اپنے امتحانوں میں اچھی خاصی کامیابی حاصل کی۔ میں ایک سو تیس کیڈٹوں کی جماعت

میں ساتویں نمبر پر پاس ہوا۔ ہندوستانی کیڈٹوں میں میں سب سے اول رہا۔ ممکن ہے اس کا باعث یہ ہو کہ مجھے کارپورل کا اعزاز حاصل تھا۔ اور سینڈھرسٹ میں طالب علم کی قابلیت کا اندازہ اس کے سارے کام کو دیکھ کر نیز کمان کرنے کی صلاحیت سے لگایا جاتا تھا۔

امتحان کا نتیجہ نکلنے سے کوئی ایک مہینہ پہلے میں سوٹزرلینڈ میں چھٹیاں گزار رہا تھا کہ مجھے والدہ صاحبہ کا ایک خط ملا۔ اس میں انہوں نے لکھا تھا کہ تمہارے والد انتقال کر گئے۔ اس خط سے مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ اس خبر کے مجھ تک پہنچنے سے تین مہینے پہلے ہی فوت ہو چکے تھے۔ انہوں نے ستمبر ۱۹۲۷ء میں انتقال کیا تھا۔ اور یہ خط مجھے دسمبر میں ملا تھا۔ یہ بڑا سخت واقعہ تھا۔ بعد میں مجھے اور تفصیلات بھی معلوم ہوئیں۔ انتقال سے کچھ عرصہ پہلے والد صاحب کی بینائی موتیا بند سے قریب قریب جاتی رہی تھی۔ اور وہ میرے نام اپنے خط دوسروں سے لکھوایا کرتے تھے۔ وہ ہر ہفتے مجھے خط بھیجا کرتے تھے۔ مرنے سے پہلے انہوں نے یہ خواہش ظاہر کی کہ اگر میں مر جاؤں تو میرے بیٹے کو جب تک وہ سینڈھرسٹ میں اپنی تعلیم پوری نہ کر لے اس کی اطلاع نہ دی جائے مگر خط ہر ہفتے باقاعدگی سے لکھا جائے۔ یہی وجہ تھی کہ مجھے یہ اطلاع ان کی وفات کے تین مہینے بعد ملی۔

والد صاحب کے فوت ہونے سے میرے دل کو سخت صدمہ ہوا۔ مجھے ان ذمہ داریوں کا احساس تھا جو خاندان کا سربراہ بن جانے سے اور خاص کر اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کی طرف سے مجھ پر عائد ہو گئی تھیں۔ میں اپنے سینئر افسر کے پاس پہنچا جو ہم میں سے بعض کیڈٹوں کے سرپرست کی حیثیت سے کام کرتا تھا۔ اور اس سے صلاح لی۔ اس نے انڈیا آفس سے پوچھا۔ انڈیا آفس نے دفتر جنگ سے مشورہ کیا۔ دفتر جنگ نے اس امر کی تصدیق کی کہ میں اپنے امتحانوں میں کامیاب رہا ہوں اور مجھے کمیشن دیا جائے گا۔

مجھے چند ہفتے کی رخصت دی گئی تاکہ میں وطن جا سکوں۔ یہ ۱۹۲۷ء کی سردیوں کا زمانہ تھا۔ جب میری چھٹی ختم ہوئی تو مجھے ایک برطانوی رجمنٹ میں بھیجا گیا جس کا نام رائل نارتھمبرلینڈ فیوزیلیرز تھا اور جو بنگال میں تعینات تھی۔ یہ چھوٹے افسروں کے لئے ہندوستانی فوج میں شامل ہونے سے پہلے لازمی دور تھا۔ اور برطانوی افسروں کو اس میں شامل ہونے سے اس بات کی مہلت بھی مل جاتی تھی کہ ہندوستانی دستوں میں لینے سے پہلے ان کو دیکھ لیں۔ رائل نارتھمبرلینڈ فیوزیلیرز جو فوج میں بھرتی کئے گئے تھے وہ زیادہ تر لندن اور اس کے آس پاس کے علاقوں کے رہنے والے تھے۔ یہ چھوٹے مگر بڑے قابل سپاہی تھے۔ آب و ہوا کی خرابی اور علاقے کی دشواریوں کے باوجود ان کی قاعدے قانون کی پابندی اور ان کا طور طریقہ صد درجہ قابل تعریف تھا۔ برطانوی افسر بڑے زندہ دل لوگ تھے۔ اور میری ان سے خوب اچھی بنتی

ان کے کمانڈنگ افسر بگ بڑے قابل تھے، اور ان میں سے بعض سے میری بڑی دوستی ہو گئی۔ جب میرا تقرر انڈین آرمی میں ہوا تو میرے کمانڈنگ افسر نے میرے متعلق رپورٹ میں لکھا کہ یہ شخص خواہ کسی فوج میں ہو بہت اچھا افسر ثابت ہو گا۔

میری ملازمت کے شروع شروع میں ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ ہر سال ہر فوجی دستے کو بریگیڈ کمانڈر کی تجویز کردہ ایک مشق میں حصہ لینا پڑتا تھا جس سے دستہ کمانڈر کی قابلیت کا امتحان مقصود ہوتا تھا۔ ہم اورنگ آباد میں تھے اور یہ میری ملازمت کا غالباً تیسرا سال تھا۔ مجھے "دشمن" فوج کی کمان دی گئی۔ اس موقع پر دو مشقیں ہونے والی تھیں۔ میرے کمانڈنگ افسر کے ہاتھ میں "ملکی" فوج کی کمان تھی۔ میں نے دونوں مشقوں میں اسے گھیر لیا، اور ایسا بے بس کر دیا کہ اس کی کوئی تدبیر نہ چل سکی۔ آخر میں ایک کانفرنس ہوئی جس میں بریگیڈ کمانڈر نے ان مشقوں پر، اور بٹالین کمانڈر کی کارروائی پر تبصرہ کیا۔ اس نے بتایا کہ کہاں کہاں حالات قابو سے باہر ہوئے اور کہاں کہاں صحیح کارروائی عمل میں لائی گئی۔ پھر اس نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا "دشمن فوج کے کمانڈر کا کام حقیقی معنوں میں قابل تعریف تھا۔"

اس کے بعد میرے کمانڈنگ افسر نے مجھے کبھی نہیں بخشا۔ میں جو کام بھی کرتا اسے اس میں نقص ہی دکھائی دیتے۔ بجائے اس کے کہ وہ کھلاڑیوں کی سی عالی ظرفی دکھا کر اس واقعے کو بھول جاتا، ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑ گیا اور کوئی دو برس تک مجھے چین نہ لینے دیا۔

انڈین آرمی میں میری پہلی رجمنٹ "پہلی چودھویں پنجاب" تھی جو رنجیت سنگھ کے ایک دستے کو ترقی دے کر بنائی گئی تھی۔ سکھ اسے "شیر دل" بٹالین کے نام سے پکارتے تھے۔ بعد میں ہم نے نام بدل کر "شیر دل" رکھ دیا۔ برٹش انڈین آرمی کے اور بہت سے دستوں کی طرح کے بھی چار گروپ یا حصے تھے۔ پٹھان، پنجابی مسلمان، سکھ اور ڈوگرے۔ ان سب کی تعداد برابر تھی۔

میرے ساتھیوں میں کئی انڈین افسر تھے۔ ایک مرحوم کرنل خورشید تھے جو پاکستان بننے کے بعد شمال مغربی سرحدی صوبے کے پہلے گورنر مقرر ہوئے۔ ان کے علاوہ کرنل اے۔ ایس۔ بی شاہ اور ڈھلون بھی تھے جو بعد ازاں آرمی میں جرنیل کے عہدے تک پہنچ گئے۔

انگریز اور ہندوستانی افسر ایک دوسرے سے جو بغض رکھتے تھے، وہ کئی طریقوں سے ظاہر ہوتا تھا، اور بعض اوقات معمولی معمولی باتوں پر دیکھنے میں آتا تھا۔ مثلاً کھانے پینے پر کیونکہ انگریز افسر ہمیں ہمارا من بھاتا کھانا نہیں دیتے تھے۔ خاص طور پر سالن جو صرف پیر، جمعرات اور اتوار کے روز ہمیں ملا کرتا تھا۔ اسی طرح موسیقی پر جھگڑا ہوتا تھا، کیونکہ ہم چاہتے تھے کہ میس میں مغربی گانوں کے ساتھ ساتھ ہندوستانی گانوں کے ریکارڈ بھی بجائے جائیں۔ ایک موقع پر کچھ ہندو اور سکھ افسروں نے

بعض انگریز افسروں کا بائیکاٹ کرنے کے لیے ایک جلسہ کر ڈالا۔ میں نے سمجھایا کہ ہمیں چھوٹی چھوٹی باتوں پر جھگڑنا نہیں چاہیے۔

ان اختلافات کے باوجود انڈین آرمی بڑی تربیت یافتہ منظم اور طاقتور فوج تھی۔ جب ستمبر ۱۹۳۹ء میں جنگ چھڑی تو یہ فوج بڑی تیزی سے بڑھنے اور پھیلنے شروع ہوئی۔ میں بنوں میں چند دوستوں کے ساتھ ٹینس کھیل رہا تھا کہ جرمنی کے پولینڈ پر حملہ کرنے کی خبر آئی اور ہم نے جان لیا کہ بس اب عالمی جنگ چھڑنے ہی والی ہے۔ جلد ہی ہم سب ایک دوسرے سے بچھڑ گئے۔

فوج میں تیزی سے اضافہ ہونے کی وجہ وہ ذمہ داریاں تھیں جو مشرق وسطیٰ اور مشرق بعید کے تعلق سے اس پر عائد ہوتی تھیں۔ مجھے ایک علاقائی بٹالین تیار کرنے کے لیے نئی دہلی بھیجا گیا۔ اس کے بعد میں کوئٹہ کے اسٹاف کالج میں داخل ہوا اور جب میں نے اپنا کورس ختم کر لیا تو مجھے آرمی ہیڈکوارٹرز دہلی میں اسٹاف آفیسر مقرر کیا گیا۔

اس کے بعد میری تبدیلی "۱۰۔ کور" کے ہیڈکوارٹرز میں ہوئی جو کلکتہ سے ذرا باہر بارک پور کے مقام پر واقع تھا۔ اس جگہ ہم گورنر ہاؤس کے دفتر میں بیٹھ کر ہندوستانیوں کو جاپانیوں کے حملے سے محفوظ رکھنے کی تدبیریں سوچتے۔ اس علاقے کی آب و ہوا گرم اور مرطوب تھی۔ جب میں نے ہندوستان کے اس حصے کو گھوم کر دیکھا تو یہ مجھے ذرا پسند نہ آیا اور مجھے اس سے وحشت سی ہونے لگی۔ عجیب بات یہ ہے کہ کئی سال بعد جب میں جنرل آفیسر کمانڈنگ مقرر ہو کر مشرقی پاکستان پہنچا تو اس علاقے نے میرے دل کو موہ لیا۔

جن دنوں "۱۰۔ کور" جاپانیوں سے لڑنے کے لیے ارکان میں داخل ہوئی تو میں پہلی آسام رجمنٹ کا نائب کمانڈر مقرر ہوا تھا۔ اس میں ناگا لوگ بھی شامل تھے جنہیں جنگ کے دوران اور جنگ کے بعد بڑی سختیاں اٹھانی پڑیں۔ ہم برما پہنچے اور جیسے ہی دریائے چندوین کو پار کر کے دریائے ایراوادی کی طرف بڑھے جاپانیوں سے ہماری بڑی گھمسان کی لڑائی شروع ہو گئی۔ ایراوادی کو عبور کرنے کے بعد ہم لڑتے بھڑتے مانڈلے پہنچ گئے۔ یہ جنگل میں بڑی تیز دست بدست لڑائی تھی۔

وہاں بارش لگاتار ہوتی رہتی تھی اور جب ہمارے خیمے بہت بھیگ جاتے تو ہم ان کھڈوں میں لیٹتے جو دشمن کی گولہ باری سے بچنے کے لئے زمین میں کھودے گئے تھے لیکن وہاں ہمیں مچھروں سے چھٹکارا نہیں ملتا تھا۔ ہمارا وقت یا تو داتوں اور خراشوں کی دیکھ بھال میں کٹتا تھا یا مچھروں کو پرے ہٹانے میں۔ راشن عموماً کافی ملتا تھا۔ ایک دن صبح کو ہمیں دیکھا ہوائی جہازوں نے آسٹریلیا سے آئی ہوئی یخ مرغیاں گرائیں جنہیں سب نے بہت مزے لے لے کر کھایا۔ بعد میں معلوم

ہوا کہ یہ مرغیاں ایک برطانوی رجمنٹ کے لیے کرسمس کے تحفے کے طور پر بھیجی گئی تھیں۔ اس پر بڑی جواب طلبیاں ہوئیں مگر ہم کیا کر سکتے تھے۔

جاپانی لگاتار ہم پر حملے کرتے تھے اور میں اکثر اپنے اردگرد لاشوں کے انبار دیکھا کرتا تھا۔ ایک دن سہ پہر کو جب خوب گولہ باری ہو رہی تھی میں نے دیکھا کہ ایک شخص عجیب سا لباس پہنے میری طرف آ رہا ہے۔ وہ ایک امریکی سپاہی تھا۔ وہ پندرہ روز کی رخصت پر جانے والا تھا اور اسے کسی ایسی جاپانی چیز کی تلاش تھی جسے وہ بطور یادگار اپنے ساتھ لے جائے گویا بغیر کسی یادگار کو ساتھ لیے چھٹی پر جانا بیکار تھا۔ میری جیب میں جاپانیوں کا ایک چھوٹا سا جھنڈا تھا جو میں نے اسے دے دیا۔ وہ ایسا خوش ہوا کہ اپنی جیپ ہمارے حوالے کر گیا تاکہ ہم اسے آمد و رفت کے کام میں لا سکیں۔ میں نے ان حالات کے تحت تقریباً اٹھارہ مہینے کام کیا۔ اس کے بعد ۱۹۴۵ء کے موسم بہار میں میرا تبادلہ ہندوستان کی شمال مغربی سرحد پر ہو گیا۔

وہاں مجھے پندرہویں پنجاب رجمنٹ کی ایک بٹالین کی کمان دی گئی جو درۂ خیبر میں لنڈی کوتل کے مقام پر متعین تھی۔ جب میں باہر تھا تو میرے پیچھے میری پرانی چودھویں پنجاب بٹالین کو ملایا بھیجا گیا تھا اور اسے جاپانیوں نے گرفتار کر لیا تھا۔ جب میں نے یہ خبر سنی تو دم بخود رہ گیا۔ ہمارے کچھ افسر جو گرفتار ہو گئے تھے انڈین نیشنل آرمی میں شامل ہو گئے۔ یہ فوج جاپانیوں کی تحریک سے بنی تھی۔

جب جنگ ختم ہوئی تو مجھے اس رجمنٹ کے تربیتی مرکز میں بھیجا گیا جو فیروزپور میں تھا تاکہ میں اپنی پرانی بٹالین کو نئے سرے سے تیار کر سکوں۔ وہاں ان سابق جنگی قیدیوں میں سے کچھ لوگ ہم میں شامل ہونے کے لیے واپس آ گئے۔ میں نے دیکھا کہ ابھی تک ان کی جسمانی اور دماغی حالت بہت بری تھی وہ ہڈیوں کے ڈھانچے رہ گئے تھے۔ اور ان کے چہروں سے بدسلوکی کے آثار نمایاں تھے۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ وہ بہت مکار اور شکی بن گئے ہیں۔ جنگی قیدیوں کی حیثیت سے انہیں جو تجربہ حاصل ہوا تھا اس نے انہیں بہت چوکنا اور ہوشیار بنا دیا تھا اور وہ بات چیت میں بڑی احتیاط برتتے تھے۔

یوں تو ہم سب کی طرح ان کے لیے بھی جنگ ختم ہو چکی تھی مگر اس وقت ہم میں سے کوئی نہیں جانتا تھا کہ ایک اور کشمکش جواب سے ہماری اپنی آزادی کے لیے۔ اپنے آخری مرحلے پر پہنچنے کو ہے۔ میں اس وقت ڈیرہ دون میں آرمی سلیکشن بورڈ کا صدر تھا۔ ہمارا کام ایسے ہندوستانی افسروں کا انتخاب تھا جنہیں برٹش انڈین آرمی میں مستقل طور پر کمیشن دیا جا سکے۔ چونکہ اس کے لیے قابلیت کا معیار اونچا رکھا گیا تھا اس وقت ملک کی سیاسی فضا بہت مکدر ہو چکی تھی اور اس کا اثر فوج پر بھی پڑنا شروع ہو گیا تھا چنانچہ بعض ہندو اور سکھ افسروں کی طرف سے مجھ پر الزام لگایا گیا۔ میر

جان بوجھ کر ان کے آدمیوں کو فیل کر دیتا ہوں تاکہ وہ فوج میں افسر نہ بننے پائیں۔ درحقیقت صدر کی حیثیت سے بھی مجھے سلیکشن بورڈ کے دوسرے ممبروں کی طرح صرف ایک ہی ووٹ حاصل تھا۔ اور میں اپنی مرضی سے کسی امیدوار کو پاس یا فیل نہیں کر سکتا تھا۔ اس ناخوشگواری کے باوجود مجھے سلیکشن بورڈ میں اپنا کام بہت دلچسپ معلوم ہوا کیونکہ اس کے ذریعے مجھے لوگوں کو پرکھنے کا بہت عمدہ موقع اور تجربہ حاصل ہوا۔

لیکن سلیکشن بورڈ میں میری ملازمت کا یہ مختصر سا زمانہ اس عارضی سکون کی طرح تھا جو طوفان سے پہلے دیکھنے میں آتا ہے۔ ملک میں ایک دم خوفناک فرقہ وارانہ فسادات شروع ہو گئے۔ پنجاب میں حالات بڑی تیزی سے بگڑنے لگے۔ ۳ جون ۴۷ء کو جب ملکی تقسیم کی تجویز کا اعلان کیا گیا تو صورتحال کسی قدر بہتر ہو گئی۔ مگر پھر سکھوں نے پنجاب کی اصولی تقسیم کے خلاف زوردار تحریک شروع کر دی۔ وہ یہ آس لگائے بیٹھے تھے کہ سکھوں کے علاقوں سے مسلمانوں کو نکال دینے کے بعد وہ اپنی ایک علیحدہ ریاست قائم کر سکیں گے۔

۲۰ جولائی کو منگل کے دن ملکی تقسیم کی کونسل کے اراکین نے فیصلہ کیا کہ یکم اگست سے ایک خاص فوجی کمان لوگوں کی حفاظت کے لئے بنائی جائے جس کے ماتحت سیالکوٹ، گوجرانوالہ، شیخوپورہ، لائل پور، منٹگمری، لاہور، امرتسر، گورداسپور، ہوشیارپور، جالندھر، فیروزپور اور لدھیانہ ہوں۔ پنجاب کے ان شہری علاقوں کا رقبہ ۳۷۶۰۰ مربع میل سے اوپر تھا۔ اس مقصد کے لیے میجر جنرل ریس کو فوجی کمانڈر مقرر کیا گیا۔ مجھے بتایا گیا کہ میں پاکستان کی طرف سے ایک مشیر کی حیثیت سے میجر جنرل ریس کے عملے میں شامل کر دیا گیا ہوں۔ ہندوستان کی طرف سے اسی مقصد کے لیے بریگیڈیئر دگمبر سنگھ مقرر کیے گئے تھے۔ اس کے علاوہ کونسل نے یہ فیصلہ بھی کیا کہ ۱۵ اگست کے بعد میجر جنرل ریس "اس علاقے میں ان دونوں نئی مملکتوں کی فوجوں کی نقل و حرکت کی نگرانی کریں گے۔"

ملکی تقسیم کی کونسل کو امید تھی کہ پنجاب میں یہ باؤنڈری فورس (سرحدی فوج) کا قیام مفید ثابت ہوگا اور اس سے حالات پر قابو پایا جائے گا۔ لیکن اس تباہی اور غارت گری کی خبر نہ تھی جو سارے پنجاب کو اپنی لپیٹ میں لینے والی تھی۔ سکھوں کی تحریک نے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت اچانک نہایت تشدد آمیز اور خطرناک صورت اختیار کر لی۔ انہوں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ ان کے ہتھیار بند جتھے ایک ضلع سے دوسرے ضلع میں حرکت کرتے رہتے اور مسلمانوں پر حملے کر کے انہیں پاکستان کی طرف بھگاتے رہتے۔ پہلی بار جب ۴ اگست ۱۹۴۷ء کو ضلع امرتسر کے ایک مقام جبھہ میں ہوئی۔ مسلمانوں کے ۶ دیہاتوں کو گھیر لیا گیا اور جلا کر خاک کر دیا گیا۔ بہت سے آدمی

مارے گئے۔ یہاں سے سکھوں کے دستے ترن تارن پہنچے اور وہاں بھی بے دریغ مسلمانوں کا خون بہایا گیا۔ ۱۳ اگست کو مشرقی پنجاب، اور خصوصاً امرتسر میں مسلمان پولیس کے عملے کو ہٹا کر دیا گیا۔ یہ گویا اشارہ تھا کھلی غارت گری اور مسلمانوں کے قتل عام کا۔

اس پر باؤنڈری فورس پر سخت نکتہ چینی کی گئی جو لازمی بات تھی۔ اور مجھ پر بھی بڑا الزام آیا۔ لیکن میری حالت بڑی بے بسی کی تھی۔ میں ایک باہر کا آدمی تھا جس کا کام محض مشورہ دینا تھا۔ نہ تو میرا کوئی عملہ تھا اور نہ میں کسی پر حکم چلا سکتا تھا۔ اس سے بھی قطع نظر باؤنڈری فورس کے لیے اس قتل عام کو روکنا یوں بھی ممکن نہ تھا۔ سر فرانسس ٹکر نے اپنی کتاب "وائل میموری سرورز" (جب تک یاد سلامت ہے) میں پنجاب باؤنڈری فورس کے بے اثر ہونے کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

"اگست کے ابتدائی دنوں میں جنرل ریس سے انبالہ میں ہماری جو بات چیت ہوئی اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ انہیں اس امر میں کوئی شک نہیں کہ جیسے ہی باؤنڈری کمیشن کے فیصلے کا اعلان ہوگا مشرقی پنجاب میں قیامت برپا ہو جائے گی۔ ۱۱ اگست کو ہمیں معلوم ہوا کہ امرتسر میں پچھلے روز بڑا خون خرابا ہوا ہے۔ کلکتہ میں بھی اسی رات معمول سے زیادہ گڑبڑ ہوئی اور پولیس اور فوج دونوں کو گولی چلانی پڑی۔ ہم کلکتہ میں تو ہنگاموں کی روک تھام کر سکتے تھے، لیکن ہمیں پورا یقین تھا کہ امرتسر سے جو فتنہ اٹھے گا اس سے سارے شمال میں تباہی اور بربادی کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ لوگوں نے قانون کو اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ اور مقامی نظم و نسق درہم برہم تھا کیونکہ اسے فوج کی طرح، آنے والی صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار نہیں کیا گیا تھا۔ اس کی تنظیم پنجاب کی صورت حال کو نظر میں رکھ کر کی جاتی اور اسے زیادہ طاقتور بنایا جاتا تو باؤنڈری فورس کا کام بہت آسان ہو جاتا۔ لیکن شہری حکام اور پولیس کے فرقہ پرستانہ رویہ نے شروع ہی سے اس فوج کے کام کو ناممکن بنا دیا تھا۔ انگریزوں نے پچھلے سو برس میں حکمرانی کی جو ساکھ قائم کی تھی وہ اس وقت سارے ہندوستان میں بری طرح ڈانواں ڈول ہو رہی تھی۔ ملکی انتظام پو تھوڑی سی بچی کھچی ساکھ کے سہارے چل رہا تھا۔ مشرقی پنجاب میں اس کا رہا سہا اثر بھی ۱۵ اگست سے بہت پہلے ہی ختم ہو چکا تھا۔"

باؤنڈری فورس سے متعلق پینڈل مون کی کتاب "ڈیوائڈ اینڈ کوئٹ" (تقسیم کرو اور بھاگو) کا یہ اقتباس بھی ملاحظہ فرمائیے:

"جب میں دہلی سے واپس بہاول پور پہنچا تو میں نے دیکھا کہ ہر شخص باؤنڈری فورس کی تجویز سے بڑی آس لگائے ہوئے ہے۔ لیکن مجھے ان سے اتفاق نہ تھا۔ میرا خیال تھا کہ جب بھی ہو دو

پائیں گے مسلمانوں پر دھاوا بول دیں گے۔ اگر باؤنڈری فورس حقیقت میں طاقتور ہوتی تو وہ اس وقت تک صبر کریں گے جب تک کہ اسے ہٹا نہ دیا جائے۔ اور اگر وہ کمزور ہوئی تو وہ اسے خاطر میں نہیں لائیں گے۔ جب میں بہاول پور سے واپس آ رہا تھا تو باؤنڈری فورس کے متعلق مجھے ایک نوجوان سکھ میجر کے خیالات سننے کا اتفاق ہوا جو کچھ دیر کے لیے میرے کمپارٹمنٹ میں میرا ہم سفر بن گیا تھا۔ یہ سکھ اس فوج میں شامل ہونے والا تھا۔ اس نے کہا "مجھے ہرگز امید نہیں کہ یہ فوج امن قائم رکھ سکے گی۔ میرا خیال ہے کہ فوج کا بہت بڑا حصہ فرقہ پرستی کا شکار ہو کر ناقابل اعتبار ثابت ہوگا۔ مجھے اس امر میں بھی شبہ ہے کہ مشینی فوج برسات کے زمانے میں دیہاتی علاقوں میں کامیابی کے ساتھ کام کر سکے گی۔ میں نے اس سکھ میجر کی رائے سے پورا پورا اتفاق کیا۔"

جمعہ ۲۹ اگست ۱۹۴۷ء کو مشترکہ دفاعی کونسل کا اجلاس ہوا جس میں آخر کار یہ فیصلہ کیا گیا کہ باؤنڈری فورس کو توڑ دیا جائے۔ اس جلسے کی کیفیت ایلن کیمبل جانسن اپنی کتاب "مشن ود ماؤنٹ بیٹن" (ماؤنٹ بیٹن کی ہمراہی میں ایک مہم) کے اندر اس طرح بیان کرتے ہیں۔

"ماؤنٹ بیٹن مشترکہ دفاعی کونسل کے اجلاس کی صدارت کرنے کل لاہور پہنچے۔ اس میں جناح نے بھی ایک ممبر کی حیثیت سے شرکت کی جس کی کسی کو امید نہ تھی۔ بڑے بحث مباحثے کے بعد باؤنڈری فورس کو توڑنے کا فیصلہ کیا گیا۔ پیٹ ریز کے سر ایک انتہائی مشکل کام پڑا تھا۔ اس نے اس سلسلے میں جو کچھ بھی کیا اس پر فریقین کی طرف سے شکریہ کے بمشکل چند ہی لفظ سننے میں آئے۔ نہ تو دونوں طرف کی حکومتوں نے اور نہ اخبارات نے پورے دل سے باؤنڈری فورس کی حمایت کی۔ جس کی بنا پر اس فوج اور اس کے کمانڈر کے لیے ٹھہرنا محال ہو گیا۔ فوجی مستعد بھی اور آزمودہ کار بھی، لیکن فرقہ پرستی کا پلڑا فوجی نظم و ضبط کے پلڑے سے کہیں زیادہ بھاری ثابت ہوا۔"

میں نے ان مصنفوں کی کتابوں کے اقتباس یہ دکھانے کے لئے درج کیے ہیں کہ باؤنڈری فورس کی تقدیر میں شروع ہی سے ناکامی لکھی تھی۔ پیام رسانی کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ یہ فوج صرف ان ہی جگہوں پر بھیجی جا سکتی جن پر حملہ ہوا ہو۔ لیکن جس وقت یہ وہاں پہنچتی تو اس وقت تک اس جگہ کو یا تو جلایا جا چکا ہوتا یا وہاں کی مسلم آبادی موت کے گھاٹ اتاری جا چکی ہوتی۔ آخر میں یہ فوج صرف اس مطلب کے لیے رہ گئی کہ سڑکوں کو پناہ گیروں کے لیے صاف رکھے۔ یہ کام بڑی بڑی شاہراہوں اور ریل کی لائنوں پر گشت کے ذریعے انجام دیا گیا۔

یہ میری زندگی کا سب سے المناک زمانہ تھا۔ میں نے اس سے زیادہ ہولناک اور وحشیانہ کارروائی پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ عورتوں اور بچوں کے اعضاء کاٹ دیئے جاتے اور بے گناہ لوگوں

کو سخت بے رحمی کے ساتھ قتل کیا جاتا۔ معلوم ہوتا تھا تمام انسانی صفات دنیا سے اٹھ گئی ہیں اور تہذیب و تمدن کی شاندار عمارت دھڑام سے زمین پر آ رہی ہے۔ فطرتِ انسانی میں میرا ایمان ڈوبنے لگا۔ میں اپنے آپ سے پوچھا کرتا "اس دیوانگی کو کیونکر روکا جا سکتا ہے؟"

میں بڑی مشکل سے امرتسر اور دوسرے مقامات سے متعدد مسلمانوں کی جانیں بچانے میں کامیاب ہو سکا۔ امرتسر میں گرینڈ ٹرنک روڈ اور ریلوے لائن کے درمیان ایک بستی تھی جس میں زیادہ تر مسلمان رہتے تھے۔ اس بستی کو سکھوں نے گھیر رکھا تھا۔ انہوں نے دو منزلہ مکانوں پر مورچے بنائے ہوئے تھے۔ جہاں سے وہ ہر اس آدمی کو گولی کا نشانہ بنا سکتے تھے جو اس بستی سے نکلنا چاہتا۔ میں نے دو ٹرینوں کا بندوبست کیا اور کچھ فوجی مہیا کیے تاکہ وہ اس بستی کے لوگوں کی حفاظت کے لیے ساتھ جا سکیں۔ مجھے ایک ریلوے انجینئر سے اس کام میں بڑی مدد ملی۔ ہم نے شملہ، ڈیرہ دون، اور انبالہ سے بھی کئی خاندانوں کو نکالا۔ یہ کارروائی کوئی تین ہفتے تک جاری رہی۔ الطاف قادر بھی جو بعد ازاں لیفٹیننٹ جنرل کے عہدے پر پہنچے اس زمانہ میں وہاں موجود تھے، اور انہوں نے بھی مسلمانوں کو نکالنے کے کام میں حصہ لیا تھا۔ میں نے وزیر اعظم کو پیغام بھیجا کہ ممکن ہے کہ مہاجرین کی تعداد دس لاکھ سے اوپر پہنچ جائے۔ میں نے مہاجر کیمپ تیار کرنے کے لیے ایک مرکزی دفتر بنانے کی درخواست کی۔ اس وقت کسی کو گمان تک نہ تھا کہ مہاجرین کی تعداد اسّی یا نوے لاکھ تک پہنچ جائے گی۔

تقسیم کے یہ ہولناک واقعات دیکھنے کے بعد میں وزیرستان واپس آیا۔ جہاں ایک بریگیڈ کی کمان میرے سپرد ہوئی۔ میں اس علاقے کو اچھی طرح جانتا تھا۔ میں نے وہاں اپنے پچھلے تقرر کے موقع پر وزیرستان کے مقام میر علی میں قیام کیا تھا۔ اس وقت ایک ناتربیت یافتہ بٹالین میرے ماتحت تھی۔ ہمیں تقریباً بیس میل سڑک کا راستہ محفوظ کرنا پڑتا تھا تاکہ رزمک اور بنوں کے درمیان فوجی قافلے حفاظت سے آ جا سکیں۔ اس کا مطلب تھا پہاڑوں کی چوٹیوں پر فوجی پہرے بٹھانا تاکہ قبائلی ہمارے قافلوں پر فیر نہ کر سکیں۔ میں نے اپنے جوانوں کے سروں کے اوپر سے رائفلوں اور مشین گنوں سے گولیاں چلوا چلوا کر انہیں سخت جنگی مشق کروائی اور دو ہفتے کے اندر یہ ایسی تربیت یافتہ بٹالین بن گئی کہ اس سے اس کٹھن علاقے میں بخوبی خدمت لی جا سکتی تھی۔

مجھے یہ سوچ کر ہمیشہ بڑی تکلیف ہوتی تھی کہ شمال مغربی سرحدی صوبے میں جو مختلف لڑائیاں لڑی جاتی تھیں وہ سب کی سب بڑی بے فائدہ تھیں۔ ان سے سوائے بہت سا وقت اور بہت سی جانیں ضائع ہونے کے کچھ حاصل نہیں ہوتا تھا۔ جب پاکستان قائم ہوا تو ہمارے کئی آدمی

ڈویژن تیرا اسکاؤٹ اور لیوی سب کے سب سرحد پر مامور تھے۔ وہاں ان کی موجودگی کا فائدہ اس سے زیادہ کچھ نہیں تھا کہ وہ مستقل طور پر قبائلیوں کو اشتعال دلاتے رہیں۔ اور ان کی گولیوں کا نشانہ بنتے رہیں۔ جب صورت حال یہ ہو تو وہاں کسی قسم کی ترقی کا امکان کیسے ہو سکتا ہے۔

عقل مندی کی بات صرف ایک تھی وہ یہ کہ شمال مغربی سرحد سے فوجوں کو ہٹا لیا جائے اور آخر کار ہوا بھی یہ۔ لیفٹیننٹ جنرل سر فرانسس ٹکر کے ماتحت جو ایک نہایت قابل افسر تھے ایک کمیٹی بنائی گئی۔ جس نے اس مسئلے کی چھان بین کر کے تجویز پیش کی کہ وزیرستان سے فوجیں ہٹالی جائیں یہ جرأت مندانہ اور عاقلانہ تجویز پاکستان بننے سے پہلے ہی پیش کر دی گئی تھی۔ جسے پاکستان کی نئی حکومت نے منظور کر کے اس پر عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

فوج کے ایک بڑے حصے کی واپسی کا کام میرے سپرد کیا گیا۔ اس علاقے میں سو سال سے زیادہ عرصے سے فوجیں رہتی چلی آ رہی تھیں چنانچہ ان کی واپسی کا کام مشکل ہی نہیں خطرناک بھی تھا۔ فوجیں نکالنے سے چند روز پہلے جانے والے ایک گروہ پر قبائلیوں نے گولی چلا دی جس سے کئی آدمی مارے گئے۔ مجھے بڑا طیش آیا اور میں نے جلد ہی بدلہ لینے کی ٹھان لی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مجھے مشتعل قبائلیوں ہی نہیں ایک گھبرائے ہوئے ڈویژن کمانڈر اور پولیٹیکل ایجنٹ سے بھی بھگتنا پڑا۔ جس سے میری کارروائی کو خلافِ قاعدہ قرار دیا۔

میں قبائلیوں سے ملا اور ان پر اپنا نقطۂ نظر واضح کیا۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ آئندہ کبھی ہمارے سپاہیوں کی جان نہ لیں کیونکہ وہ بھی آپ ہی کی طرح نیک مسلمان ہیں اور اس طرح جانوں کا ضائع ہونا بے فائدہ ہے۔ میں نے اس بات پر بھی زور دیا کہ یہ لوگ پاکستان کے محافظ ہیں اور اب پاکستان قبائلیوں کا بھی ویسا ہی اپنا ملک ہے جیسا کہ ہمارا ہے۔ اس کے بعد میں نے انہیں بتایا کہ ہم وزیرستان سے اپنی فوجیں نکال رہے ہیں لیکن اگر میرے کسی آدمی کو نقصان پہنچا یا اس پر گولی چلائی گئی تو میں پلٹ کر حملہ کر دوں گا۔ وہ جانتے تھے کہ جو کچھ میں کہتا ہوں کر گزروں گا۔ چنانچہ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ جب ہماری فوجیں وزیرستان سے نکل رہی تھیں تو ان قبائلیوں اور ان کے سرداروں نے ہماری حفاظت کے لیے پہاڑوں کی چوٹیوں پر پہرہ دیا۔ انہوں نے مضبوط ناکوں پر سفید جھنڈے لہرا رکھے تھے۔ اس کام میں بڑے بڑے ملک مددگار ہوئے اور اس طرح فوجوں کی واپسی کا کام بھی باقاعدگی اور خوشی کے ساتھ تکمیل کو پہنچا۔

سچ پوچھیے تو شمال مغربی سرحد کا مسئلہ دوسرے مسئلوں کے مقابلے میں جن کا پاکستان کی نئی حکومت کو سامنا تھا ایک معمولی مسئلہ تھا۔ ہمیں ایک لمبے اور کٹھن راستے پر سفر کرنا تھا۔ اور شروع ہی سے ہم ایک

دشواریوں سے دوچار ہونا پڑ گیا تھا۔ ہمارے ملک میں بے گھر بے در مہاجروں کا سیلاب امڈ پڑا تھا۔ پنجاب کے دریا جن پر ہمارے علاقے کی کھیتی باڑی کا دارومدار تھا ان کے منبعے ہندوستان میں تھے۔ یہ دو ہی نہیں تھے اور بھی بڑے بڑے مسئلے تھے جن کو ہمیں حل کرنا تھا۔

میرے ذمے جو کام کیا گیا وہ یہ تھا کہ میں پاکستانی فوج کی تشکیل اور اس کی تربیت کے مسئلے کو حل کروں۔ میرا اس کام سے کئی سال تک گہرا تعلق رہا ہے پہلے مشرقی پاکستان میں جنرل آفیسر کمانڈنگ کی حیثیت سے، پھر ایڈجوٹنٹ جنرل اور آخر میں پاکستانی فوج کے کمانڈر ان چیف کی حیثیت سے۔ اس سے پہلے کہ میں اپنے تجربات بیان کروں جو ان عہدوں پر رہ کر مجھے حاصل ہوئے، میں مختصر طور پر بتا دینا چاہتا ہوں کہ تقسیم سے پہلے اور تقسیم کے فوراً بعد فوج کی کیا حالت تھی۔

برطانوی ہند کی فوج میں ہم مسلمان افسروں کو قائداعظم محمد علی جناح کی ایک عظیم جدوجہد سے جو وہ قیام پاکستان کے لیے کر رہے تھے قدرتی طور پر بڑا لگاؤ تھا۔ لیکن اس سیاسی کشمکش میں اور جو لوگ مصروف تھے ان کے بارے میں ہمیں کچھ زیادہ علم نہ تھا۔ فوجی تربیت نے ہمیں سکھایا تھا کہ فوجی افسروں کو سیاسیات سے الگ رہنا چاہیے۔ چنانچہ ہم بیشتر سیاست والوں سے ایسے ہی ناواقف تھے جیسے کہ وہ ہم سے تھے۔

جب آزادی حاصل ہوئی تو ہم نے جانا کہ اب ہم مسلمانوں کا ایک علیحدہ وطن ہوگا۔ چنانچہ قدرتی طور پر فوج کی تقسیم بھی ایک مسئلہ بن گئی۔ گو فوج کی تقسیم سے براہ راست میرا تعلق نہیں تھا لیکن شروع ہی سے یہ بات میرے دل میں بیٹھ گئی تھی کہ پاکستان کے پاس خود اپنی فوج ہونی چاہیے اور فوج بھی اعلیٰ درجے کی جو ہمارے ملک کا بچاؤ کر سکے۔

جنرل کری آپا نے جو اس وقت فوج میں سینئر ہندوستانی افسر تھے مجھ سے کہا کہ تم اس امر میں میری حمایت کرو کہ فوج کو تقسیم نہ کیا جائے۔ میں چاہتا ہوں کہ ہندوستان اور پاکستان دونوں کے لئے ایک ہی فوج ہو۔ مجھے امید ہے کہ تم میرا نقطۂ نظر سمجھو گے اور اسے پسند کرو گے۔ میں نے ان سے کہا کہ دو آزاد ملکوں کے لیے ایک ہی فوج کا ہونا قیاس میں بھی نہیں آسکتا۔ فوج خودمختاری کی علامت اور لوگوں کی پشت پناہ ہوتی ہے۔ لوگوں کے خیال اور ان کی مرضی سے باہر وہ اپنا وجود ہی نہیں رکھتی۔ ہمارے پاس خود اپنی فوج ہونی چاہیے جو ہماری پالیسیوں پر عمل کرے اور ہماری آزادی کی محافظ ہو۔

اس پر مسلح افواج کی تقسیم کے لئے ایک کونسل بنائی گئی۔ ہماری طرف سے رضا، بہادر اور لطیف اس کونسل کے نمائندے مقرر ہوئے۔ مجھے یاد ہے ایک موقع پر اکبر گیارہ دن میں مجھ سے آکر ملے اور کہا کہ دونوں فوجوں کے لئے ایک مشترکہ تربیتی ادارہ بنانے کی تجویز پیش کی گئی ہے۔ میں نے کہا اس

سے کام نہیں چلے گا۔ یہ صحیح ہے کہ شروع شروع میں پاکستانی فوج کے پاس تربیتی سہولتوں کی کمی ہوگی اور شاید ہمیں درختوں کے سائے تلے کام کرنا پڑے۔ لیکن ہمیں ان کوتاہیوں کو صبر کے ساتھ قبول کر لینا چاہیے۔ ہمیں اپنے ادارے فوراً شروع کر دینے چاہئیں۔ ہماری فوج الگ ہونی چاہیے اور فوج کے تربیتی ادارے اور دوسری سہولتیں بھی الگ ہونی چاہئیں جو فوج کے لئے درکار ہوتی ہیں۔ میرے نزدیک مستقبل کا مسئلہ بالکل صاف تھا۔ دو قومیں وجود میں آئی تھیں اور لازمی تھا کہ ان میں سے ہر ایک کے پاس خود اپنا آزاد قوت موجود ہو۔ کوئی بھی آزاد ملک اپنے وسیلۂ قوت میں کسی دوسرے ملک کو شریک نہیں کر سکتا۔ اس وقت اس قسم کی خیال آرائی بھی کی جا رہی تھی کہ گو ہندوستان اور پاکستان الگ الگ ہو گئے ہیں مگر دونوں آپس میں رواداری کے ساتھ مل جل کر رہ سکتے ہیں۔ اس وقت کسی کے ذہن میں یہ بات نہ آئی تھی کہ ہندوستانی لیڈر کچھ اور ہی سوچ رہے تھے۔ مل جل کر رہنا تو ایک طرف انہوں نے تو پاکستان کے لئے الجھنوں پر الجھنیں پیدا کرنے کی ٹھان رکھی تھی۔

اس مشورے کے سوا مسلح افواج کی تقسیم سے میرا براہ راست کوئی تعلق نہیں تھا۔ لیکن فوج کی تقسیم سے جو مسئلے پیدا ہوئے ان کو حل کرنا میرے ذمے تھا۔ یہ مسئلے کیا تھے؟ اول یہ کہ برٹش انڈین آرمی میں سرے سے بٹالین کے سائز کا کوئی پورا مسلم یونٹ تھا ہی نہیں حالانکہ ہندو اور گورکھا رجمنٹیں ہر طرح مکمل تھیں۔ جب جاپان سے لڑائی ختم ہوئی اور ملک تقسیم ہوا تو ہمارے آدمی ہندوستان کے یونٹوں سے چھوٹے چھوٹے گروہوں میں پاکستان آنے شروع ہوئے۔ بعض صورتوں میں وہ نہتے ہوتے تھے اور بعض اوقات بمشکل جان بچا کر پہنچتے تھے۔ چنانچہ ہمیں ان چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں سے اپنی فوج اس طرح تیار کرنی پڑی جس طرح تصویری معمے کے مختلف ٹکڑوں سے تصویر تیار کی جاتی ہے۔ مگر اس میں کئی ٹکڑے غائب تھے۔ ہمارے پاس ناتربیت یافتہ، نیم تربیت یافتہ اور اعلیٰ تربیت یافتہ سبھی قسم کے لوگ تھے۔ یہ مختلف یونٹوں اور مختلف علاقوں سے آئے تھے۔ ہمیں ان سب کو ملا کر مختلف قسم کے لڑنے والے یا امدادی دستے، رجمنٹیں اور ڈویژن اور کور بنانے تھے۔

یہی نہیں اتحادیوں نے ملایا پر چڑھائی کرنے کا جو منصوبہ بنایا تھا اس کا صدر مقام ہندوستان تھا چنانچہ بہت سی فوجوں کی طرح بہت سے فوجی اسٹور اور ساز و سامان جنوبی ہند میں تھا جس میں ہمارا حصہ بھی شامل تھا۔ تقسیم کے معاہدے کے تحت ہم فوجی سامان اور ہتھیاروں سے بھری ہوئی ایک سو ساٹھ ٹرینیں لے جانے کا حق رکھتے تھے۔ لیکن اس میں سے بہت ہی تھوڑا حصہ پاکستان پہنچ پایا اور جب گاڑیاں آئیں بھی تو ان کے ڈبوں میں اینٹ پتھر اور تباہ شدہ سامان بھرا ہوا تھا۔

غرض ہماری فوج کے پاس اسلحہ کی بڑی کمی تھی، اور وہ سخت غیر منظم بھی تھی۔ پھر جلد ہی اسے مہاجرین کی حفاظت کے لیے جو لاکھوں کی تعداد میں پاکستان آرہے تھے، ان کے قافلوں کے ساتھ ساتھ جانا پڑا۔ پھر زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ اسے کشمیر کی لڑائی میں بھی حصہ لینا پڑا۔ اس تمام عرصے میں فوج کے پاس نہ تو کوئی منظم یونٹ تھا نہ کوئی ساز و سامان، اور گولہ بارود بھی نہ ہونے کے برابر تھا۔ حالت اتنی خراب تھی کہ شروع کے چند برسوں میں ہر فوجی کو مشق کے لیے صرف پانچ کارتوس فی سال کی اجازت تھی۔

ہماری حالت سچ مچ بڑی ناگفتہ بہ تھی۔ لیکن جب سے پاکستان وجود میں آیا تھا مجھے ایک بات کا پورا یقین ہو گیا تھا، وہ یہ کہ پاکستان کی بقا کے لیے ایک ایسی فوج کا قیام ضروری ہے جس کو عمدہ تربیت ملی ہو اور جس کے پاس پورا پورا جنگی سامان اور اعلیٰ قابلیت کے افسر موجود ہوں۔ چنانچہ میں نے اپنے ملک کے لیے اس قسم کی فوجی پناہ تیار کرنے کا تہیہ کر لیا تھا۔ مجھے خوشی ہے کہ میں مخلص اشخاص کی مدد سے اس کوشش میں کامیاب ہو گیا۔ آج میں پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ پاکستان اس فوج کے بغیر ان طوفانوں اور حملوں کی تاب ہرگز نہ لا سکتا جن سے اسے دوچار ہونا پڑا۔ پاکستان کے عوام کی پشت پر اس فوج کی موجودگی آج بھی اس بات کی ضمانت ہے کہ دشمن ہمیں دبا نہیں سکتا۔

(۳)

فوجی زندگی

۱۹۴۸ء تا ۱۹۵۰ء

جنوری ۱۹۴۸ء میں میں وزیرستان میں گردئی بریگیڈ کی کمان کر رہا تھا کہ مجھے جنرل آفیسر کمانڈنگ بن کر مشرقی پاکستان جانے کا حکم ملا۔ میں اس وقت یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ مجھے اس تبدیلی سے خوشی ہوئی ہے۔ مجھے اس علاقے کی آب و ہوا پسند نہیں آئی تھی، پھر کچھ ذاتی معاملے بھی تھے مثلاً اپنے گھر والوں کے لیے راولپنڈی میں رہنے سہنے کا انتظام کرنا، تاکہ بچے تعلیم جاری رکھ سکیں۔ فوج اس معاملے میں مدد نہ کر سکی اور مجھے مجبوراً اپنے خاندان کو ایک عمارت کے بغلی حصے میں جو دراصل شاگرد پیشے کا کام دیتی تھی، ٹھہرانا پڑا۔ بعد میں میں نے اپنے سامان کے ایک دو سوٹ کیس ساتھ لیے اور مشرقی پاکستان روانہ ہو گیا۔

ملک کے لیے یہ سخت آزمائش کا دور تھا اور جو خدمت میرے سپرد ہوئی تھی وہ بھی کچھ کم مشکل نہ تھی۔ میں نے تقریباً دو برس مشرقی پاکستان میں گزارے۔

مجھے اکثر صوبائی حکومت سے واسطہ پڑتا تھا جو نئی نئی بنی تھی۔ اور جس کے عملے میں لائق آدمیوں کی بڑی کمی تھی۔ اس سے بھی زیادہ خرابی کی بات یہ تھی کہ یہ حکومت سیاسی اعتبار سے کمزور اور ناپائیدار تھی۔

فوج سرے سے تھی ہی نہیں۔ آزادی کے وقت ہمارے پاس مشرقی پاکستان میں لے دے کر صرف دو پیدل بٹالین تھے۔ ان میں سے ایک بٹالین کی تین مسلم کمپنیاں تھیں۔ چوتھی کمپنی ہندو تھی۔ جس کا ہندوستان میں تبادلہ ہو گیا تھا۔ دوسری بٹالین میں سے ایک سکھ کمپنی اور ایک ڈوگرا کمپنی کو چھوڑ کر ہمیں دو مسلم کمپنیاں ادھر مل گئیں۔ ہیڈ کوارٹرز میں نہ میز تھی نہ کرسی، نہ لکھنے پڑھنے کا سامان، درحقیقت ہمارے پاس کچھ بھی نہ تھا۔ مشرقی پاکستان کے نقشے تک نہ تھے۔ دھیرے دھیرے ہم نے خود کو منظم کرنا شروع کیا۔

ہمارے رہنے سہنے کی جگہ بھی بہت خراب تھی۔ تیج گاؤں اور کرمی ٹولہ کے ہوائی میدانوں کے

آس پاس خیمہ بستی کے جھونپڑے تھے جو دوسری عالمی جنگ میں بنائے گئے تھے۔ افسروں کے لیے بھی دفتر بنے نہیں تھے۔ ہمیں ان کے رہنے سہنے کے لیے جوں توں بندوبست کرنا پڑا۔ وہ باشوں (جھونپڑوں) میں رہتے تھے جو ہمہ وقت خستہ حالت میں ہوتے تھے اور جن کی چھتوں سے پانی ٹپکتا رہتا تھا۔ ان لوگوں کو اکثر اپنی چارپائیاں سوکھی جگہوں میں رکھ کر رہنا پڑتا تھا۔ جب تیز شمال مغربی ہوا چلتی تو ان جھونپڑوں کی چھتیں اڑ جاتیں اور سونے والے خود کو کھلے آسمان کے نیچے پاتے۔ صبح وہ اپنے اپنے جھونپڑے کی تلاش میں نکل پڑتے اور اس کے انجر پنجر کو ادھر ادھر سے اکٹھا کر کے لاتے۔

دھیرے دھیرے حالت سدھرنی شروع ہوئی۔ ایک بریگیڈ گروپ کے رہنے کے لیے ایک پختہ عمارت کا ڈول ڈالا گیا۔ فوج کے چند یونٹوں کا ڈھاکہ کے قریب رکھنا بہت ضروری تھا تاکہ شہری حکام کو ضرورت کے وقت ان سے مدد مل سکے۔ کچھ اور جگہوں پر بھی تعمیر کے منصوبے بنائے گئے۔ مشکل یہ تھی کہ اونچی زمین کمیاب تھی جس میں برسات کے زمانے میں پانی نہ بھر آئے۔ سارے صوبے میں بڑی تلاش کے بعد مجھے دو علاقے کام کے نظر آئے جنہیں جنرل ہیڈکوارٹرز نے منظور کر لیا۔ ہم نے ایک چھاؤنی ڈھاکہ کے قریب بنائی اور دوسری کومیلا کے قریب اونچی زمین پر۔ آج کل یہ دونوں جگہیں ترقی کر کے بہت خوش نما بن گئی ہیں۔

حالات کا رخ سازگار نہیں تھا۔ ہماری سرحدوں کو ہر وقت ہندوستان کی طرف سے خطرہ رہتا تھا۔ پھر جلد ہی ہم اس کے ساتھ کشمیر کی لڑائی میں الجھ گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہمیں مشرقی پاکستان میں اپنی پوزیشن مضبوط بنانے کے لیے کسی قسم کی کمک ملنا دشوار ہو گیا۔

صوبے کی حالت بڑی پست تھی۔ تقسیم سے پہلے اس کی بہتری کے لیے کوئی کام نہیں کیا گیا تھا۔ حالانکہ وہاں صنعتی اور تجارتی مرکز قائم کرنے کے ان گنت موقعے تھے۔ مسلمانوں کے پاس سرمایہ نہیں تھا اور پٹ سن کا نوے کروڑ روپے سالانہ کا کاروبار ہندو مارواڑیوں کے ہاتھ میں تھا جو اپنے نفعے کی رقمیں ہندوستان منتقل کر دیتے تھے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے وہاں بس ایک ہی طویل پختہ سڑک کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا جیسور سے شمال کو جاتا تھا۔ دوسری ایک برائے نام سی سڑک تھی جو ڈھاکہ کے گرد و نواح کے میدان سے ہو کر نارائن گنج کو جاتی تھی۔ اس کے علاوہ کوئی اور سڑک پورے صوبے میں نہ تھی۔ دریائی راستے البتہ موجود تھے لیکن ان کے ذرائع آمد و رفت بہت آہستہ اور ناتسلی بخش تھے۔ ایک عمدہ ریلوے ضرور موجود تھی لیکن پچھلی جنگ کے دوران میں اسے اتنا زیادہ کام لیا گیا تھا کہ گاڑیوں کے ڈبے ٹوٹ پھوٹ کر ناکارہ ہو چکے تھے اور ان کو تبدیل کرنے کی شدید ضرورت تھی۔

مجھے اس خیال سے بڑا رنج ہوتا تھا کہ مشرقی پاکستان کے خام مال سے کلکتہ تو اتنی ترقی پا گیا اور

مری میں پنڈت جواہرلال نہرو کے ساتھ

مشرقی پاکستان کے کسی حصے میں ایک بھی کارخانہ یا فیکٹری نظر نہ آئے۔

اس کے قصوروار ہم ہی تھے۔ کیونکہ حصولِ آزادی سے بہت پہلے اس صوبے کے مسلمان سیاسیات میں کافی بلند آہنگی دکھا چکے تھے اور اس صوبے نے فضل الحق، سہروردی اور ناظم الدین جیسے سیاستدان پیدا کیے تھے جن کا کسی نہ کسی حیثیت سے حکومت سے گہرا تعلق رہا تھا۔ پھر یہ سب اصحاب تقسیم سے پہلے بنگال کے وزیر اعلیٰ بھی رہ چکے تھے مگر وہ اپنے عوام کے لیے کچھ نہیں کر سکے تھے، شاید یہ کام تھا ہی مشکل۔

جب میں جنرل آفیسر کمانڈنگ مقرر ہو کر مشرقی پاکستان گیا تو اس وقت وہاں خواجہ ناظم الدین صوبے کے وزیر اعلیٰ تھے۔ وہ بڑے نیک اور متقی آدمی تھے اور انہوں نے عمر کا ایک طویل حصہ سیاسی جدوجہد میں گزارا تھا۔ مگر کسی معاملے کا فیصلہ کرنا ان کے لیے سخت اذیت ناک ہوتا تھا۔ میں نے ان کے دفتر میں کئی بار ان سے ملاقات کی۔ ان کا بارعب چہرہ فائلوں کے انبار کے پیچھے ناک تک چھپا ہوا نظر آتا۔ عام طور پر خیال کیا جاتا تھا کہ وزیر اعلیٰ کا مسائل کو حل کرنے کا ایک مخصوص طریقہ ہے۔ وہ یہ کہ جس کسی فائل پر فیصلہ دینے کی ضرورت ہوتی وہ چپکے سے اسے دوسری فائلوں کے نیچے دبا دیتے اور وہ وہاں دبا پڑا رہتا۔ یہاں تک کہ ایک مدت گزرنے کے بعد وہ مسئلہ خود بخود حل ہو جاتا۔

ان دنوں مجھے نورالامین اور حمید الحق چودھری سے بھی ملاقات کا موقع ملا۔ چودھری اس وقت صوبائی حکومت میں وزیر خزانہ تھے۔ نورالامین مجھے ذہین آدمی معلوم ہوئے۔ جو حالات کا مشاہدہ کرنے کی صلاحیت اور کسی قدر اس بات کی بھی سوجھ بوجھ رکھتے تھے کہ حکومت کا انتظام کس طرح چلانا چاہیئے۔ حمید الحق کے متعلق مشہور تھا کہ وہ ہوشیار آدمی ہیں۔ لیکن عام خیال یہ بھی تھا کہ وہ ترقی کے راستے میں رکاوٹ پیدا کرتے ہیں کیونکہ وہ نہیں چاہتے کہ باہر کا کوئی مسلمان ان کے صوبے میں آ کر کوئی صنعتی کارخانہ قائم کرے۔ اور پھر وہاں صنعتی کارخانہ قائم کرنا آسان کام بھی نہ تھا کیونکہ نہ بجلی تھی نہ رسل و رسائل کے ذرائع۔ یہاں تک کہ زمین کا ملنا بھی دشوار تھا۔ میرے علم میں اکثر یہ بات آیا کرتی تھی کہ حمید الحق ان مسلمانوں کو ہر طرح بددل کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو باہر سے آ کر ان کے صوبے میں سرمایہ لگانا چاہتے ہوں۔ ان مسلمانوں میں سے کچھ تو واپس ہندوستان چلے گئے اور کچھ کراچی آ گئے۔

میں نے دیکھا کہ باہر والوں کے خلاف ایک ذہنی دیوار کھڑی کی جا رہی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مشرقی پاکستان میں صنعت کاروں اور سرمائے کا آنا رک گیا۔ مغربی پاکستان میں صورت اس کے بالکل برعکس تھی۔ وہاں ہندوستان سے جو لوگ آئے انہیں کسی قسم کی جذباتی یا سیاسی مخالفت سے دوچار ہونا نہیں پڑا۔ آزادی کے بعد یو۔پی، بمبئی اور ہندوستان کے دوسرے شہروں سے مسلمان بھاری تعداد میں

ہجرت کر کے مغربی پاکستان آئے، اور یہاں انہوں نے صنعت و حرفت کے قیام میں بڑا نمایاں حصہ لیا۔ اسی طرح مسلح افواج اور سول سروسوں میں بھی بہت سے مہاجرین شامل تھے۔

آزادی کے وقت اعلیٰ سول سروس میں مشرقی پاکستان کا صرف ایک افسر تھا اس لیے یہ ضروری تھا مغربی پاکستان سے یا مہاجرین میں سے افسروں کو چن کر صوبے کے اعلیٰ انتظامی عہدوں پر مقرر کیا جائے لیکن مشرقی پاکستان کے تعلیم یافتہ طبقوں میں یہ بات صوبے کے معاملات میں دخل اندازی تصور کی گئی۔ صوبے کے بیشتر متوسط طبقے میں اپنے مغربی پاکستان کے ہم وطنوں کے خلاف عناد پیدا ہونے لگا انہوں نے دیکھا کہ وہ بڑے بڑے عہدوں کو حاصل کرنے میں اور خصوصاً تجارتی میدانوں میں پیچھے رہے جا رہے ہیں۔

صوبے کے رہنماؤں کو بڑی مشکل کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کے سامنے دو راستے تھے ایک تو یہ کہ وہ ایمانداری سے کام لے کر صورت حال کا اعتبار کرتے، اپنی خامیوں کو دیکھتے اور ان کو دور کرنے کے لیے تعلیمی اور ٹیکنیکل اداروں کی مدد لیتے اور ایک ایسا سماجی اور اقتصادی محاذ بناتے جہاں صوبے کے نوجوانوں کو اپنی قابلیت کے بل پر ملک کے دوسرے نوجوانوں کے ساتھ مقابلے کے لئے تیار کیا جاتا لیکن اس کے لیے سنجیدہ غور و فکر اور سخت محنت کے لیے تیار کیا جاتا لیکن اس کے لیے سنجیدہ غور و فکر اور سخت محنت کی ضرورت تھی اور وہاں ان دونوں باتوں کی سخت کمی تھی۔

دوسرا راستہ یہ تھا کہ سیاسی دباؤ ڈالا جائے اور سارا الزام مغربی پاکستان کے سر تھوپ دیا جائے مشرقی پاکستان کے سیاست دانوں نے اس دوسرے راستے کو زیادہ آسان اور مقبول عام پایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ صوبے کی سیاسی زندگی نے ایک شورش کا سا رنگ اختیار کر لیا جس سے میں فکرمند اور اداس ہو گیا میں نے دیکھا کہ صوبے کے بعض چرب زبان لیڈر عوام کے جذبات کو بھڑکا کر اپنا الو سیدھا کرنے کی سوچ رہے ہیں۔

اسی زمانے میں میری سہروردی صاحب سے ایک بڑی نتیجہ خیز ملاقات ہوئی جس سے ان کے دل و دماغ کی کیفیت مجھ پر روشن ہو گئی۔ کرزن ہال میں کوئی تقریب تھی، میں بھی وہاں موجود تھا۔ کسی نے سہروردی سے میرا تعارف کرایا۔ یہ ان سے میری پہلی ملاقات تھی۔ انہوں نے اپنے مخصوص بلند آہنگ لہجے میں مجھ سے خطاب کرتے ہوئے کہا "جنرل! حکومت نے مجھے صوبہ بدر کرنے کا حکم جاری کر دیا ہے۔ لیکن وہ نہیں جانتی کہ میں آنکھ جھپکنے میں ناظم الدین کو ختم کر سکتا ہوں۔"

میں نے کہا "مسٹر سہروردی، آپ مشرقی پاکستان کو اس کے حال ہی پر کیوں نہیں چھوڑ دیتے، اس کی مشکلات پہلے ہی کچھ کم نہیں کہ آپ ان میں اور اضافہ کریں۔"

اس کے جواب میں انہوں نے جو کچھ کہا میں اسے دہرا نہیں سکتا کیونکہ وہ فوت ہو چکے ہیں لیکن اس سے مجھ پر ظاہر ہو گیا کہ وہ مشرقی پاکستان کی صورت حال سے کس طرح فائدہ اٹھانے کی سوچ رہے تھے۔ چونکہ وہ سیاسیات میں کلیدی حیثیت رکھتے تھے، اس لیے میں اس نتیجے پر پہنچا کہ صوبے میں سیاسی دباؤ کی جو تحریک پھیلائی جا رہی ہے اس کا زور جلد کم نہیں ہو گا۔

مشرقی پاکستان میں کئی لوگ میرے دوست بن گئے جن سے میں بڑی بے تکلفی سے بات چیت کیا کرتا۔ میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ فرداً فرداً یہ سب لوگ میری رائے سے اتفاق کرتے تھے کہ صوبائی حکومت کوئی تعمیری کام نہیں کر رہی ہے اور ساری قوتیں سیاسی میدانوں میں لگائی جا رہی ہیں۔

مشرقی پاکستان کے نوجوانوں کو فوج کے لیے ٹریننگ دینے کا کام براہ راست میرے ذمے تھا۔ میں نے دیکھا کہ صوبے میں اعلیٰ درجے کے تعلیمی اور تربیتی اداروں کی بے حد کمی ہے۔ مجھے اس خیال سے پریشانی ہوتی تھی کہ اتنی بڑی آبادی میں مطلوبہ معیار کے اتنے کم لوگ ملتے ہیں۔ میں نے صوبائی حکومت سے اس معاملے پر بات چیت کی۔ میں نے اس سے پر زور درخواست کی کہ صوبے میں دو اچھے اچھے اسکول کھولے جائیں جہاں ذہین نوجوانوں کو اپنے دل و دماغ، جسم اور کردار کی مناسب تربیت مل سکے۔ میں نے اس سلسلے میں خواجہ ناظم الدین سے بھی بار بار درخواست کی۔ دوسرے لوگوں سے بھی میری لمبی لمبی بحثیں ہوئیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ یہ حضرات میرے مدعا کو اچھی طرح سمجھتے ہیں مگر یا تو وہ اس سلسلے میں کوئی قدم اٹھانا ہی نہیں چاہتے یا ایسا قدم اٹھانا ان کی طاقت سے باہر ہے۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ ان کو ڈر کس بات کا تھا۔ شاید وہ سمجھتے تھے کہ پبلک اسکول کے قیام سے عوام جو اثر لیں گے وہ ان کے حق میں مفید ثابت نہیں ہو گا۔ مجھے یاد ہے کہ مولانا اکرم خاں کے اخبار آزاد میں ایک مضمون چھپا تھا جس میں اسکول کھولنے کی تجویز پر حکومت کی مذمت کی گئی تھی کیونکہ ان کے خیال میں یہ اسکول غریبوں کے خرچ پر امیروں کے بچوں کے لیے کھولے جا رہے تھے۔

مشرقی پاکستان میں تقریباً چار کروڑ مسلمان بستے تھے۔ اتنے چھوٹے سے رقبے میں مسلمانوں کی اتنی زیادہ آبادی دنیا کے کسی اور حصے میں نہ تھی۔ مگر پھر بھی یہاں اس قابلیت اور صلاحیت کے پیدا کرنے میں، جس کی ایک آزاد ملک کے انتظام کے لیے ضرورت تھی، کوئی کوشش نہیں کی جا رہی تھی۔ میں برابر تعلیمی اور تربیتی اداروں کے قیام کی ضرورت پر زور دیتا۔ مگر بعض سیاست دان سمجھتے تھے کہ وہ عوام میں بے اعتمادی اور شک و شبہ پھیلا کر بہتر اور فوری نتائج حاصل کر سکتے ہیں۔

مجھے اس بات پر بھی تعجب ہوتا تھا کہ اس خطے میں ایسے افراد کی کمی کیوں ہے جو رہبری اور رہنمائی کی صفات رکھتے ہوں۔ آرمی سلیکشن بورڈ ہر چھٹے مہینے مشرقی پاکستان جایا کرتا تھا۔ شروع شروع

میں اس بورڈ کو پہلی یا دوسری ٹرم کے لئے چار یا پانچ لڑکے ایسے مل جاتے جنہیں آرمی ملٹری کالج میں داخل مل سکتا تھا۔ لیکن یہ لڑکے زیادہ تر مہاجر خاندانوں کے ہوتے تھے۔ جب یہ ذریعہ ختم ہو گیا تو مقامی لڑکوں کو چنا جانے لگا۔ اگر سلیکشن بورڈ کو ایک یا دو ایسے لڑکے مل جاتے جنہیں گوارا کیا جا سکتا تھا، تو یہ اس کی بڑی خوش قسمتی سمجھی جاتی تھی۔ میں بورڈ کو مشورہ دیا کرتا کہ ان کو بہر صورت چن لو کیونکہ کوئی شخص بھی نہیں مانے گا کہ بورڈ نے یہ انتخاب انصاف کے ساتھ اور رو رعایت کے بغیر کیا ہے یا یہ کہ قواعد و ضوابط کا پورا پورا لحاظ رکھا گیا تھا۔ تعلیم کے سارے نظام میں کوئی بات بنیادی طور پر غلط تھی۔ ضرورت تھی کہ کمی پر توجہ کی جائے۔ اور اسے مناسب تعلیم دلوا کر پروان چڑھایا جائے۔

مشرقی پاکستان کے لیڈروں کی طرف سے مجھے کبھی کوئی تسلی بخش جواب نہیں ملا۔ میں اپنے دوستوں سے کہا کرتا: "جاؤ اپنی حکومت سے کہو کہ وہ کچھ ہاتھ پاؤں ہلائے ورنہ تم پیچھے رہ جاؤ گے جاؤ اپنے معاملے کی پیروی کرو۔ اگر مغربی پاکستان کے لوگ تمہارے مفاد کے خلاف کوئی کام کرتے ہیں تو تم ان سے لڑو جھگڑو۔ مرکزی حکومت سے اپنے حقوق کے لیے جنگ کرو۔ تم یہ سب کچھ کرو مگر ساتھ ہی اس بات پر بھی اڑ جاؤ کہ تمہارے نوجوان مردوں اور عورتوں کو مناسب تعلیم و تربیت دلائی جائے تاکہ وہ بھی دوسرے شہریوں کے ساتھ مساوی حیثیت سے اپنی ذمہ داریوں کو نبھا سکیں تم اپنی بحث کو زیادہ طول نہ دو، جھگڑے کو حد سے زیادہ نہ بڑھاؤ۔ آخر انسان انسان سب ایک ہیں۔ اگر تمہارے مغربی پاکستان کے بھائی اس بات پر افسردہ ہونا اور غم کھانا شروع کر دیں کہ تم ہر وقت ان پر نکتہ چینی کرتے رہتے ہو، ان پر سیاسی دباؤ ڈالتے ہو، تو تمہاری وجہ سے ملک کے اتحاد کو کتنا عظیم نقصان پہنچے گا۔ خدا کے لیے اپنے لڑائی جھگڑوں اور اپنی بحثوں کو مناسب حدود میں رکھو۔"

میں یہ بات بھی پورے طور پر نہیں سمجھ سکا کہ مشرقی پاکستان میں سیاسی دباؤ کی جو تحریک پھیلائی جا رہی تھی وہ چھوٹی چھوٹی باتوں، مثلاً ذاتی شکایتوں اور رنجشوں کا نتیجہ تھی یا وہ کسی گہرے مرض کی علامت تھی۔ مشرقی پاکستان کے جو افسر مغربی پاکستان میں کام کر رہے تھے میں ان کے برتاؤ کے بارے میں اکثر نکتہ چینی سنا کرتا۔ ان پر الزام لگایا جاتا کہ وہ عوام سے ملنا جلنا پسند نہیں کرتے، وہ شدت پسند ہیں۔ اور ان کا انداز مربیانہ ہوتا ہے۔ میں نے اکثر ان افسروں کو کام کرتے ہوئے دیکھا۔ میری رائے میں وہ بڑی محنت سے کام کرتے تھے اور دل سے صوبے کی بھلائی چاہتے تھے۔ یہ اور بات تھی کہ ان کی عادتیں اور طور طریقے مختلف تھے، جن سے مشرقی پاکستان والوں کو بہت جلد غلط فہمی ہو جاتی تھی۔ یہ عام بات تھی کہ کوئی مغربی پاکستان والا ایک سادہ سے سوال کے جواب میں "اونہہ" کہہ

دے اور یہ نہ جانے کہ اس سے کوئی ناشائستہ حرکت ہوئی ہے۔

میرے ایک پرانے دوست راجہ غضنفر علی خان مرحوم برسوں ایران میں ہمارے سفیر رہے۔ اہل ایران بڑے خلیق اور شائستہ لوگ ہیں۔ راجہ صاحب نے یقیناً ان کی روایت اور تہذیب کا بڑا اثر قبول کیا ہوگا۔ جب وہ پاکستان واپس آئے تو میں نے ان سے پوچھا:

"کہیے راجہ صاحب مزاج کیسا ہے؟" کہنے لگے: "بھئی میں وطن واپس آیا ہوں، بڑی کسی قدر گرم جوشی کی توقع رکھتا ہوں، لیکن یہاں جس کسی سے ملتا ہوں اور کوئی بات پوچھتا ہوں تو بس ایک روکھی پھیکی "ا ہوں" کے سوا کچھ جواب نہیں ملتا۔" میں نے کہا: "راجہ صاحب معلوم ہوتا ہے آپ میں کسی قدر غیریت آگئی ہے۔ ہم تو ایسی باتوں کا برا نہیں مانتے۔"

چنانچہ ممکن ہے کہ مغربی پاکستان والوں کے اخلاق و اطوار مشرقی پاکستان والوں کو کھٹکتے ہوں مجھے موسیقی سے زیادہ شغف نہیں، لیکن رفتہ رفتہ میں بنگالی گانوں کو پسند کرنے لگا۔ وہ گانے مجھے بہت لبھاتے تھے۔ ایک دفعہ میں نے ایک دوست سے کہا "تمہاری موسیقی جتنی میٹھی ہے کاش تم اس سے آدھے ہی میٹھے ہوتے۔"

میں نے دیکھا کہ اگر ایک بار کوئی کسی مشرقی پاکستانی سے واقفیت پیدا کر لے تو وہ بھی اسے دل سے پسند کرنے لگتا ہے۔ مصیبت یہ تھی کہ مشرقی اور مغربی پاکستانیوں کے درمیان کچھ زیادہ سماجی میل جول نہیں تھا۔ مغربی پاکستان والا وہاں خود کو اکیلا محسوس کر کے اپنے ہی آدمیوں کا گروہ بنانے پر مجبور ہو جاتا تھا۔ میں مغربی پاکستانیوں سے کہا کرتا "تم ان سے کیوں نہیں ملتے؟ تم ان کو اپنے گھر پر بلاؤ اور زیادہ نہیں تو چائے کی ایک پیالی ہی سے ان کی تواضع کر دو۔ جب تم انسان انسان کی حیثیت سے ایک دوسرے سے ملو گے تو تم میں یگانگت اور میل ملاپ آپ ہی آپ پیدا ہو جائے گا۔"

مغربی پاکستان والے بھی کچھ فرشتے یا اخلاق حسنہ کا نمونہ نہ تھے۔ ان میں سے زیادہ تو سرکاری ملازم تھے جنہیں یہ احساس تھا کہ مغربی پاکستان کی نسبتاً زیادہ با آسائش زندگی چھوڑ کر آئے ہیں۔ وہ متوسط طبقے سے تھے اور اہل و عیال رکھتے تھے۔ دونوں صوبوں میں آنا جانا بھی مشکل اور گراں تھا۔ وہ مشرقی پاکستان والوں کی عام نااہلی پر بڑبڑاتے رہتے تھے اور اس بات کو چھپا نہیں سکتے تھے کہ انہیں مشرقی پاکستان میں نوکری کرنا پسند نہیں۔ غرض عجیب صورت حال تھی۔ ایک طرف تو ڈھاکہ کے لوگ عموماً یہ سمجھتے تھے کہ مغربی پاکستان سے آئے ہوئے افسران پر حکومت جتانا چاہتے ہیں اور دوسری طرف مغربی پاکستان والے اس افسری کو اپنے لئے عذاب سمجھتے تھے۔

مجھے یاد ہے ایک دفعہ میں نے کسی سے مذاق سے کہا تھا۔

"تم میرے خلاف تحریک شروع کر کے مجھے یہاں سے نکلوا کیوں نہیں دیتے۔ یقین جانو میں اپنی برأت میں ایک لفظ تک نہ کہوں گا۔"

سچ یہ ہے کہ ان دنوں مغربی پاکستان کے لوگ سخت مجبوری کے تحت جایا کرتے تھے۔ ان دنوں وہاں تعلیم، رہائش اور صحت و صفائی کا کوئی معقول انتظام نہ تھا لیکن اب یہ حالت نہیں۔ آج کل وہاں فوج اور شہری محکموں میں بہت سی آسانیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ اور عام لوگوں کی حالت بھی اچھی ہے اور اب تو ان لوگوں کے دلوں میں بھی جو مجبوراً وہاں گئے تھے، مشرقی پاکستان کی الفت پیدا ہو گئی ہے اور بہت سے لوگ جو وہاں ملازمت کر آئے ہیں مشرقی پاکستان کو اس طرح یاد کرتے ہیں جیسے کوئی گھر کو یاد کرتا ہے۔

اب میں پھر اس زمانے کی فوجی زندگی کا ذکر کرتا ہوں۔ میں ان دنوں بہت مصروف رہا۔ میں ہر ضلع اور سب ڈویژن میں گھومتا پھرتا رہا اور جن راستوں سے حملے کا خطرہ تھا ان کی شناخت کر کے صوبے کے بچاؤ کا منصوبہ تیار کرتا رہا۔

مجھے صوبے کے اندرونی نظم و ضبط کے بارے میں بھی تشویش تھی۔ پولیس والوں کی شکایتوں پر کچھ دھیان نہیں دیا جا رہا تھا اور میں جانتا تھا کہ اگر بڑے پیمانے پر ہنگامے شروع ہو گئے تو ان کی روک تھام کے لیے میرے پاس کافی فوج نہ ہوگی۔ پولیس کی جمعیت میں تقریباً ساٹھ ہزار آدمی تھے۔ ان میں بھارت کے آدمی شامل تھے۔ بعض مغربی بنگال کی پولیس سروس سے آئے تھے وہ قاعدے قانون کی زیادہ پابندی نہیں کرتے تھے۔ یہی حال بڑے افسروں کا تھا۔ سیاست دانوں نے سول سروس کی تنظیم کی ضروریات کے بارے میں فوری طور پر کچھ فیصلہ نہیں کیا تھا۔ اور یہ اسکا نتیجہ تھا کہ صوبے بھر میں سخت بے اطمینانی اور بدنظمی پھیل رہی تھی۔

مواد اندر ہی اندر پک رہا تھا جو آخر ۲۷ جولائی ۱۹۴۸ء کو ڈھاکہ میں پھوٹ پڑا۔ میں ذاکر حسین کے ساتھ جو اس وقت انسپکٹر جنرل پولیس تھے، دورے پہ تھا۔ ہم میمن سنگھ کے ایک ریسٹ ہاؤس میں مقیم تھے کہ ڈھاکہ سے پیغام پہنچے۔ معلوم ہوا کہ پولیس نے گورنمنٹ ہاؤس اور وزیر اعلیٰ کے مکان کو گھیر رکھا ہے۔ کچھ پولیس والے سول سکریٹریٹ کے سامنے بھی دیکھے گئے۔ انہوں نے پولیس لائنز کے اسلحہ خانے سے اسلحہ اور گولہ بارود حاصل کر لیا تھا اور باقاعدہ مورچے بنا لیے تھے۔

میرے لیے یہ بڑی الجھن کی بات تھی۔ ایک طرف تو مجھے پولیس کے افسر اعلیٰ کو جس کا میں مہمان تھا مطمئن کرنا تھا، دوسری طرف اس کے باغی سپاہیوں سے نمٹنا تھا۔ میں نے بٹالین کمانڈر

سے کہا کہ انہیں تنبیہ کرو اور کوئی اندھا دھند کارروائی نہ کرنے دو۔ کئی گھنٹے بحث مباحثہ ہوتا رہا
مگر وہ اپنی لائنوں میں واپس جانے پر آمادہ نہ ہوئے۔

اس کے بعد بٹالین کمانڈر نے ٹیلی فون پر مجھے بتایا کہ باغی سپاہی مصالحت پر آمادہ نہیں ہیں۔
جب ان سے کوئی اپیل کی جاتی ہے تو وہ فوج کو گالیاں دینے لگتے ہیں۔ چنانچہ ہمارے لیے اب عملی
قدم اٹھانے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا تھا۔ میں نے بٹالین کمانڈر سے کہا کہ کم سے کم فوج کے ساتھ
باغیوں کے خلاف فوجی کارروائی کرو۔

پولیس نے جو دفاعی مورچے بنا رکھے تھے وہ شہر کے بیچوں بیچ تھے اس لیے اس بات کا خطرہ تھا
کہ کہیں عوام گولیوں کی زد میں آ کر زخمی نہ ہو جائیں۔ ہمارے پاس حملے کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہ تھا۔
یہ کام ۸/۳ پنجاب رجمنٹ کی ایک کمپنی کے سپرد کیا گیا۔ اسے پولیس کے مورچے تک پہنچنے کیلئے کھلے
میدان میں کوئی تین سو گز کا فاصلہ طے کرنا تھا۔ اس نے تیزی سے پیش قدمی کی اور مورچے پر قبضہ
کر لیا۔ ایک یا دو آدمی جن میں اس فساد کا سرغنہ بھی تھا مارے گئے اور دس بارہ آدمی زخمی ہوئے
ہنگامہ فرو ہو گیا۔ صورت حال پر قابو پا لیا گیا اور باقی صوبے میں بھی گڑبڑ کا خطرہ نہ رہا۔

اسی طرح ایک اور موقعے پر مجھے سول حکام کی مدد کرنی پڑی۔ مجھے خواجہ ناظم الدین نے بلوایا
اور مجھ سے کہا کہ وہ اسمبلی میں صرف چار ممبروں کی مشکوک اکثریت رکھتے ہیں۔ انہیں فکر ہے کہ
کہیں ان ممبروں کو توڑ نہ لیا جائے کیونکہ فضل الحق نے طلباء کو اکسا رکھا ہے اور وہ ان کے حامیوں
کو ڈرا دھمکا رہے ہیں۔ خواجہ صاحب چاہتے تھے کہ میں طلباء کو اسمبلی ہال پر دھاوا بولنے سے
باز رکھوں۔ مجھے اس معاملے میں دخل دینے سے انکار کر دینا چاہیے تھا، کیونکہ دراصل یہ کام پولیس
کا تھا، لیکن مجھے یہ خیال پریشان کرتا تھا کہ اگر حکومت کا نظام درہم برہم ہو گیا تو ممکن ہے دور
دور تک فتنہ و فساد اور غنڈہ گردی پھیل جائے۔ چنانچہ میں نے میجر پیرزادہ کے ماتحت ایک انفنٹری
کمپنی کو اسمبلی ہال کے پاس تعینات کر دیا تاکہ ضرورت پڑے تو وہ پولیس کی مدد کر سکے۔

اسمبلی کا اجلاس شروع ہوا اور وزیر اعلیٰ نے اپنی تقریر شروع کی جس کے متعلق انہوں نے
مجھ سے کہا تھا کہ "بے حد اہم" ہے۔ باہر طلباء اودھم مچا رہے تھے اور چیخ چیخ کر دیوانے ہو رہے تھے۔ فضل الحق اپنے آدمیوں
سے کام لینا خوب جانتے تھے۔ وہ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد اسمبلی ہال سے برآمد ہوتے اور طلباء
کے کان میں ایک نیا نعرہ پھونک کر پھر اندر چلے جاتے۔ اور طلباء اس تازہ نعرے سے آسمان سر پر
اٹھا لیتے۔ یہ کارروائی شام کے پانچ بجے تک ہوتی رہی۔ اسی وقت مجھے یہ پیغام ملا کہ طلباء فوج کے
بہت قریب پہنچتے جا رہے ہیں اور ان سے جھڑپ ہو جانے کا خطرہ ہے۔

یہ سردیوں کے دن تھے اور اندھیرا ہونا شروع ہوگیا تھا۔ مجھے فکر تھی کہ اگر طلباء فوج کی طرف بڑھتے تو وہ ضرور ان پر گولی چلا دے گی۔ اور میں نہیں چاہتا تھا کہ یہ صورت پیش آئے۔ چنانچہ میں نے اسمبلی میں جانے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے وہاں اس قدر ابتری دیکھی کہ زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ اندر وزیر اعلیٰ ایک غصے میں بھرے ہوئے اور لڑنے مرنے پر تیار مجمع کے سامنے ایک ولولہ انگیز تقریر کر رہے تھے اور باہر طلباء کو کھلی چھٹی تھی کہ جو ان کے جی میں آئے کریں۔

اس وقت سپرنٹنڈنٹ پولیس عبید اللہ ڈیوٹی پر تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ تم کچھ کارروائی کر کے لڑکوں کو پیچھے کیوں نہیں ہٹاتے؟ انہوں نے کہا "جناب اگر آپ مجھے حکم دیں تو میں ابھی کارروائی کرنے کو تیار ہوں لیکن میں ان سیاست دانوں کے لیے کوئی کام کرنے کو تیار نہیں۔" مجھے سخت حیرت ہوئی۔ میں نے پوچھا "کیوں؟" انہوں نے بیان کیا "یہ لوگ آج طلباء کو منتشر کرنے کا حکم دیں گے اور کل اس بات کی تحقیقات کرائیں گے کہ ایسا کیوں ہوا، اور سارا الزام مجھ پر ڈال دیں گے اور خود کبھی اس کی ذمہ داری نہیں لیں گے۔ میں تحریری حکم چاہتا ہوں۔"

ظاہر ہے کہ پولیس کا نظم و ضبط بڑی پست حالت میں تھا۔ میں اسمبلی میں گیا اور وزیر اعلیٰ سے مل کر انہیں بتایا کہ اندھیرا ہوتا جا رہا ہے اور طلباء فوج کے بہت قریب پہنچ گئے ہیں۔ انہوں نے پوچھا "مجھے کیا کرنا چاہیے؟" گھبرا کر بولے: "یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میں اپنی اس اہم تقریر کو ادھ بیچ میں کیسے چھوڑ سکتا ہوں؟"

شاید انہوں نے میرے ہونٹوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ دیکھ لی تھی اسی لئے انہوں نے فیصلہ کیا: "اچھی بات ہے مجھے پانچ منٹ کی مہلت دو۔"

وہ اجلاس میں گئے اور کسی سے کچھ کہہ سن کر واپس آگئے۔ کہنے لگے "میں گھر جانے کو تیار ہوں لیکن یہاں سے نکلو کیسے؟" میں نے میجر پیرزادہ سے کہا کہ وہ وزیر اعلیٰ کی کار اسمبلی کے پچھواڑے لے آئیں۔ پھر میں نے اور پیرزادہ نے جیسے تیسے وزیر اعلیٰ کو باورچی خانے کے راستے اسمبلی ہال سے نکالا۔ جب ہم اس کام سے نمٹ چکے تو میں نے طلباء سے کہا "سونے کی چڑیا تو اڑ گئی!" طلباء نے زور زور سے قہقہے لگائے اور وہاں کی فضا جو لمحہ بھر پہلے بڑی گھمبیر اور خطرے سے پر معلوم ہوتی تھی ہنسی مذاق اور خوش دلی میں بدل گئی۔

فضل الحق محمد علی بوگرا کے ساتھ جو اس وقت مخالف پارٹی میں شامل تھے، اسمبلی ہال سے باہر آئے۔ انہوں نے طالب علموں کو پھر اکسانا چاہا۔ میں نے محمد علی کے شانے پر تھپکی دی اور کہا، "کیا آپ کو کسی گولی کی جستجو ہے؟" انہوں نے پلٹ کر جواب دیا "آپ کا برتاؤ بڑا ناشائستہ

ہے۔" میں نہیں چاہتا تھا کہ پھر سے ہنگامہ شروع ہو جائے اس لیے میں نے ان سے زور دے کر کہا کہ آپ گھر چلے جائیں۔

محمد علی کے پاس پانچ ووٹ تھے۔ وہ فوراً وزیر اعلیٰ کے پاس پہنچے اور ان کو دھمکی دی کہ میں اپنی حمایت سے پھر جاؤں گا۔ اس پر وزیر اعلیٰ نے مجھے بلوایا۔ پہلے صورت حال کو سنبھالنے پر میرا شکریہ ادا کیا۔ اس کے بعد مجھ سے کہا کہ آپ نے محمد علی کو ناراض کر دیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مجھے حکومت سے ہاتھ دھونے پڑیں گے میں نے کہا آپ انہیں بلوائیے تاکہ میں ان پر صورت حال واضح کر دوں جب محمد علی آئے تو میں نے انہیں گلے سے لگا لیا۔ اور کہا "میں تو آپ سے مذاق کر رہا تھا۔ آپ کو اسے سچ نہیں سمجھ لینا چاہیئے تھا۔"

میں اس معاملے میں سخت بیزار ہو چکا تھا اور نہیں چاہتا تھا کہ ان کی آپس کی چپقلش میں خود کو زیادہ الجھاؤں بہرحال محمد علی کا غصہ اتر گیا۔ اور ہم دوستوں کی طرح ایک دوسرے سے رخصت ہوئے۔

ان ہی دنوں مجھے ایک ایسی جگہ کی تلاش تھی جہاں ہیں ڈویژنل ہیڈ کوارٹر قائم کر سکوں۔ ڈھاکہ میں اس کے لیے کوئی موزوں جگہ نہیں تھی۔ مجھے ہائیکورٹ کی عمارت نظر آئی۔ لیکن ہائی کورٹ کے حکام سے یہ بات کہنا آسان نہ تھی کہ اس عمارت کا کچھ حصہ ہمیں دے دیں۔ تاہم چیف جسٹس مسٹر جسٹس محمد اکرم بڑے معقول آدمی تھے۔ ان کے بعض جج صاحبان خیموں میں بیٹھا کرتے تھے۔ لیکن انہوں نے کمال مہربانی سے ہمیں اپنی ضرورت کے مطابق جگہ دے دی۔

مجھے یاد ہے ایک دن میں ایک معائنے کے بعد ہائی کورٹ واپس آرہا تھا تو میں نے دیکھا کہ فضل الحق طلباء سے کہہ رہے ہیں "تم سب زمین پر لیٹ جاؤ تاکہ عدالت کا کام نہ چل سکے۔" میں نے اپنی کار سے سر باہر نکالا اور پوچھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔

فضل الحق نے مجھے دیکھ لیا۔ اور وہ دل میں سمجھ گئے کہ یہ کوئی خطرناک قدم اٹھا بیٹھے گا چنانچہ انہوں نے چپکے سے طلباء کو وہاں سے چلے جانے کی ہدایت کر دی۔ میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اس زمانے میں زندگی ہنگاموں اور دلچسپیوں سے خالی نہ تھی۔

صوبے سے رخصت ہونے سے پہلے میں وہاں ایک خاصی اچھی انصار فوج بنانے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کام میں مجھے عزیز احمد سے بہت مدد ملی جو اس زمانے میں وہاں چیف سیکرٹری تھے۔ انہیں احساس ہوا کہ ایسی فوج سے عوام میں نظم و ضبط پیدا ہوگا اور انہوں نے صوبائی حکومت کو اس کے لیے ذرائع مہیا کرنے پر آمادہ کر لیا۔ ایسٹ بنگال رجمنٹ بھی میرے ہی زمانے میں وجود میں آئی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اس صوبے کے لوگ ایک جنگجو یونٹ میں بھرتی کیے گئے۔

علاوہ ازیں میں نے "ایسٹ پاکستان رائفلز" کے نام سے پولیس کی ایک جمعیت بھی قائم کی اور ایک ایسے نظام کی بنیاد ڈالی جس سے پولیس کے تمام افسروں کو جنگی تعلیم مل سکے۔ اس سے پولیس کو بے حد فائدہ پہنچا اور ان میں بے حد خود اعتمادی اور سربلندی کا احساس پیدا ہو گیا۔

میں نومبر ۱۹۴۹ء کے ختم پر بڑی افسردہ دلی کے ساتھ مشرقی پاکستان سے رخصت ہوا۔ رفتہ رفتہ میں یہاں کے لوگوں کا بڑا گرویدہ ہو گیا اور اس علاقے کے مسائل کو بھی کسی قدر سمجھنے لگا تھا جس سے آگے چل کر مجھے بہت فائدہ پہنچا۔

مشرقی پاکستان سے مجھے دسمبر ۱۹۴۹ء میں جنرل ہیڈکوارٹرز میں بلایا گیا اور ایڈجوٹنٹ جنرل مقرر کیا گیا۔ اس وقت جنرل گریسی کمانڈر ان چیف تھے اور جنرل راس میکے ان کے چیف آف اسٹاف۔ ایڈجوٹنٹ جنرل کی برانچ عملے کی دیکھ ریکھ، افسروں اور جوانوں کی بھرتی، طبی سہولتوں، تنخواہوں، پنشنوں اور فوجی نظم و ضبط کی دیکھ بھال کرتی تھی۔

پہلے پہل مجھے جن مسائل سے دوچار ہونا پڑا، ان میں آزاد کشمیر کی فوج کا مسئلہ بھی شامل تھا۔ کشمیر میں جنگ بندی کی وجہ سے لڑائی ختم ہو چکی تھی اور اس امر کی ضرورت تھی کہ آزاد فوج کو باقاعدہ حیثیت میں لایا جائے اور ان میں فوجی ضابطہ پیدا کیا جائے۔ اس فوج میں مختلف قابلیتوں کے کوئی پچاس ہزار مسلح جوان تھے، مگر ان پر کوئی فوجی قاعدہ قانون عائد نہ ہوتا تھا۔ اس مسئلے پر جنرل ہیڈکوارٹرز اور حکومت آزاد کشمیر کے درمیان عرصے تک خط و کتابت ہوتی رہی۔

شاہ نام کے کوئی صاحب جو آزاد کشمیر گورنمنٹ کے سربراہ تھے اور ریاستی فوج سے بھی کچھ تعلق رکھتے تھے۔ یہ صاحب بہرے تھے اور اپنے ساتھ ایک بڑا سا سننے کا آلہ اٹھائے پھرتے تھے۔ ان کو اصرار تھا کہ آزاد فوج پر برٹش آرمی ایکٹ عائد کیا جائے۔ وہ اپنے اس دعوے کی حمایت میں یہ دلیل پیش کرتے تھے کہ برطانیہ نے جب کبھی ریاست فوج کو اپنے کسی کام کے لیے استعمال کیا تو اس پر انڈین فوجی قانون نہیں بلکہ برٹش فوجی قانون نافذ کیا گیا۔

میں نے جب یہ بات سنی تو مجھے بڑا غصہ آیا اور میں نے ان شاہ صاحب سے بات کرنے کی ٹھان لی۔ میں نے انہیں بتایا کہ انگریز چلے گئے ہیں اور اپنے ساتھ اپنا قاعدہ قانون بھی لیتے گئے ہیں۔ اب ہمارے پاس صرف ایک ضابطہ ہے اور وہ ہے پاکستان آرمی ایکٹ۔ اگر آزاد فوج بھی اس ایکٹ کے تحت آجائے تو اس کا نظم و ضبط بہتر ہو جائے۔

میں نے دیکھا کہ جب شاہ صاحب کوئی بات سننا نہ چاہتے تو چپکے سے اپنے سننے کے آلے کو کان سے پرے سرکا دیتے۔ میں نے ان کے ساتھ بہت مغز زنی کی، مگر ان کی طرف سے کچھ جواب

نہ پایا۔ جب میں ان سے پوچھتا کہ کیا آپ کو میری بات منظور ہے تو وہ ایسی صورت بنا لیتے جیسے کچھ
سنا ہی نہیں۔ لیکن آخر کار آزاد فوج نے یہ بات منظور کر لی کہ اس پر پاکستان آرمی کا ضابطہ نافذ
کیا جائے۔

گریسی بڑے نیک آدمی تھے۔ وہ دوسروں کے جذبات کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ انہوں نے مجھے
بہت آزادی دے رکھی تھی۔ راس میکے بڑے باریک بین اسٹاف افسر تھے۔ ان کا فوجی ریکارڈ بڑا شاندار
تھا۔ مجھے اسٹاف کے معاملے میں ان کے مشوروں سے بڑی مدد ملتی تھی۔ وہ بڑے مخلص، سنجیدہ اور
مستقل مزاج افسر تھے۔ ہمارے پاس تنخواہ یا پنشن کا کوئی ضابطہ نہیں تھا اور فوجیوں کو طویل اور قابل فخر
سروس کے صلے میں جو وظائف یا رقوم ملا کرتی تھیں گورنمنٹ نے انہیں بند کر دیا تھا۔ نہ اعزازی کمیشن
دیا جا سکتا تھا اور نہ کسی قسم کا نقد انعام۔ میں نے اس سلسلے میں وزارت خزانہ سے ایک طویل اور سخت
جنگ شروع کی پھر بھی مجھے ان میں سے بعض مسائل کو حل کرنے میں تقریباً سات برس لگ گئے۔ میں
وزارت خزانہ میں کوئی تجویز لے کر جاتا اور درخواست کرتا کہ خدا کے لیے ہاں کہو یا نہیں مگر کچھ کہو
ضرور۔ اس کی مثال ایسی تھی جیسے کوئی شخص ایک پر اسرار خاموشی کی دیوار کے ساتھ اپنا سر دے
مارے اور پھر چوٹی کے لوگوں تک جو اپنی اپنی خاموش دیواریں تعمیر کرنے میں مصروف نظر آتے تھے،
رسائی بھی ہمیشہ آسان نہ ہوتی تھی۔ چنانچہ یہ چھوٹی چھوٹی دیواروں مثلاً نائب مشیر مالیات تک پہنچ جانا
بھی غنیمت تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ سارے معاملات ہی ایسے لوگوں کی مرضی پر چھوڑ دیئے گئے ہیں کہ نہ تو
ان پر کوئی دلیل یا بحث کارگر ہوتی تھی اور نہ انہیں وقت کے تقاضوں کا کچھ احساس تھا۔

مجھے امید تھی کہ چودھری محمد علی جو اس وقت حکومت پاکستان کے سیکرٹری جنرل تھے ہماری
مشکلات کو دور کرنے میں ہمارا ہاتھ بٹائیں گے کیونکہ وہ فوج کے معاملات کو کچھ سمجھتے تھے۔ وہ آزادی
سے پہلے ملٹری فنانس کے فنانشل ایڈوائزر بھی رہ چکے تھے۔ ان سے میری براہ راست بات چیت
تو زیادہ نہیں ہوئی لیکن جہاں تک مجھے علم ہے انہوں نے ہمارے مسائل کو حل کرنے میں ذرہ بھر
بھی ہماری مدد نہیں کی۔

سچ یہ ہے کہ پاکستانی آرمی میں بڑی بے اطمینانی پائی جاتی تھی۔ ہم جنرل ہیڈکوارٹرز میں اکثر سوچا کرتے
کہ اگر خدانخواستہ ہم پر کوئی برا وقت آ پڑے تو ہمیں کیسی بے بسی کا سامنا کرنا پڑے۔ میں کراچی کی مرکزی
حکومت کو بار بار یاد دلاتا رہتا کہ یہ صورت حال صحت مندانہ نہیں ہے۔ جس شخص سے ہم یہ توقع رکھتے ہیں
کہ وہ ایک دن اپنے وطن کی خاطر اپنی جان عزیز قربان کر دے اس کی کفالت اور خانگی کا کچھ نہ کچھ
انتظام تو ہونا چاہیے۔ اور کچھ نہیں تو اس کی ملازمت کی شرطیں ہی طے ہو جانی چاہئیں۔ جب تک

ایسا نہیں ہوگا وہ پورے دل کے ساتھ اپنے فرائض کو انجام نہیں دے سکے گا۔

علاوہ ازیں فوج کے مستقبل کے بارے میں بھی حکومت کی پالیسی کا صاف فیصلہ ہو جانا اشد ضروری تھا کیونکہ اس کے بغیر ہم اپنی تنظیم شروع نہیں کر سکتے تھے۔ ہمارے حصے میں زمانۂ جنگ کی فوج آئی تھی جس میں اعلیٰ درجے کے لڑنے والے جوان تو موجود تھے مگر ان میں فوجی تربیت ناقص تھی۔ بہت سے افسروں کو مختصر مدت کے ایمرجنسی کمیشن کے تحت بھرتی کیا گیا تھا ان کی ٹریننگ بھی نہیں ہوئی تھی اور وہ نہیں جانتے تھے کہ امن کے زمانے میں فوج کے فرائض کیا ہوتے ہیں۔

بھارت میں کوئی کلاس مسلم رجمنٹ نہیں تھی۔ انگریز مسلمانوں کو بہت خطرناک سمجھتے تھے اور انہیں ہمیشہ مختلف رجمنٹوں میں بکھیر دیا کرتے تھے۔ آزادی کے بعد ہم نے ان آدمیوں کو مناسب یونٹوں میں بھیجا ضرور تھا لیکن چونکہ یہ لوگ ایک دوسرے سے ناواقف تھے اس لیے ان میں فوجی یگانگت پیدا نہ ہو سکی بلکہ فوجی نظم و ضبط میں نقص پیدا ہو گیا۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں نے اس نقص کو رفع کرنے کے لیے کچھ سخت طریقے اختیار کیے۔ تمام فوج میں یہ خبر تیزی کے ساتھ پھیل گئی کہ میں فوجیوں کو جسمانی سزا دینے سے بھی نہیں چوکتا۔ اس کا اثر اچھا ہوا۔ افسروں میں جو بے راہ روی پھیلی ہوئی تھی اس کی روک تھام کے لیے اور بھی سخت کارروائی کی ضرورت تھی۔ لیکن میں نے محسوس کیا کہ میں کمانڈر انچیف کو اپنا ہم خیال نہ بنا سکوں گا۔ چنانچہ میں نے اس کارروائی کو کسی اور مناسب وقت کیلیے اٹھا رکھنے کا فیصلہ کیا۔

میں نے ایک آفیسرز ٹریننگ اسکول جاری کیا اور ملٹری کیڈٹس کے کام کی دیکھ بھال کی۔ فوج کے مستقبل کا دارومدار اس امر پر تھا کہ ہم مخصوص تربیتی ادارے قائم کریں اور ایسے باقاعدہ افسر پیدا کریں جن کو فوجی نظم و ضبط کا پورا پورا احساس ہو اور جو زمانۂ امن کی ضرورتوں کے مطابق کام کی لگن رکھتے ہیں۔

میں نے ایڈجوٹنٹ جنرل کی حیثیت سے کوئی سال بھر کام کیا۔ اس سے مجھے بہت فائدہ پہنچا۔ کیونکہ یہاں میں فوجی تنظیم کے بنیادی مسائل سے دوچار ہوا۔ علاوہ ازیں مرکزی حکومت کے کام کو بھی براہ راست دیکھنے کا موقع ملا مثلاً مرکز کے مالیاتی شعبے ہیں۔ ان تمام کوتاہیوں اور مشکلوں کے باوجود مجھے یہ اطمینان ضرور حاصل تھا کہ ہمارے پاس ایک جواں سال فوج اور اعلیٰ درجے کا انسانی جوہر موجود ہے۔ خدا نے ہمیں اس امر کا نہایت شاندار موقع بخشا تھا کہ ہم اپنے وطن کی خدمت کے لیے اپنی ایک فوج تیار کریں اور ایسا ہی ہم نے کر دکھایا۔

کمانڈر انچیف

اس بات پر طرح طرح کی قیاس آرائیاں ہو رہی تھیں کہ جب جنرل گریسی کی ملازمت کی میعاد ختم ہو گی تو ان کی جگہ کسی پاکستانی کے کمانڈر انچیف بنائے جانے کا کس حد تک امکان ہے۔ گریسی شاید اپنے عہدے پر قائم رہنا پسند کرتے۔ لیکن عام خیال یہی تھا کہ پاکستانی فوج کی کمان کسی پاکستانی ہی کے ہاتھ میں ہونی چاہیئے۔ ممکن ہے اس کی وجہ یہ ہو کہ جب اکتوبر ۱۹۴۷ء میں قائد اعظم نے پاکستانی فوجوں کو کشمیر بھیجنا چاہا تھا تو گریسی نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی منظوری کے بغیر جو سپریم کمانڈر تھے ایسا حکم جاری کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ آکن لیک بیچ میں پڑ گئے اور ان کے کہنے سننے سے قائد اعظم اپنے فیصلے میں تبدیلی کرنے پر راضی ہو گئے۔ مگر اس کارروائی سے گریسی لوگوں کی نظروں سے گر گئے تھے۔

مجھے یاد ہے کہ نئے کمانڈر انچیف کے تقرر سے بہت دن پہلے وزیر اعظم لیاقت علی خان راولپنڈی آئے تھے اور ڈویژنل کمانڈروں کی کانفرنس ہوئی تھی جس میں شرکت کے لیے میں مشرقی پاکستان سے آیا تھا۔ وزیر اعظم نے تمام اونچے درجے کے پاکستانی افسروں کو بلوایا تھا۔ اور سرکٹ ہاؤس میں ان سے خطاب کیا تھا۔ اپنی تقریر کے آخر میں انہوں نے کہا تھا کہ اب سے پاکستانی فوج کا کمانڈر انچیف کسی پاکستانی کو بنانے کا فیصلہ کر لیا گیا ہے۔ لیکن ابھی کسی شخص کو منتخب نہیں کیا گیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ عہدہ سب سے سینئر افسر کو نہ دیا جائے۔ وہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ اگر یہ عہدہ اس سے کم تر درجے کے افسر کو دیا جائے تو سینئر افسروں پر اس کا اثر کیا ہوگا۔

انہوں نے کئی افسروں سے یہ بات پوچھی اور آخر میں مجھ سے مخاطب ہوئے۔ میں سرے پر بیٹھا تھا۔ انہوں نے کہا:

"جنرل ایوب۔ آپ اس بارے میں کچھ کہنا چاہتے ہیں؟"

"میں نے کہا: "جناب نہایت ادب سے مجھے یہ کہنے کی اجازت دی جائے کہ یہ سوال اٹھایا

ہی نہیں جانا چاہیے تھا. ہماری فوجی تعلیم بڑی سادہ اور صاف ہے. فوجی افسروں کی حیثیت سے ہم اپنی انتہائی قابلیت کے ساتھ کام کرتے ہیں اور اس کے اچھے یا بُرے ہونے کا فیصلہ اپنے سے اونچے افسروں پر چھوڑ دیتے ہیں. وہ جو فیصلہ بھی کریں خواہ ہمیں پسند ہو یا ناپسند، اسے ماننا ہمارا فرض ہے. اور اگر کوئی اسے ماننے کو تیار نہ ہو تو اسے فوج سے تشریف لے جانا چاہیے."

میرا خیال ہے کہ جنرل رضا اور بعض دوسرے لوگ چوٹی کے افسر گنے جاتے تھے اور وہ اس سلسلے میں دوڑ دھوپ بھی کر رہے تھے. علاوہ ازیں جنرل افتخار کا بھی بڑا چرچا تھا. بعض لوگوں کا خیال تھا کہ انگریز ان کی پشت پر ہیں. وہ بہت اچھے افسر تھے، لیکن بدقسمتی سے وہ اور جنرل شیر خان، جنگ شاہی میں ہوائی جہاز کے ایک حادثے میں جاں بحق ہو گئے. جنرل افتخار کے ساتھ لوگوں کی کم بنتی تھی اور پھر انہیں غصہ بھی جلد آ جایا کرتا تھا. میں نہیں کہہ سکتا کہ انہیں کمانڈر انچیف کی حیثیت سے کس حد تک کامیابی ہوتی لیکن اس میں شبہ نہیں کہ انہیں بڑی مشکل کا سامنا کرنا پڑتا.

جس وقت میں ایڈجوٹنٹ جنرل کی حیثیت سے راولپنڈی پہنچا تو اس زمانے میں نئے کمانڈر انچیف کے بارے میں بڑی افواہیں گرم تھیں. ایک دو مرتبہ میری بیوی نے بھی مجھ سے پوچھا کہ کس شخص کے کمانڈر انچیف بننے کا امکان ہے. میں نے جواب دیا: "سچ پوچھو تو مجھے کچھ علم نہیں لیکن میں اتنا جانتا ہوں کہ جو شخص بھی مقرر ہو، میرے کام کا بوجھ جوں کا توں رہے گا."

اس کے بعد لوگوں نے براہ راست مجھ سے پوچھنا شروع کیا. میں نے سوچا کہ اس قسم کی گپ شپ سے جان چھڑانے کا عمدہ طریقہ یہ ہے کہ چھٹی لے لی جائے. چنانچہ میں اپنے بیوی بچوں کو لے کر دو مہینے کے لیے ہی نتھیا گلی کی سرد پہاڑیوں پر چلا گیا.

ستمبر ۱۹۵۰ کی ایک رات کو وزارت دفاع کے ایک افسر نے ٹیلی فون پر مجھے بتایا کہ آپ نئے کمانڈر انچیف چن لیے گئے ہیں. مجھے ان عظیم ذمہ داریوں کا گہرا احساس تھا جو مجھ پر عائد ہونے والی تھیں. میں نے خدا سے دعا کی کہ وہ مجھے ہمت اور قابلیت عطا فرمائے تاکہ میں خود کو اس کام کا اہل ثابت کر سکوں.

یہ ایک ایسا واقعہ تھا جو ملک کے لیے خاصی اہمیت رکھتا تھا. تقریباً دو سو سال کے بعد اس برصغیر میں ایک مسلم فوج کا کمانڈر اعلیٰ ایک مسلمان مقرر ہوا تھا. میں جانتا تھا کہ اس ملک میں جس قسم کی بھی روایات اور جس قسم کے بھی معیار قائم ہو چکے ہیں ابھی مدتوں فوج ان کے زیر اثر رہے گی. میں نے دل میں ٹھان لی کہ میں فوجی کام اور لوگوں کے ساتھ اپنے معاملات میں اعلیٰ ترین مثال قائم کروں

گا۔ مجھے ایک نوخیز فوج کی تنظیم کا کام سپرد ہونے والا تھا۔ میرے لیے یہ آزمائش اور خدمت گزاری کا ایک عظیم موقع تھا۔

میری کوشش سب سے پہلے یہ ہوئی کہ مسلح افواج کے اراکین میں خودداری کا احساس پیدا ہو۔ وہ خود اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے اور ذاتی قابلیت کی بنا پر رکھے جانے کا سبق سیکھیں۔ مجھے جلد ہی معلوم ہو گیا کہ یہ کام اتنا آسان نہیں جتنا میں نے سمجھ رکھا تھا۔

جنرل گریسی نے اس اعلان کو بڑے اچھے سبھاؤ سے سنا۔ مجھے پہلے ڈپٹی کمانڈر انچیف مقرر کیا گیا تاکہ میں کام سے واقفیت حاصل کر لوں۔ میں ایک مختصر دورے پر جرمنی اور انگلستان بھی گیا تاکہ وہاں کے فوجی اداروں کا معائنہ کر کے اپنے علم میں اضافہ کر سکوں۔

۱۷ جنوری ۱۹۵۱ء کو میں نے کمانڈر انچیف کا عہدہ سنبھالا۔ جنرل گریسی جب رخصت ہونے لگے تو انہوں نے مجھے کچھ زیادہ ہدایات نہیں دیں۔ اس قسم کے عہدے کا چارج لینے دینے میں یہی ہوتا بھی ہے۔ نئے آدمی کو اپنا کام نئے سرے سے شروع کرنا پڑتا ہے۔ لیکن انہوں نے کسی قدر مبہم طور پر مجھ سے فوج میں ایک نوجوان ترک پارٹی کی موجودگی کا ذکر کیا۔ میں نے وضاحت چاہی تو انہوں نے کچھ زیادہ تشریح نہ کی۔ بس اتنا کہا کہ ان میں اکبر خان جیسے کچھ لوگ شامل ہیں۔ اس کے دو یا تین مہینے کے بعد ہی اکبر کی سازش کا انکشاف ہوا جسے بعد میں "سازش راولپنڈی" کے نام سے یاد کیا گیا۔

اس سازش کا حال مجھے وزیراعظم لیاقت علی خان کی زبانی معلوم ہوا۔ وہ اس وقت انتخابی دورے میں مصروف تھے۔ انہوں نے مجھے اور سکندر مرزا کو سرگودھا کے ریلوے اسٹیشن پر ملاقات کے لیے بلوایا۔ مجھے لاہور سے اور سکندر مرزا کو کراچی سے۔ میں سکندر مرزا سے کوئی ڈیڑھ گھنٹہ پہلے پہنچ گیا۔ میں نے دیکھا کہ وزیراعظم کچھ مضطرب سے ہیں۔ یہ غیر معمولی بات تھی کیونکہ وہ طبعاً بڑے متحمل مزاج تھے۔ ان کے چہرے سے کبھی بدمزاجی ظاہر نہیں ہوتی تھی۔ انہوں نے سکندر مرزا کے بارے میں پوچھا "یہ کم بخت کہاں رہ گیا؟ اب تک کیوں آیا؟"

سکندر مرزا لنچ کے وقت پہنچے۔ وزیراعظم نے ہم دونوں کو کھانے پر مدعو کیا۔ اس دوران میں ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ جب کھا چکے تو انہوں نے کرسی سے ٹیک لگا کر ہم سے کہا: "صاحبان میں آپ لوگوں کو ایک بہت بری خبر سنانے والا ہوں۔ میرے علم میں یہ بات آئی ہے کہ بعض فوجی افسروں نے حکومت کا تختہ الٹنے کا منصوبہ بنایا ہے اور بہت جلد اس پر عمل ہونے والا ہے۔"

میں نے ان سے مزید تفصیلات کی درخواست کی۔ انہوں نے وہ پوری رپورٹ مجھے دے دی جو چندریگر صاحب نے انہیں بھیجی تھی۔ چندریگر اس زمانے میں شمال مغربی صوبہ سرحد کے گورنر تھے۔ میں نے

مشورہ دیا کہ ہمیں کوئی کارروائی کرنے سے پہلے واقعات کی چھان بین کر لینی چاہیے۔

میں اور سکندر گورنر سے ملاقات کے لیے پشاور پہنچے۔ ہم اس پولیس افسر سے بھی ملنا چاہتے تھے جس نے گورنر کو یہ رپورٹ بھیجی تھی اور مخبر سے بھی۔ میں نے گورنر سے بات چیت کی۔ اس کے بعد ہماری ملاقات ان پولیس افسر سے ہوئی جنہوں نے رپورٹ دی تھی۔ کیانی مخبر کا نام ظاہر کرنا نہیں چاہتے تھے۔ لیکن آخر کار ہم نے مخبر کو پکڑ بلوایا۔ ادھر تو میں کیانی سے سوالات کر رہا تھا اور ادھر سکندر مرزا مخبر سے پوچھ گچھ میں مصروف تھے۔ جلد ہی ہم پر عیاں ہو گیا کہ ایک بغاوت کا منصوبہ بنایا گیا ہے۔ سازشیوں میں ایک شخص بریگیڈیئر صدیق خان بھی تھا، جو کبھی میری یونٹ میں کام کر چکا تھا اور اب بنوں میں ایک بریگیڈ کی کمان کر رہا تھا۔ وہ کسی قدر غیر مستقل مزاج، جذباتی اور بے دھڑک قسم کا آدمی تھا۔ میں نے اس کو لانے کے لیے ہوائی جہاز بھیجا۔ جب وہ آیا تو میں نے اس سے کہا "صدیق تم مجھے سچ سچ بتا دو ورنہ میں تمہیں الٹا لٹکا دوں گا۔"

صدیق نے لاعلمی ظاہر کی اور کہا کہ رپورٹ جھوٹی ہے۔

ہم نے صدیق کو واپس بنوں جانے کی اجازت دے دی۔ اس نے وہاں پہنچ کر کرنل ارباب کو تھل کے مقام پر ٹیلی فون کیا۔ کرنل ارباب بھی جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا، سازشیوں میں سے تھا۔ صدیق نے اسے بتایا کہ بھانڈا پھوٹ گیا ہے۔ اس سے مجھے یقین ہو گیا کہ حکومت کا تختہ الٹنے کے لیے زبردست سازش کی جا رہی تھی۔

اس وقت تک ہمیں کافی معلومات حاصل ہو چکی تھیں۔ چنانچہ ہم نے واپس آ کر وزیر اعظم لیاقت کو صورت حال سے مطلع کر دیا۔ انہوں نے فوری کارروائی کا فیصلہ کیا۔ قربان علی خان انسپکٹر جنرل پولیس کو صورت حال سے آگاہ کیا گیا، اور وہ تمام فوجی افسر اور شہری جن کا اس سازش سے تعلق تھا، راتوں رات اپنے اپنے ٹھکانوں سے گرفتار کر لیے گئے۔ میرا خیال تھا کہ مقدمہ فوجی عدالت میں پیش ہونا چاہیے لیکن مشکل یہ آن پڑی کہ ان میں بعض شہری بھی شامل تھے۔ چنانچہ وزیر اعظم نے فیصلہ کیا کہ ایک اسپیشل سول ٹریبونل مقرر کیا جائے اور مقدمے کی کارروائی بند کمرے میں ہو تا کہ سرکاری راز افشا ہونے نہ پائیں۔

مقدمے کی کارروائی حیدرآباد جیل میں ہوئی۔ ملزمین نے مقدمے کی پیروی کے لیے سہروردی کو چنا۔ میں نے غور کیا سہروردی نے بڑی عجیب طبیعت پائی تھی۔ وہ نائٹ کلبوں کی رنگیلی زندگی پر جان دیتے تھے مگر ساتھ ہی وہ بے حد باہمت اور مستعد بھی تھے۔ اس مقدمے کے سلسلے میں جو فوجی افسر گواہ کے طور پر پیش ہوئے، سہروردی نے ان پر بڑے مزے لے لے کر جرحیں کیں۔ میں نے دیکھا کہ وہ جرح کرتے وقت اپنے مدعا سے بہت بڑھ جاتے تھے لیکن عدالت خاموشی سے سنتی رہتی۔ کبھی

سوائے خاموشی کے چارہ نہ تھا۔

سازشیوں پر جرم ثابت ہوا اور ان کو سزائیں دی گئیں۔ اس کے چند سال بعد سہروردی اور ان کے ساتھیوں نے حکومت پر زور ڈالا کہ قیدیوں کو رہا کر دیا جائے۔ حکومت اس کی مجاز تھی اور میں اس پر اعتراض نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن جو بات میں کبھی معاف نہ کر سکا وہ فوجی افسروں پر سہروردی کی بلاوجہ درشتی اور مناقشت سے بھری ہوئی جرح تھی۔

اس کے بعد ہم دونوں کابینہ میں وزیر مقرر ہوئے۔ کابینہ کے ایک اجلاس میں جب سازش کا موضوع زیر بحث آیا تو سہروردی نے اس پر کچھ خیال آرائی کی۔ اس پر میں نے ان کو آڑے ہاتھوں لیا۔ میں نے کہا کہ آپ نے دوران مقدمہ میں فوج کے وقار کو جس طرح نقصان پہنچایا، وہ پاکستان کے مفاد کے منافی تھا۔ انہوں نے کچھ جواب نہ دیا۔ بعد میں جب وہ وزیر اعظم مقرر کئے جا رہے تھے تو میں بھی اتفاق سے کراچی ہی میں تھا۔ سکندر مرزا نے مجھے بلوایا اور کہا "ہم مسٹر سہروردی کو وزیر اعظم بنانے والے ہیں اور اس حیثیت سے وہ تمہارے وزیر دفاع بھی ہوں گے۔ وہ چاہتے ہیں کہ تم سے صلح صفائی ہو جائے۔ میری رائے میں تم دونوں کی ملاقات ہونی چاہیے۔"

سہروردی ایوان صدارت میں آئے۔ میں نے ان سے کہا کہ میرے بارے میں آپ کے جو خیالات ہیں میں انہیں بخوبی جانتا ہوں، اور آپ کے بارے میں میرے جو خیالات ہیں یقیناً آپ بھی ان سے واقف ہوں گے لیکن کمانڈر انچیف کی حیثیت سے میں آپ کے ہر اس حکم کو بجا لاؤں گا جو قانونی طور پر جائز اور درست ہوگا۔ اس کے ساتھ ہی میں بھی یہ امید رکھوں گا کہ فوج کے اندرونی معاملات میں کسی قسم کی دخل اندازی نہ کی جائے گی۔ سہروردی نے یہ تجویز منظور کر لیا۔ اس پر ہم دونوں نے مصافحہ کیا۔

میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ سہروردی نے فوج کے اندرونی معاملات میں کبھی دخل نہ دیا اور جب کبھی میں کسی مسئلے پر بات چیت کرنے ان کے پاس پہنچا تو انہوں نے میری بات کان دھر کر سنی اور جلد فیصلہ صادر کیا۔

راولپنڈی سازش کی جڑیں دور دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ بے اطمینانی اور بے اعتباری کی زمین میں یہ پودا پھلا پھولا تھا۔ اس کے پروان چڑھنے کی کئی وجہیں تھیں۔

اس زمانے میں نچلے افسروں کو جلد جلد اونچے اونچے فوجی مناصب دیئے جا رہے تھے۔ جس کی وجہ سے تمام افسروں میں ایک کھلبلی سی مچ گئی تھی اور ان کی توقعات حد سے متجاوز ہو گئی تھیں۔ ہر افسر یہ محسوس کرنے لگا تھا کہ کمانڈر انچیف نہ بنا تو کچھ بات نہ ہوئی۔ کچھ عجیب صورت حال

تھی۔ اچھے خاصے ہوشیار اور سمجھدار لوگ، بریگیڈیئر اور جنرل تک ہر ایک کے سامنے اپنی قسمت کا رونا لے بیٹھتے۔ ہر شخص اپنی دانست میں گویا نپولین تھا مگر قسمت کا مارا ہوا۔ میں اپنے دل میں کہا کرتا کہ اگر آزادی نہ ملتی تو میں بریگیڈیئر بننا بھی اپنی بڑی خوش قسمتی خیال کرتا۔ آزادی کے بعد بھی اگر میں میجر جنرل کی حیثیت سے ریٹائر ہوتا تو خود کو ایک بہت کامیاب انسان تصور کرتا۔ عام طور پر ایک فوجی افسر کی توقع یہ ہوتی تھی کہ اسے یونٹ کی کمان مل جائے گی، لفٹیننٹ کرنل بنا دیا جائے گا اور اسی عہدے پر وہ سروس سے ریٹائرڈ ہو جائے گا مگر اب جو یوں بڑے بڑے عہدے آسانی سے دستیاب ہونے لگے تو ان کی قدر گر گئی اور لوگوں کی ہوس کی انتہا نہ رہی۔

ادھر کشمیر میں لڑائی ہو رہی تھی اس کی ابتدا ایک بے قاعدہ جنگ کے طور پر ہوئی تھی۔ سپاہی اور افسر خود ہی جو کارروائی چاہتے تھے وہ کرتے تھے۔ ہیڈ کوارٹرز سے انہیں بہت کم ہدایت ملتی تھی۔ چھوٹے چھوٹے افسروں نے بڑی ذمہ داری کے کام سنبھال رکھے تھے۔

لیکن میرے خیال میں اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ہماری گورنمنٹ اپنے فرائض مناسب طریق پر انجام دینے میں ناکام رہی تھی۔ جب اکبر خان کے کاغذات پر قبضہ کیا گیا تو ان میں ہمیں ایک مقالہ ملا۔ اس میں اس نے وزیر اعظم اور حکومت کے تمام لوگوں پر الزام لگایا تھا کہ وہ نااہل ہیں، اور فیصلہ دینے کی اہلیت نہیں رکھتے۔ اکبر خاں کا مقصد ایک بہتر نظام حکومت قائم کرنا تھا۔ وہ ایک بہادر افسر تھا۔ فوج میں اس کا بڑا مان تھا۔ لیکن اس کے حوصلے بہت بڑھ گئے تھے۔ اس کی بات میں بڑی تاثیر تھی۔ لوگ آسانی سے اس کے ہم خیال ہو جاتے تھے اور اس نے اس جال میں بہت لوگوں کو پھانس رکھا تھا۔

اگرچہ مجھے یہ گمان تو کبھی نہ گزرا تھا کہ وہ حکومت کا تختہ الٹنے کی فکر میں ہے۔ تاہم اس کی طرف سے میرے دل میں کچھ کھٹکا ضرور رہنے لگا تھا۔ مجھے اس کی ترقی کی حد سے بڑھی ہوئی خواہش اس کے خاندانی حالات اور اس کے سیاسی جھکاؤ کا علم تھا۔ جب مجھے کمانڈر انچیف بننے کے بعد بعض افسروں کو جن میں اکبر خان بھی شامل تھا میجر جنرل کے عہدے پر ترقی دینے کی ضرورت پڑی تو مجھے اس امر پر خاصا سوچ بچار کرنا پڑا کہ اس کے سپرد کیا کام کیا جائے۔ آخر میں نے اس کو چیف آف جنرل اسٹاف بنا کر جنرل ہیڈ کوارٹرز میں رکھنے کا فیصلہ کیا۔ اس سے میرا مقصد یہ تھا کہ وہ میری آنکھوں کے سامنے رہے، اور فوجی دستوں پر براہ راست کمان نہ کر سکے۔ میں نے دیکھا کہ وہ چیف آف جنرل اسٹاف کی حیثیت سے اپنے فرائض ٹھیک طور پر انجام نہیں دیتا، اور اپنا بہت سا وقت آزاد کشمیر میں سدھنوں اور دوسرے لوگوں سے ملنے میں گزار دیتا ہے،

میں نے دو ایک کام اس کے سپرد کیے جنہیں وہ وقت پر پورا نہ کر سکا۔ میں نے اس سے کہا کہ تم سوکھا راشن مثلاً کیمیاوی غذائیں مہیا کرنے کا انتظام کرو۔ یہ چیزیں ہمارے ان آدمیوں کے لئے ضروری تھیں جو دشمن کے علاقے میں کام کر رہے تھے۔ اکبر خان مجھ سے ملنے سے کتراتا رہا۔ میں نے دل میں کہا "یہ شخص یا تو نا قابل ہے، یا اس کا جی کام میں نہیں لگتا، یا پھر اس کا دماغ کسی اور طرف لگا ہوا ہے۔" اس طرح میرے دل نے گویا خطرے کی گواہی دے دی تھی۔

سازش کے اس نتیجے نے مجھے اور فوج کے تمام صحیح الدماغ لوگوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ اس سے فوج کے وقار کو سخت صدمہ پہنچا۔ لوگ بجا طور پر یہ پوچھ سکتے تھے کہ یہ ہمیں کس قسم کی سپہ حاصل ہے
فوج کو وفاداری، فرض شناسی، حب وطن، اور سول حکام کی پوری پوری اطاعت کی ایک عظیم الشان روایت ترکے میں ملی تھی۔ اس بات کا تو کسی کو گمان تک نہ ہو سکتا تھا کہ ایسے وقت میں جب کہ ملک کی حالت بڑی نازک تھی، ہمارے استحکام کا یہ زبردست ہتھیار ایسا غیر مستحکم ثابت ہوگا۔ یہ خیال کر کے میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں کہ اگر یہ سازش کامیاب ہو جاتی تو ملک اور فوج کا کیا حشر ہوتا۔

اس سازش کی کامیابی کی دو ہی صورتیں ہو سکتی تھیں۔ ایک تو یہ کہ فوجوں کے درمیان کسی قسم کی جھڑپ ہوئے بغیر سازشیوں کو فوری اور مکمل کامیابی حاصل ہو جاتی۔ کیونکہ ان لوگوں نے مجھے اور مجھ جیسے دوسرے وفادار سینئر فوجی افسروں کو کسی قسم کی جوابی کارروائی کرنے سے پہلے ہی حراست میں لے لیا ہوتا۔

کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ فوج اس تبدیلی کو قبول کر لیتی یا نہ کرتی۔ لیکن ہر حالت میں کچھ مدت کے لئے ہر طرف افراتفری پھیل جاتی۔ اور پھر اکبر خان اور ان کے چیلے چانٹے، بشرطیکہ وہ ہوشیاری سے اپنی جگہوں پر جمے رہتے، رفتہ رفتہ صورت حال پر قابو پا لیتے۔

دوسری طرف اس بات کا بھی امکان تھا کہ ہم میں سے کسی کے کان میں اس سازش کی بھنک پڑ جاتی اور ہم فوجوں کو حرکت میں لا کر پیش بندی کے طور پر ان سازشیوں کے خلاف کارروائی کر بیٹھتے۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ پاکستانی فوج کے مختلف یونٹوں میں جھڑپیں شروع ہو جاتیں۔ اگر یہ صورت پیش آتی تو ہندوستانی فوج ہم پر چڑھ آتی۔ دراصل یہی وہ بات تھی جس سے میں ڈرتا تھا۔ میں جلد

۱۔ اکبر خان کا مقدمہ خصوصی عدالت میں پیش ہوا اور انہیں سزا ہوئی۔ رہائی کے بعد وہ ایک عام شہری کی زندگی گزار رہے ہیں۔

ہی اس صدمے سے سنبھل گیا اور فوج کے وقار، اس کی لیاقت اور خود اعتمادی کو بحال کرنے میں کوشاں ہو گیا۔ میرا دل کہتا تھا کہ جیسے ہی یہ مقصد پورا ہو جائے گا، پاکستانیوں کی نظروں میں فوج کی وقعت پھر بحال ہو جائے گی۔

ہم نے افسروں کے چال چلن اور پچھلے حالات کا بغور مطالعہ کیا، اور مشتبہ لوگوں کو الگ کر دیا۔ تربیتی مشقیں وسیع پیمانے پر شروع کرا دیں، اور میں خود مختلف یونٹوں کا معائنہ کرنے کے لیے مسلسل دورے کرتا رہا۔ میں جانتا تھا کہ فوج کے جسم سے ناسور کو نکال دیا گیا ہے لیکن ابھی زخم کے بھرنے میں کچھ وقت لگے گا۔

شاید یہ بات عجیب سی معلوم ہو لیکن اس میں کلام نہیں کہ میں اس دن رات کی محنت سے خوش تھا، کیونکہ اس طرح خود کو کام میں مصروف رکھ کر مجھے یہ سوچنے کی مہلت ہی نہ ملتی تھی کہ پاکستان کے سیاسی اور انتظامی حالات کیسے اندوہناک ہوتے جا رہے ہیں۔ کراچی سازشوں کا گھر بنا ہوا تھا۔ یہ خدا کی بڑی مہربانی تھی کہ ہمارا ہیڈکوارٹر راولپنڈی میں تھا۔ جب کبھی میں کراچی کے دورے سے واپس آتا، تو بڑا افسردہ اور دل برداشتہ ہوتا، اور سوچتا کہ ہمارے ملک کو کیا ہو گیا ہے؟ لوگ دیانت داری سے اپنا کام کیوں نہیں کرتے۔ ان میں یگانگت کا جذبہ کیوں پیدا نہیں ہوتا؟ یہ لڑائی جھگڑے، یہ تفرقے، یہ کینہ، یہ عناد کس لئے ہے۔ لوگ ایک دوسرے کو تباہ کرنے کے کیوں درپے ہیں؟ جب میں کراچی سے واپس آتا تو تین چار دن تک میری حالت درست نہ ہوتی۔ میں اپنے آپ سے کہا کرتا "کراچی وہاں ہے اور ہم یہاں، ہمیں تو بس فوج کا انتظام ٹھیک رکھنا چاہیئے۔" مجھے فرار کی صرف یہی صورت نظر آتی تھی کہ خود بھی محنت مشقت کروں اور سپاہیوں سے بھی محنت مشقت کراؤں۔

مجھے کمانڈر انچیف کی حیثیت سے آئے دن کسی نہ کسی اہم معاملہ پر مشورے کے لئے کراچی جانا پڑتا۔ میں سکندر مرزا سے جو اس وقت ڈیفنس سیکرٹری تھے پوچھا کرتا کہ کیا آپ اس مسئلے پر خود وزیراعظم سے بات کرنا پسند کریں گے مگر وہ ہمیشہ مجھی کو ان کے پاس بھیج دیتے۔ یہ ایک ناگوار سا ضابطہ بن گیا۔ پہلے میں وزیراعظم سے فیصلہ لیتا پھر اس پر عملدرآمد کرانے کے لیے ڈیفنس سیکرٹری سے بات چیت کرتا۔ کبھی کبھی سکندر مرزا خود بھی کسی فیصلے کی توثیق کے لیے وزیراعظم سے ملتے۔ ایک دفعہ وزیراعظم سے اپنی ملاقات میں میں نے کہا کہ اگر ہماری بات چیت کے موقع پر ڈیفنس سیکرٹری بھی موجود ہوا کریں تو بڑی آسانی پیدا ہو جائے۔

مسٹر لیاقت علی خان نے کہا: "تم چاہو تو انہیں ساتھ لا سکتے ہو۔ لیکن میں تمہیں بتا دوں کہ یہ انہیں

کرتا۔" اس کے بعد میں اور سکندر مرزا ایک ساتھ وزیر اعظم کے پاس جایا کرتے رفتہ رفتہ ان کے تعلقات بہتر ہو گئے۔

میں تھوڑے ہی عرصے میں وزیر اعظم لیاقت علی خان کا بڑا گرویدہ ہو گیا۔ وہ بڑے دلاور اور جری انسان تھے۔ کوئی بات انہیں پریشان نہ کر سکتی تھی۔ انہوں نے قائد اعظم کے ایک وفادار نائب کی حیثیت سے کام کیا تھا۔ اور وہ ہمیشہ خود پیچھے رہ کر کام کرنے سے خوش ہوتے تھے۔ وہ اب خود کو بے مونس و غم خوار محسوس کرتے تھے۔ اور اس قسم کی پوزیشن میں انسان ایسا محسوس کرنے ہی لگتا ہے۔ کبھی کبھی مجھے گمان ہوتا کہ وہ روز بروز مجھ پر زیادہ بھروسا کرنے لگے ہیں۔ جب کبھی وہ مجھ سے کسی امر میں مشورہ کرتے، تو میں انہیں بے لاگ اور سچی رائے دیتا۔ میں نے دیکھا کہ ان پر چودھری محمد علی کا بڑا اثر ہے۔

۱۹۵۱ء میں جب ہندوستانیوں نے ہماری سرحدوں پر بہت ساری فوجیں جمع کر دیں تو مسٹر لیاقت علی خان کے دل میں جنگ کا بڑا ولولہ تھا۔ انہوں نے کہا "میں ان روز روز کی دھمکیوں سے تنگ آچکا ہوں۔ بہتر ہے کہ ہم لڑ بھڑ کر فیصلہ کر لیں۔"

میں نے گزارش کی کہ آپ کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے ان لوگوں کی رائے بھی تو معلوم کر لیجیے جن کا پیشہ لڑنا ہے۔ جو بات وہ نہیں جانتے تھے اور جو میں ان کو بتلانا نہیں چاہتا تھا یہ تھی کہ اس وقت ہندوستانی فوج کے مقابلے کے لیے ہمارے پاس لے دے کر کل تیرہ ٹینک تھے۔ جن کے انجنوں کی عمر صرف چالیس پچاس گھنٹے رہ گئی تھی۔ اس وقت ملک کی صورت حال یہ تھی کہ ہمارے سیاستدان ہی نہیں خود ہمارے سپاہی بھی دشمن سے دو دو ہاتھ کر لینے کے لیے سخت بے چین تھے۔ ان سب کو روکنا میرا کام تھا اور خدا کا شکر ہے کہ میں اس میں کامیاب رہا۔ وزیر اعظم بڑے ہوش مند اور معاملہ فہم آدمی تھے۔ وہ ہر بات کے اچھے اور برے دونوں پہلوؤں پر غور کرنے کے لیے ہر وقت آمادہ رہتے تھے اور کبھی کوئی کام جلدی میں نہیں کرتے تھے۔

آخر آخر میں ان پر کئی طرف سے اعتراضوں کی بوچھاڑ ہونے لگی تھی۔ سیاسیات پر مقامی رنگ چڑھ چکا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وزیر اعظم مہاجر گروپ پر زیادہ سے زیادہ بھروسا کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ پنجاب میں کشیدگی بڑھتی جا رہی تھی۔ جس کی وجہ نواب ممدوٹ اور میاں دولتانہ کی آپس کی چپقلش تھی۔ مسٹر لیاقت علی خان نے یقیناً دل میں سوچا ہو گا کہ دولتانہ کا ساتھ دینا زیادہ سود مند ثابت ہو گا۔

مسلم لیگ کے معاملات بڑے الجھے ہوئے تھے۔ مسلم لیگ ہائی کمان اور ورکنگ کمیٹی کی

باگ ڈور گنتی کے چند لوگوں کے ہاتھ میں تھی۔ اور پارٹی کا کوئی تنظیمی ڈھانچہ نہیں تھا۔ صوبوں میں جھگڑے بڑھ رہے تھے اور مشرقی پاکستان کے مطالبات زور پکڑتے جا رہے تھے۔ ادھر لیاقت علی خان کی طرف سے صورت حال پر قابو پانے میں ڈھیل ہوتی جا رہی تھی۔ ان کی بینائی بھی کمزور ہو گئی تھی۔ میں نے دیکھا کہ وہ کاغذات پڑھتے وقت ایک خاص زاویے پر رکھا کرتے تھے۔ ان کے ارد گرد جو لوگ تھے وہ بھی ویسے ہی سست قدم اور قوت فیصلہ سے محروم تھے۔ ان میں کوئی بھی ایسا نہ تھا جو کسی امر کا بھی دل جمعی کے ساتھ فیصلہ کر سکے۔

میں یہ بات واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ پارٹی میں اس سے قبل ہی پھوٹ پڑنی شروع ہو گئی تھی بلکہ اس کی ابتداء قائد اعظم کے زمانے ہی سے ہو گئی تھی جب چودھری خلیق الزمان ایسے لوگ ان سے اختیار کو جھٹلانے لگے تھے۔

راولپنڈی سازش کے مقدمے کے کچھ ہی مہینے بعد وزیر اعظم ایک عام جلسے میں تقریر کر رہے تھے کہ گولی کا نشانہ بنا دیا گیا۔ یہ واقعہ ۱۶ اکتوبر ۱۹۵۱ء کو راولپنڈی میں پیش آیا۔ یہ بات آج تک نہ کھل سکی کہ اس جرم کا اصل مقصد کیا تھا۔

میں اس وقت لندن کے ایک شفاخانے میں بخار کا علاج کرا رہا تھا۔ پانچ چھ سال سے میرا درجہ حرارت کم رہنے لگا تھا۔ ۱۹۵۰ء میں میں نے اپنڈیسائٹس کا آپریشن کرایا تھا۔ اس کے بعد سے میرے نظام ہضم میں کچھ خرابی پیدا ہو گئی تھی۔ مجھے یاد ہے جب حبیب ابراہیم رحمت اللہ نے جو اس وقت لندن میں ہمارے ہائی کمشنر تھے، ہسپتال میں ٹیلی فون کر کے مجھے اس المناک واقعہ کی اطلاع دی تھی تو مجھے ایسا محسوس ہوا تھا جیسے میرا کوئی بھاری ذاتی نقصان ہو گیا ہو۔ وجہ یہ تھی کہ میرے دل میں مسٹر لیاقت علی خان کی بے حد عزت اور وقعت تھی اور میں یہ بھی جانتا تھا کہ ان کی وفات سے ملک کو زبردست نقصان پہنچا ہے

یہ بات جلد ہی واضح ہو گئی کہ ان کے حلقے میں کوئی بھی ایسا شخص نہیں جو ان کی جگہ کو پُر کر سکے۔ سارے ملک میں حالات تیزی سے بگڑنے شروع ہو گئے تھے اور ہمارے ملک کی تاریخ میں دکھوں اور مصیبتوں کا وہ دور شروع ہو گیا جو کئی سال تک قائم رہا۔

جب میں پاکستان واپس آیا تو مجھے کراچی میں نئی کابینہ کے اراکین سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ میں نے وزیر اعظم خواجہ ناظم الدین، چودھری محمد علی، مشتاق احمد گورمانی اور دوسرے لوگوں سے ملاقات کی۔ ان میں سے کسی نے نہ تو مسٹر لیاقت علی خان کا نام ہی لیا اور نہ ان کے منہ سے اس واقعہ پر افسوس، اور ہمدردی کے دو بول ہی نکلے۔ گورنر جنرل غلام محمد بھی اس حقیقت سے بے خبر معلوم ہوتے تھے

کہ ایک قاتل کی سنگدلانہ حرکت نے ملک کو ایک نہایت قابل اور ممتاز وزیراعظم سے محروم کر دیا ہے۔ میں نے دل میں کہا کہ انسان کیسا بے حس، بے درد اور خود غرض واقع ہوا ہے۔ ان حضرات میں سے ہر ایک نے خود کو کسی نہ کسی طرح ترقی کے بام بلند پر پہنچا دیا تھا۔ وزیراعظم کی موت نے گویا ان کے لیے ترقی کی نئی راہیں کھول دی تھیں۔ اس بات سے دل میں حد درجہ کراہت اور نفرت پیدا ہوتی تھی۔

بات تو بے شک تلخ ہے لیکن مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے ان سب لوگوں نے اطمینان کا سانس لیا ہو کہ وہ واحد ہستی جو ان سب کو قابو میں رکھ سکتی تھی دنیا سے اٹھ گئی ہے اور اب ایک سیاسی دنگل کھل گیا ہے، جس میں ہر ایک کو زور آزمائی کی کھلی چھٹی ہے۔ وزیراعظم کی موت سے ملک بھر رنجیدہ تھا ہر طرح کی افواہیں پھیل رہی تھیں اور لوگ بعض وزیروں اور دوسرے بڑے لوگوں پر الزام لگاتے تھے کہ انہوں نے اس قتل کی سازش کی تھی۔ میرے دل میں لمحہ بھر کے لیے بھی یہ خیال پیدا نہیں ہوا کہ ان میں سے کسی کا اس قتل سے کوئی تعلق ہو سکتا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ بیگم لیاقت علی خان کا ابھی تک یہ خیال ہے کہ حکومت نے قتل کی تحقیقات کرانے اور مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچانے میں پوری پوری کوشش نہیں کی۔ اس سلسلے میں سکاٹ لینڈ یارڈ کا جو ماہر بلوایا گیا تھا میں نے اس کی رپورٹ دیکھی تھی۔ اسے کوئی ایسا ثبوت نہ مل سکا جس سے یہ ظاہر ہو کہ اس قتل میں سوائے ایک فرد کے کسی اور کا بھی ہاتھ تھا۔ اگر اس میں کسی قسم کی سازش کو دخل ہوتا تو وہ اب تک ظاہر ہو چکی ہوتی۔ ایسی باتیں دیر تک چھپی نہیں رہ سکتیں۔

اس وقت مجھے اس بات کا پورا یقین تھا کہ لیاقت علی خان ملک کے سچے اور سرگرم رہنما ثابت ہوں گے۔ مجھے امید تھی کہ وہ سب سازشوں کو کچل کر رکھ دیں گے۔ لیکن بدقسمتی سے وہ قوم کو سیدھا اور روشن راستہ دکھانے سے پہلے ہی چل بسے۔

یہ دونوں افسوس ناک واقعات یعنی راولپنڈی کی سازش اور وزیراعظم کا قتل میرے کمانڈر انچیف کا عہدہ سنبھالنے کے چند ہی مہینوں کے اندر پیش آئے۔ سازش کا انکشاف ہوتے ہی میں نے فوج کو نئے سرے سے منظم کرنے کی کچھ سکیمیں شروع کر دیں۔ وزیراعظم کی وفات کے بعد ملک میں جو سیاسی انتشار پیدا ہو گیا تھا اس کو دیکھ کر میں اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ ہمیں فوج کی تعمیر میں ذرا بھی غفلت نہیں کرنی چاہیے کیونکہ فوج ہی ملک کو تباہی اور دشمن کے حملے سے محفوظ رکھ سکتی ہے۔

ہندوستان ان واقعات کو دیکھ کر بڑا مطمئن تھا۔ بعد ازاں مجھے شیخ عبداللہ سے معلوم ہوا کہ اس زمانے میں پنڈت نہرو نے ان سے کہا تھا کہ بس دو سال کے اندر اندر پاکستان کے ٹکڑے

ٹکڑے ہو جائیں گے۔ پنڈت نہرو اسی مفروضے کو سامنے رکھ کر کہ عنقریب پاکستان کا وجود سیاسی اعتبار سے باقی نہیں رہے گا، شیخ عبداللہ سے کچھ سمجھوتہ کرنا چاہتے تھے۔

آزادی کے وقت ہمارے حصے میں جو روایات آئی تھیں یا جنہیں ہم نے آزادی کے بعد قائم کیا تھا، ایک ایک کر کے ٹوٹتی جا رہی تھیں۔ عوام میں وہ پہلا سا جوش و خروش باقی نہیں رہا تھا۔ ان کو طرح طرح کے مسائل نے گھیر رکھا تھا جنہیں حل کرنے کی فکر کسی کو بھی نہیں معلوم ہوتی تھی۔ سب سیاسی سوانگ رچائے ہوئے تھے۔ حکومت کا کوئی شعبہ ایسا نہ تھا جس پر لوگوں نے دباؤ ڈال کر سیاسی فائدے نہ اٹھائے ہوں۔ ان باتوں کو دیکھ دیکھ کر میرا عزم اور بھی پختہ ہو گیا کہ فوج کو سیاسیات سے بالکل الگ تھلگ رکھا جائے۔ فوج کے بڑے بڑے افسر ملک کے سیاسی حالات سے بے خبر نہ تھے مگر میں انہیں کبھی سیاسی معاملات پر بات چیت کرنے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔

فوج کے لیے شروع شروع میں میں نے جو کام کیے ان میں سے ایک پلاننگ بورڈ کا قیام بھی تھا۔ جنرل یحییٰ جو اس وقت ڈپٹی چیف آف جنرل اسٹاف تھے اس کے پہلے چیئرمین بنائے گئے۔ ہر خاص خاص مسائل کی جانچ پڑتال کا کام اس بورڈ کے سپرد کیا کرتا۔ اس کام میں ہم سب کو انتہائی محنت کرنی پڑتی اور ابھی ایک کام ختم ہونے نہ پاتا کہ دوسرا ہمارے سامنے آ جاتا۔

ہمارا اصل ہتھیار آدمی تھے۔ یہی بات میں اپنے ساتھیوں کے ذہن نشین کرانا چاہتا تھا۔ اس ہتھیار کو پوری طرح کارآمد بنانے اور تیز رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اس کے تمام مسئلوں کو حل اور مشکلوں کو، خواہ وہ ذاتی ہوں یا پیشہ ورانہ، دور کر دیں۔ سپاہی کی ملازمت کی شرطیں اچھی ہونی چاہئیں۔ اس کے بچوں کی تعلیم، اس کی جسمانی نگہداشت، اس کی خوراک، اس کا لباس اور اس کی رہائش، ان سب باتوں کا خیال رکھنا ہمارا فرض ہے۔ اسے ان فکروں سے جتنا زیادہ چھٹکارا ملے گا، اتنا ہی زیادہ اس کا دل اپنے کام میں لگے گا۔

جیسا کہ میں نے اوپر ذکر کیا، ان مسائل کو حل کرنے میں مجھے کچھ وقت لگا۔ مگر ہم نے کھیتی باڑی کے فارم اور ڈیری فارم کھولنے کا کام فوراً شروع کر دیا۔ مویشیوں کی نسل بڑھانے کے طریقوں کو بھی بہتر بنایا۔ گھوڑوں کی پرورش کے کئی مرکز کھولے گئے۔ اس کا بھی بندوبست کیا گیا کہ فوج کے ہر فرد کو مناسب اور توانائی بخش غذا ملے۔ نئے طبی مرکز اور ہسپتال قائم کیے گئے اور ان کے لیے تربیت یافتہ اور قابل ڈاکٹر اور نرسیں مہیا کی گئیں۔ سابق فوجیوں اور ان کے لواحقوں کی دیکھ بھال کا بندوبست جنگ کے بعد کے تعمیری فنڈ کی آمدنی کے ذریعے کیا گیا جو ملکی تقسیم سے پہلے

قائم کیا گیا تھا۔ ۱۹۵۴ء تک تقریباً چھبیس لاکھ روپیہ فی سال سابق فوجیوں اور ان کے لواحقین کی تعلیم اور دیکھ بھال پر خرچ کیا جا رہا تھا۔

صحیح قسم کے نوجوانوں کو فوجی ملازمت کی ترغیب دلانے کے لیے کئی کیڈٹ کالج اور اکادمیاں قائم کی گئیں۔ ان اداروں کی مدد کے لیے پبلک اسکولوں کا ایک سلسلہ قائم کیا گیا۔ ان تمام اصلاحوں سے بھرتی کے کام پر فوری اور اچھا اثر پڑا، اور ساتھ ہی فوجیوں کے حوصلے بھی بلند ہو گئے۔

میرا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ فوج کو مناسب طریقے پر تربیت دی جائے۔ ہم اپنے جوانوں سے جو کام لیتے تھے اس میں محض ضابطے کی پابندی اور کوری مشقت کو زیادہ دخل تھا، فائدہ بہت کم حاصل ہوتا تھا۔ اکثر اوقات انہیں کچھ معلوم نہ ہونے پاتا تھا کہ اس مشقت کا مقصد کیا ہے۔ وہ تو بس حکم کے بندے تھے، جو کچھ ان سے کہا جاتا بے چون و چرا کرنے لگتے۔ ظاہر ہے کہ ان کی صلاحیتوں سے پورا فائدہ اٹھانے کا یہ کوئی موزوں طریقہ نہ تھا۔

ہماری فوجی تنظیم اور نظم و نسق دوسری عالمی جنگ کے تصورات پر مبنی تھا۔ ان میں جھول بہت تھا اور متروک بھی ہو چکے تھے۔ فوج کو اتنا وطن کے دفاع کے لیے تیار نہیں کیا جاتا تھا کہ مقبوضات کی حفاظت کے لیے۔ یہ بات سمجھ میں بھی آتی ہے۔ کیونکہ پرانی انڈین آرمی کا اولین مقصد یہ تھا کہ وہ برطانیہ کے سمندر پار کے مفادات کی توسیع و حفاظت کے لیے برطانوی افواج کو مدد دے۔

تقسیم کے وقت پیدل فوج کے چھ فوجی قرن، ایک بکتر بند بریگیڈ اور چند توپخانے اور دوسرے مستقل ادارے ہمارے حصے میں آئے تھے۔ کاغذ پر تو یہ گنتی کافی موثر معلوم ہوتی ہے۔ لیکن حقیقت میں جو کچھ ہمیں ملا وہ کٹے پھٹے دستے اور جمعیتیں تھیں، جن کے پاس ضروری ساز و سامان کی خطرناک حد تک کمی تھی۔ ہندوستان نے ہمارے حصے کا اسلحہ، ساز و سامان اور رسد ہمیں دینے سے انکار کر کے ہماری مشکلوں کو اور بھی بڑھا دیا تھا۔

جنگ کے بعد دنیا بھر کی افواج نے نئے ہتھیاروں اور نئی ضرورتوں کو نظر میں رکھ کر اور بڑی چھان بین کے بعد اپنی تنظیموں کی اصلاح کی تھی۔ ہمیں چونکہ آزادی کے بعد دوسرے فوری مسائل سے دوچار ہونا پڑا تھا، اس لیے ہم اس طرف جلد دھیان نہیں دے سکے تھے۔ پرانے تصورات کی پیروی کے علاوہ ہمارے ہاں ٹریننگ، اور نقل و حمل کے وسائل بڑے ناقص تھے۔ فوج کے لازمی شعبہ جات کی خامیوں کو دور کرنے، اسے نئے ساز و سامان سے آراستہ کرنے اور اس کو متوازن بنانے کے لیے زائد خرچ کی ضرورت تھی جس کا بار ملک نہیں اٹھا سکتا تھا۔

میں نے پہلے مختلف رجمنٹوں کی تنظیم و تربیت پر نظرِ ثانی ڈالی تاکہ انہیں زیادہ متوازن اور متحرک بنایا جائے اور ان کے فائر کے زور کو بڑھایا جائے۔ جہاں کہیں بھی ممکن ہوا نفری کم کر دی گئی۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ ہم نے اپنے اسکولوں، تربیتی مرکزوں، رسد گاہوں اور وسائلِ نقل و حمل کے طریقِ عمل میں بھی ترمیم کی۔ اس کام میں پلاننگ بورڈ خاص طور پر بہت مفید ثابت ہوا۔ بورڈ کے ارکان مختلف مسئلوں کی چھان بین کرتے، اپنی سفارشات براہِ راست میرے پاس لے آتے اور دفتری کارروائیوں میں وقت ضائع نہ ہوتا۔

فوج کی نئی تنظیم کے سلسلے میں پہلی لازمی بات یہ تھی کہ جنگی قواعد سیکھنے سے زیادہ فنِ جنگ کو سمجھنے پر زور دیا جائے۔ ضروری بات یہ ہے کہ اصولِ جنگ کو اعلیٰ جنگی چالوں اور حکمتوں کے لیے برتنے کی استعداد پیدا ہو۔

فوجی تنظیم کا جو طریقہ ہمیں ورثے میں ملا تھا، اس میں کوئی نئی بات سوچنے کی گنجائش ہی کہاں تھی۔ وفاداری کا مطلب اندھا دھند فرماں برداری سمجھ لیا گیا تھا۔ نہ کسی بات پر سوچ بچار کی ضرورت تھی نہ نکتہ چینی کی۔ تربیت دینے اور ترقی عطا کرنے کا سارا سلسلہ بس اس مقصد کے لیے تھا کہ ایک ہی طرز کے آدمی پیدا ہوتے چلے جائیں۔ کوئی نئی یا انوکھی بات کسی سطح پر بھی ظاہر ہی نہ ہونے پاتی تھی۔ اس پر طرہ یہ کہ ہم اپنی فوجی تعلیم، نظریوں اور اصولوں کے لیے متعلقہ غیر ملکوں پر تکیہ کر رہے تھے۔ ہمارے تربیتی طریقوں کا حال اسی بات سے ظاہر ہے کہ ہمارے آدمی جو فطری طور پر شکاری ہیں اور شکار کا پیچھا کرنا خوب جانتے ہیں، وہ چھ مہینے فوج میں گزارنے کے بعد اپنی ساری چستی و چالاکی کھو بیٹھتے۔ ان کی ہوشیاری، پھرتیلا پن اور مہارت ختم ہو جاتی۔ وہ کسے جکڑے، سانچے کی طرح ڈھلے اور رٹے رٹائے نظر آتے۔

ظاہر ہے کہ ہم اپنے ہاتھوں ان کی قدرتی صلاحیتوں کو ختم کر رہے تھے۔ چنانچہ اس معاملے میں نئے سرے سے غور و فکر اور یکسر تبدیلیاں کرنے کی ضرورت تھی۔

ہمارے افسروں میں ولولہ تھا اور ذہانت بھی۔ مگر ان میں افہام و تفہیم کے جذبے کی سخت کمی تھی۔ نتیجہ یہ کہ افسر اور عام سپاہی کا رشتہ بس حکم دینے اور حکم ماننے کے اصول پر قائم رہتا تھا۔ مجھے یہ خیال بھی آیا کہ ہم کوئی ایسا طریقہ اختیار کریں کہ قابل افسروں کو دوسرے پیشوں کے ساتھ عارضی طور پر وابستہ کیا جا سکے جن سے ان کے تجربات میں ایک نئی جہت اور نظر میں وسعت پیدا ہو۔ میں جانتا تھا کہ ہم فوج کی تنظیمِ نو کے سلسلے میں جو منصوبے بھی سوچیں، ان کا فوجی کارروائیوں کی متعدد نوعیت، ہمارے جغرافیائی حالات اور لوگوں کی سیرت و مزاج

سے ہم آہنگ ہونا ضروری ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ ان منصوبوں کو اصولی اعتبار سے بھی ٹھوس
ہونا چاہیے۔ علاوہ ازیں تمام نئے نظریے اور نئے ادارے ہماری مالی استطاعت کے مطابق ہوں
اور ہمارا مقصد یہ ہو کہ کم سے کم خرچ میں مطلوبہ توازن، فائر کی طاقت میں اضافہ اور معرکہ آرائی
کی مہارت حاصل کی جائے۔

تنظیم نو کے سلسلے میں اس بات کی گہری چھان بین کی گئی کہ فوجی کارروائیوں اور جنگی حکمت عملی کی
نوعیت کیا ہوگی۔ فوجی تنظیم اور حکمت عملی میں نئے پہلو پیدا کرنے اور نئے عنصر داخل کرنے کے لیے
جامع تحقیقات مرتب کی گئیں۔ ان میں سے ہر ایک نئے عنصر کی میدان میں بڑے غور اور ہو بہو
اصلی حالات پیدا کر کے جانچ کی گئی۔ ہر ایک اصلاح کو عملی طور پر جانچ کر اور عملی آزمائشوں سے گزار
کر آخری شکل دی گئی۔

برطانوی فوج کی پشت پر بڑے بڑے اسلحہ خانے اور گولہ بارود کے مخزن ہوا کرتے تھے
ہمیں اپنے محدود ذرائع ہی سے کام لینے کا گر سیکھنا تھا۔ انفنٹری ڈویژن کو زیادہ متحرک
اور موثر بنا دیا گیا، اگرچہ اس کا بنیادی ڈھانچہ جوں کا توں رہا۔ جس کا سبب روایتی ہتھیاروں پر
ہمارا انحصار تھا۔ ڈویژن کی فائر کی طاقت، اس صورت میں کہ تمام [illegible] معمولی رفتار سے فیر کر رہے
ہوں، بقدر نو ٹن دھات فی منٹ بڑھا دی گئی۔ انتظامی عملے میں بعض بچتیں کی گئیں۔ اور غیر
ضروری ساز و سامان کو کم کر کے اور بوجھ لادنے کے کفایتی طریقے تیار کر کے فوجی نقل و حمل کو
زیادہ آسان بنا دیا گیا۔ ان تبدیلیوں سے انفنٹری کی رفتار تیز ہو گئی اور بار کم ہو گیا۔ اس کے لیے
ہمیں سالہا سال محنت کرنی پڑی۔ لیکن مجھے اپنا اس وقت کا جوش و خروش ابھی تک یاد ہے
جب میں نے گل موازنہ کے زیر کمان نئے تجرباتی بریگیڈ کا مشاہدہ کیا تھا۔ اسی تجربے سے ہمارے
یونٹوں کی آئندہ تنظیم متعین ہوئی۔ بنیادی نظریہ یہ تھا کہ کسی قطعۂ زمین کی حفاظت یا اس پر
حملہ کرتے وقت انسانی جانوں کو نہیں بلکہ فائر کی طاقت کو کام میں لایا جائے۔ گویا وسیع پیمانے
پر بظاہر ایک بے قاعدہ سی جنگ۔

ہمارے تربیتی مرکزوں کا ڈھانچہ بالکل فرسودہ ہو چکا تھا۔ اور دوسری عالمگیر جنگ
کے بعد لڑائی کے جو نئے نئے فنی طریقے اور اصول وضع کیے گئے تھے۔ ان کو کام میں نہیں لایا گیا
تھا۔ سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ ہر جداگانہ تربیتی مرکز کے کمانڈروں کو ایسے امور کی نگرانی سونپی
جاتی تھی جن کا خود انہیں بہت کم علم ہوتا تھا۔ اور چھوٹے چھوٹے مرکزوں کے سلسلے کی موجودگی
کا نتیجہ لازمی طور پر یہ تھا کہ اخراجات بڑھ جائیں۔ میں نے تربیتی کام کو ایک مرکز پر لانے کا

فیصلہ کیا۔ چھوٹے چھوٹے مرکزوں کو مشترک مضامین اور مشترک ضرورتوں کی بنیاد پر زیادہ
بالکفایت مرکزوں میں ضم کر دیا گیا جہاں کسی پیشہ ورانہ کام کے لیے اعلیٰ فنی مہارت اور
زیادہ کوشش درکار ہوئی تو اس کی ٹریننگ کی ذمہ داری اس عملے کے سپرد کی گئی جو اس
کام کے لیے سب سے زیادہ موزوں تھا۔

یہیں سے یہ خیال پیدا ہوا کہ مختلف رجمنٹوں کو یکساں روایات، یکساں طبقے اور یکساں
بھرتی کے علاقے کی بنا پر یکجا کر دیا جائے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بلوچ رجمنٹ، آٹھویں پنجاب رجمنٹ
اور بہاولپور رجمنٹ مل کر نئی بلوچ رجمنٹ بن گئی۔ نئی فرنٹیئر فورس رجمنٹ نے فرنٹیئر
فورس رائفلز، پٹھان رجمنٹ اور پرانی فرنٹیئر فورس رجمنٹ کو اپنے میں ضم کر لیا اور پہلی، چودھویں،
پندرھویں اور سولھویں پنجاب رجمنٹیں نئی پنجاب رجمنٹ بن گئیں۔ ایسٹ بنگال رجمنٹ کو
جس کی پچھلے دنوں نئی تنظیم کی گئی تھی، اپنے موجودہ نام اور موجودہ صورت میں برقرار رکھا گیا۔
میں جانتا تھا کہ اس کارروائی پر بڑا شور مچے گا۔ پرانی رجمنٹیں جو اپنا نام و نشان کھو بیٹھی تھیں قدرتی
طور پر بہت ناخوش ہوں گی۔ آہستہ آہستہ اور بڑے صبر کے ساتھ ہم پرانے افسروں کو نئے خیالات
کی طرف راغب کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ جب ان کے دلوں
سے ابتدائی شکوک دور ہو گئے تو انہوں نے ہمارے ساتھ بڑے اعلیٰ طور پر تعاون کیا اور
نتائج ہماری امیدوں سے کہیں بڑھ کر رہے۔ اس کا سہرا ان افسروں اور جوانوں کے سر ہے
جنہوں نے رسم و رواج، روایات اور لباس جیسے نازک معاملوں پر دلی تعاون اور ہم آہنگی
کے جذبے کا اظہار کیا۔

اس دوران میں ٹریننگ کے پورے نظام میں زبردست تبدیلی ہو رہی تھی۔ نصاب
بہت جامع تھے اور اداروں کو کثرت سے سازوسامان سے لیس کیا جا رہا تھا تاکہ بہتر اور جلد تر نتائج
برآمد ہوں۔ ٹریننگ کے نظریاتی اور عملی پہلوؤں کو الگ الگ تصور کیا جاتا رہا تھا۔ ہم نے
پیشہ ورانہ تربیت اور فوجی تربیت کو ملا کر ایک کر دیا۔ لوگوں میں عام طور پر یہ بٹھا دیا جاتا
تھا کہ عملی تربیت اور معلومات اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتیں جب تک کہ آدمی فی الحقیقت
فوج کے ساتھ رہ کر کام نہ کرے اور فوجی مشینری کا خود ایک پرزہ نہ بن جائے۔ محض نظریاتی مطالعہ
اور علیحدہ رہ کر سبق پڑھنے کا یہ نہیں چل سکتا۔ ہم نے رفتہ رفتہ یہ بات پیدا کر دی کہ نصابی تعلیم
اور فوج کے ساتھ رہ کر عملی کام کرنے پر یکساں زور ہے۔ تمام کمانڈروں کو اوپر سے لے کر
نچلے درجے تک اپنے اپنے ماتحتوں کو ٹریننگ دینے کی ذمہ داری دے دی گئی۔

ہمارے تربیتی نظام میں ایک اور مشکل یہ بھی کہ ہر نوجوان افسر اپنے خاص موضوع کی خصوصی تعلیم تو حاصل کرتا ہی تھا، اس کے ساتھ ہی ہماری یہ کوشش ہوتی تھی کہ اسے ہر درجے کی کمان کی تربیت بھی مل جائے۔ ہر نئی ترقی پر اسے ایک بار پھر اسکول جانا پڑتا تھا۔ اس طرح یونٹ اچھا خاصا عبوری کیمپ یا پڑاؤ بن جاتا تھا۔ افسر کو فوج میں اپنی ڈیوٹی سے محروم رہنا پڑتا تھا، حالانکہ یہ ڈیوٹی اس کی ٹریننگ کا سب سے لازمی جزو تھی۔

تقسیم کے وقت فوج کو نقل و حمل کے وسائل برائے نام ہی حاصل تھے۔ بہرحال ہم نے نقل و حمل کی بابت اپنے اصول و نظریات اور نتیجتاً اپنی سہولتوں کو ان قیاسات کے مطابق ڈھال لیا کہ ملک کو کس قسم کی جنگ کا اور کتنی مدت تک سامنا ہو سکتا ہے۔ ہم نے اپنے دیسی وسائل پر زیادہ سے زیادہ انحصار کرنے کی سوچ لی اور ان امور میں جو دفاع اور تجارت دونوں میں مشترک تھے۔ نئے امکانات کا جائزہ لے کر ان سے پورا پورا فائدہ اٹھایا گیا۔ فوجی ضرورت کے سامان کی معیار بندی پر بھی زور دیا گیا۔ اور حسب ضرورت اشیاء کی ساخت و معیار کی صراحت میں مناسب ترمیم بھی کر لی گئی، تاکہ دیسی ذرائع اور دیسی کاریگری سے پورا فائدہ اٹھایا جا سکے۔ فوج کی موجودہ اور رائندہ ضرورتوں کو نظر میں رکھ کر نقل و حمل کے اداروں اور ڈپوؤں کی تنظیم و قیام میں بھی ترمیم و اصلاح کی گئی۔

فوج کی نئی تنظیم کا یہ سارا کام دفاع کے بعض بنیادی اصولوں کو نظر میں رکھ کر انجام دیا گیا تھا۔ ہمارا اولین مقصد ہندوستان کے کسی امکانی حملے کے خلاف پاکستان کا تحفظ تھا۔ ہم جانتے تھے کہ ہندوستان کے ساتھ جنگ ہر لحاظ سے ایک قومی جنگ ہوگی۔ ہندوستان کا مقصد اپنی حدود اور اثر و اقتدار کو پھیلانا ہے۔ اس سلسلے میں وہ پاکستان کو اپنا پہلا دشمن تصور کرتا ہے۔ ہمارا جنگی مقصد ہندوستان کو فتح کرنا نہیں ہو سکتا، کیونکہ اس سے علیحدگی کے اصول ہی کی نفی ہو جاتی ہے۔ ہمارا مقصد ہندوستان کو صرف یہ محسوس کرانا ہے کہ ہمارے خلاف دشمنی کا رویہ رکھنے سے کچھ فائدہ نہیں پہنچے گا۔

ہندوستان کی فوجی طاقت ہمیشہ ہم سے زیادہ ہی ہوگی۔ ہمارا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ اس کی مزاحمت کے لئے ایک ایسی فوج تیار کر لیں جو حملہ کرنے اور حملہ روکنے کی خاطر خواہ طاقت رکھتی ہو، اور اس قابل ہو کہ ہندوستانی فوج کے حملے کو ناکام بنا سکے۔ ہندوستان ہمارے خلاف بغیر کسی اعلان کے فوج کشی کر سکتا ہے۔ چنانچہ ہمارے پاس ایک ایسی فوج تیار رہنی چاہیے جو فی الفور میدان میں نکل آئے۔ ہمارے حالات مقبوضاتی فوج رکھنے کے لیے کسی

طرح موزوں نہیں۔ ایسی فوج کو بھرتی کرنے اور سدھانے کے لیے بہت وقت چاہیئے۔

ایک طویل اور مشکل جد وجہد کے بعد جن میں کئی سال لگ گئے، آخر ہم ایک پھرتیلی اور کارگر فوج بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ جو ہر خطرے کا مقابلہ کر سکے۔ ہم نے جو نئے جنگی نظریات وضع کئے اور اپنے افسروں اور جوانوں کو نئے سرے سے جو تعلیم و تربیت دی اس کی بدولت آج پاکستانی فوج کو یہ عظمت اور امتیاز حاصل ہے کہ یہ اپنے سے کئی گنا زیادہ تعداد والے غنیم کے دانت کھٹے کر سکتی ہے۔ اس دوران میں کئی سیاسی واقعات پیش آئے، کئی تغیر و تبدل ہوئے۔ مگر ان سب کے باوجود فوج نے اپنی وطن دوستی کی روایات کو برقرار رکھا، اور وہ رفتہ رفتہ ملک و قوم کے استحکام کا ایک مضبوط وسیلہ بن گئی۔ میری دعا ہے کہ وہ ہمیشہ ایسی ہی رہے اور مجھے یقین ہے کہ وہ ایسی ہی رہے گی، امن اور جنگ دونوں حالتوں میں ایک تند و تیز اور بھرپور وار کرنے والا ہتھیار!

اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ میں نے بری فوج کی تعمیر کے دوران میں دوسری سروسوں یعنی پاکستان نیوی اور پاکستان ایئر فورس کو نظر انداز کر دیا۔ ان کی موجودہ پرشوکت تعمیر میں بھی میرا بہت کچھ دخل رہا ہے۔ اور ہوائی فوج کی ترقی تو میرا خاص مقصد ہی تھی۔ کیونکہ دوسرے بری ممالک کی طرح پاکستان کا دفاع بھی دراصل بری و ہوائی فوج کے اشتراک عمل ہی پر مبنی ہے۔

(۵)

سیاسیات

۱۹۴۸ء تا ۱۹۵۸ء

ہم نے آزادی حاصل کرنے کے لیے خون کا ایک دریا پار کیا تھا۔ مذہبی جنون اور نفرت کی آندھی ان گنت لوگوں کو گھر سے بے گھر کر کے سوکھے پتوں کی طرح اڑائے لیے پھری۔ یہ لوگ فرقہ ورانہ قہر و غضب کے ہاتھوں برباد اور پامال ہوئے تھے۔ لاکھوں مرد، عورتیں اور بچے موت کے گھاٹ اتر چکے تھے، اور سارا برصغیر خونیں خانہ جنگی میں مبتلا ہو گیا تھا۔ جس چیز نے ہماری آس بندھائے رکھی، وہ اپنے مستقبل پر ہمارے عوام کا بے پایاں یقین اور اس نصب العین کے لیے بے پناہ خلوص تھا، جس کے تحت ہم نے اپنے لیے ایک وطن حاصل کیا تھا۔

ہندوستان کا رویہ شروع ہی سے دشمنی کا تھا اور اس میں کوئی کمی نہ آئی۔ اس نے سوچ رکھا تھا کہ پاکستان کو وجود میں آتے ہی اپاہج کر کے رکھ دیا جائے۔ اس نے مالیات میں ہمارے حصے سے ہمیں محروم رکھا، اور اس تمام قول و قرار سے پھر گیا جو رسد اور ساز و سامان میں ہمارے حصے کی بابت اس نے بظاہر بڑے صدق دل سے کیا تھا۔

اس کے بعد ہندوستان نے ہمیں کشمیر کی لڑائی میں الجھا دیا۔ جنگ بندی کے اعلان کے بعد ہمیں ایک بڑے کٹھن علاقے میں تقریباً پانچ سو میل لمبے محاذ کی رکھوالی کرنی پڑی۔ ہندوستان برابر جارحانہ انداز اختیار کیے رہا۔ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ ہمیں اپنے محدود ذرائع پر انتہائی دباؤ ڈال کر ایک ایسی فوج کو تیار کرنا اور پوری طرح لیس رکھنا پڑا جو ہندوستان کو اس کے ارادوں سے باز رکھ سکے۔

ادھر سیاسی محاذ پر ہماری کیفیت یہ تھی کہ ہمارا کوئی باقاعدہ آئین ہی نہیں تھا۔ ہم قانون آزادیٔ ہند ۱۹۴۷ء کے تحت کام کر رہے تھے، اور چونکہ پاکستان مسلم لیگ کو مرکزی دستور ساز مجلس میں اکثریت حاصل تھی، اس لیے حکومت کسی نہ کسی طرح چل رہی تھی۔ قائداعظم جن کی جانفشانی اور لگاتار کوشش کے طفیل پاکستان وجود میں آیا، ملک کا کوئی آئین بنانے سے پہلے ہی ۱۹۴۸ء

میں وفات پا چکے تھے جو قانون وہ تیار کرتے، اسے ضرور عوام کی حمایت حاصل ہوتی۔

ان کے جانشین، مسٹر لیاقت علی خان کسی ناقابل فہم وجہ سے آئین سازی کے کام سے ہٹ کر صوبوں کے عام انتخابات کی طرف متوجہ ہو گئے۔ حالانکہ انہیں پہلے مرکز میں اپنی پارٹی کی پوزیشن کو مضبوط کر لینا چاہیے تھا۔ لیکن یہ عوام نے اولین بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی رپورٹ کو جس نظر سے دیکھا تھا اس سے وہ بددل ہو گئے ہوں۔ میرے خیال میں انہیں یہ مشورہ دیا گیا تھا کہ جب تک انہیں صوبوں میں اکثریت حاصل نہ ہوگی وہ مرکز میں اکثریت قائم نہ کر سکیں گے۔

پنجاب کی سیاسی صورت حال نے مسٹر لیاقت علی خان کی پوزیشن کو خاصا کمزور کر دیا تھا۔ انہوں نے نواب ممدوٹ کے مقابلے میں میاں ممتاز دولتانہ کی حمایت کا فیصلہ کیا تھا جو اس وقت وزیر اعلیٰ تھے۔ نواب ممدوٹ کے خلاف بعض بے قاعدگیوں کی بنا پر "پروڈا" کے تحت مقدمہ دائر کیا گیا تھا۔ اخبارات نے اس بات کو بڑا اچھالا اور مسٹر لیاقت علی خان کے خلاف ایک دشمنانہ فضا قائم ہو گئی۔ ان کے مخالفین نے اخبارات کی حمایت کے بل پر ان کی بیگم پر بھی نکتہ چینی شروع کر دی۔ حالانکہ میں جانتا ہوں کہ بیگم صاحبہ بڑی اچھی خاتون ہیں، وہ عورتوں کی فلاح و بہبود کے کام میں مصروف تھیں اور انہیں مردوں کے مساوی حقوق دلانا چاہتی تھیں تاکہ پاکستان کی خواتین معاشرے میں مردوں کے دوش بدوش اپنا جائز مقام حاصل کر سکیں۔ ان پر جو حملے کیے گئے ان کا مقصد محض وزیر اعظم کو پریشان کرنا تھا۔

مسٹر لیاقت علی خان کے بعد ملک کی باگ ڈور جن لوگوں کے ہاتھ میں آئی وہ حکومت کے اہل ثابت نہ ہوئے۔ وہ نہ تو ملکی مسائل کو سمجھتے تھے اور نہ ان کو حل کرنے کی جرأت ہی ان میں تھی۔ ایک کے بعد ایک آتا گیا اور ایک ایسا نظام حکومت رائج کرنے کی کوشش میں جو ناقابل عمل تھا، ملک کے معاملات کو اور زیادہ الجھا دیا گیا اور ملک تیزی سے تنزلی کی طرف جانے لگا۔

دھیرے دھیرے ملک کے کاروبار پر مرکزی حکومت کی گرفت ڈھیلی ہوتی گئی۔ مرکزی حکومت کو دو مشکلوں سے نمٹنا پڑ رہا تھا۔ ایک طرف تو پارلیمنٹ کے ممبر اس پر مسلسل دباؤ ڈال رہے تھے، دوسری طرف صوبائی حکومتوں کی قوت روز بروز بڑھتی جا رہی تھی اور انہوں نے مرکز کے ہاتھ باندھ رکھے تھے۔ ہر صوبہ اپنا اپنا راگ الاپ رہا تھا۔ مرکزی حکومت بے بس تھی اور کوئی سے دو صوبوں کا گٹھ جوڑ مرکزی اقتدار کو بہ آسانی نیچا دکھا سکتا تھا۔

لیاقت علی خان کی وفات سے لے کر ۱۹۵۸ء تک کا زمانہ بڑا اندوہناک تھا۔ مرکزی

حکومت اور صوبوں میں سر پھٹول تو ہو ہی رہی تھی، خود مرکزی حکومت کے اندر بھی جوڑ توڑ اور چپقلشوں کا سلسلہ جاری تھا۔ ایک سول ملازم نے جو آزادی کے وقت وزیر مالیات بن گیا تھا، خود کو گورنر جنرل کے عہدے تک پہنچا دیا۔ دوسرا راتوں رات سیکرٹری یعنی ایک سول ملازم سے وزیر مالیات بن گیا۔ بس نام کی تختیوں پر عہدے بدل کر لکھ دیے گئے۔ یہ تختی [illegible] پہنے رکھے تھے۔ سیاست دان قدرتی طور پر مستقل ملازموں کی مدد کے محتاج تھے۔ [illegible] میں جو افراد زیادہ زور آور تھے، خود ان کے دل میں سیاسی اقتدار کی ہوس موجیں مارنے لگی تھی۔ ہر شخص کا اپنا ایک خاص جتھا نظر آتا تھا۔ ان سب کا واحد مقصد اپنا الو سیدھا کرنا تھا، خواہ اس کارروائی میں ملک ٹکڑے ٹکڑے کیوں نہ ہو جائے۔

یہ بحران ۱۹۵۳ء میں آیا جب گورنر جنرل غلام محمد نے اقتصادی بدحالی، قحط کی سی صورت اور پنجاب کے فسادات کو بہانہ بنا کر خواجہ ناظم الدین کی وزارت کو برطرف کر دیا۔ خواجہ صاحب نے اپنی بحالی کے لیے بہتیرے ہاتھ پاؤں مارے، ان کا دعویٰ تھا کہ دستور ساز مجلس میں مجھے اکثریت حاصل ہے۔ اور بقول بعض ملکۂ انگلستان سے بھی مدد کی التجا کی، مگر کچھ پیش نہ چلی۔ ادھر خواجہ صاحب کی کابینہ کے متعدد ساتھیوں نے، حرص و ہوس میں آ کر نہ سہی، مگر بغیر چوں و چرا نئی کابینہ میں عہدے قبول کر لیے۔

محمد علی بوگرا نے غلام محمد کے منظور نظر کی حیثیت سے کام شروع کیا۔ جب ان کے قدم ذرا جمے تو انہوں نے خود کو گورنر جنرل کے بندھنوں سے آزاد کرنا چاہا۔ ادھر فضل الرحمٰن، ہاشم گزدر اور عبدالستار پیرزادہ کے سے لوگ ان کے کان بھرتے رہتے کہ یاد رکھو اگر تم نے احتیاط نہ کی تو تمہارا بھی وہی حشر ہو گا جو تمہارے پیش رو کا ہو چکا ہے۔ ان کے خیال میں اس کا بس ایک ہی علاج تھا، وہ یہ کہ انڈین انڈیپنڈنس ایکٹ ۱۹۴۷ء میں ترمیم کر کے گورنر جنرل کے اختیارات محدود کر دیے جائیں۔

مجھے یہ واقعہ اچھی طرح یاد ہے کیونکہ میں اتفاق سے اس زمانے میں کراچی ہی میں تھا اور وزیر اعظم سے ملاقات کرنے گیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ ان کی کوٹھی پر بہت سے لوگ آ جا رہے ہیں۔ چنانچہ مجھے وزیر اعظم سے بات کرنی مشکل ہو گئی۔ یہ نہ سمجھئے کہ اس سے پہلے ان سے کسی مسئلے پر گفتگو کرنا آسان ہوتا تھا۔ ان کی عادت تھی کہ کسی نہایت اہم معاملے پر گفت و شنید کے دوران وہ اچانک اپنے مخاطب کا قلم یا کوئی اور چیز اٹھا لیتے اور پوچھتے "یہ تم نے کہاں سے لیا ہے؟" اس معاملے میں ان کی عادت بالکل ایک بچے کی سی تھی۔ لیکن اس دن ان کی کوٹھی پر لوگوں کی

بھاگ دوڑ دیکھ کر بیں ان سے پوچھے بغیر نہ رہ سکا کہ یہ معاملہ کیا ہے۔ میں اب ان لوگوں کو بخوبی جان گیا تھا۔ میں نے سوچا کہ یہ بھاگ دوڑ وہ کسی نیک مقصد سے تو کرنے سے رہے۔ ضرور کچھ دال میں کالا ہے۔ وزیر اعظم نے مجھے چپکے سے بتایا کہ ان کے ساتھی گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ میں کچھ ترمیم کرنا چاہتے ہیں جس سے گورنر جنرل کے اختیارات محدود ہو جائیں۔

آدھی رات کو ایک قرارداد چھاپی گئی اور قومی اسمبلی کے ممبروں کے خانوں میں رکھ دی گئی۔ صبح کو مقررہ وقت سے ایک گھنٹہ پہلے ہی اسمبلی کا اجلاس دستور ساز مجلس کی حیثیت سے شروع ہو گیا۔ جس میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کی دفعات ۹، ۱۰، ۱۰ الف، ۱۰ ب اور ۱۷ منسوخ کر دی گئیں۔ یہ وہی دفعات تھیں جن کے تحت گورنر جنرل نے اپنے اختیارات کو کام میں لا کر ناظم الدین کی کابینہ کو برطرف کر دیا تھا۔ یہ قرارداد دس منٹ کے اندر اندر پیش بھی ہو گئی اور منظور بھی کر لی گئی۔ گورنر جنرل اس زمانے میں علالت کے بعد "بدستور" [illegible] رہے تھے۔

میں نے ایک مرتبہ مولوی تمیز الدین خان مرحوم سے جو اس وقت قومی اسمبلی کے اسپیکر تھے اس واقعہ کا ذکر کیا اور کہا:

"آپ سیاسی اخلاق کی بڑی باتیں کرتے ہیں لیکن آپ کے پاس اس کا کیا جواب ہے کہ آپ نے [illegible] ذہن میں تبدیلی کرنی چاہتا [illegible] ملک سے باہر نہیں گئے تھے ملک سے [illegible] تھے اور [illegible] اسمبلی کی [illegible] کی حمایت ہی سے عمل میں آیا ہو گا۔ اگر آپ ان کو نہیں چاہتے تھے تو انہیں الگ کر دینا چاہئے تھا مگر اس کے لیے اخلاقی جرأت کی ضرورت تھی جو آپ میں نہیں تھی۔ اس کے بجائے آپ نے حیلہ سازی سے کام لیا اس تبدیلی کا مطلب صرف یہی نہیں کہ ایک فرد کے اختیارات کو محدود کر دیا گیا بلکہ اقتدار کے مرکز ہی کو مٹا دیا گیا۔"

مولوی تمیز الدین نے جواب دیا: "ایسی باتیں ہمیشہ سے ہوتی آئی ہیں۔"

میں نے کہا: "قتل بھی تو ہمیشہ سے ہوتے آئے ہیں لیکن اس دلیل سے ان کو قابل معافی قرار نہیں دیا جا سکتا۔"

غلام محمد اس قسم کے آدمی نہیں تھے کہ ایسے معاملوں کو ٹھنڈے پیٹوں گوارا کر لیتے۔ ان میں خواہ اور باتوں کی کمی ہو مگر جرأت کی کمی ہرگز نہ تھی۔ وہ ہر ایک سے خواہ کوئی بھی ہو لڑ سکتے تھے دلیرانہ مقابلہ کر سکتے تھے کسی قسم کا ڈر یا خوف ان کو چھو تک نہیں گیا تھا۔ اس زمانے میں وہ بہت بیمار

رہنے لگے تھے اور ان کی گفتگو بالکل ناقابل فہم ہوتی تھی۔ انہوں نے اپنے دل میں کہا ہو گا "اچھا تو تم نے مجھ سے یہ سلوک کیا! میں نے بھی اس کا بدلہ نہ لیا تو سہی۔"

اس کے بعد جلد ہی میں وزیر اعظم محمد علی بوگرا، سر ظفر اللہ خان اور چودھری محمد علی کے ساتھ امریکہ چلا گیا۔ وزیر اعظم کو گورنر جنرل کا پیغام ملا کہ فوراً واپس آؤ۔ میرا ماتھا وہیں ٹھنکا کہ خیریت نہیں ہے۔ بڑے میاں جنگ پر کمربستہ ہیں، اور وہ وزیر اعظم کو برطرف کرنے والے ہیں۔ وزیر اعظم بھی پریشان تھے۔ انہوں نے کینیڈا کا دورہ منسوخ کر دیا۔ ہم نے جلد سے جلد واپس جانے کی ٹھان لی۔ جب ہم لندن پہنچے تو معلوم ہوا کہ اس روز کوئی جہاز مشرق کی طرف نہیں جائے گا۔ ناچار ہمیں کراچی کے لیے ایک ہوائی جہاز چارٹر کرنا پڑا۔

لندن ایئرپورٹ پر گورنر جنرل نے مجھے ٹیلی فون پر بلوایا لیکن ان کی بات میری سمجھ میں مطلق نہیں آئی۔ میں نے ٹیلی فون سکندر مرزا کو دے دیا۔ ہمیں بس اسی قدر معلوم ہو سکا کہ گورنر جنرل مجھے فوراً پاکستان بلانا چاہتے ہیں۔ انہیں دوسروں سے غرض نہ تھی کہ واپسی پر ان کا حشر کیا ہو گا۔ میں نے بڑی مشکل سے انہیں سمجھا بجھا کر اپنے ساتھ وطن واپس چلنے پر تیار کر لیا۔ وہ بار بار مجھ سے یہی سوال کرتے "کیا تم اس بات کی ضمانت دے سکتے ہو کہ واپس پہنچنے پر مجھے گرفتار نہیں کیا جائے گا؟" میں بھلا کیا ضمانت دے سکتا تھا، لیکن میں نے انہیں تسلی دی کہ گھبراؤ نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ وہ بولے "فرض کرو تمہیں بھی گرفتار کر لیا گیا تو؟"

میں نے کہا "فکر کی بات نہیں!

"خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو۔"

راستے میں میں نے سکندر مرزا اور چودھری محمد علی سے کہا کہ کراچی پہنچتے ہی وزیر اعظم کو گورنر جنرل کے پاس لے جانا سخت خلاف مصلحت ہو گا۔ ایسا کرنا بدمزگی کا موجب ہو سکتا ہے۔ آخر یہ طے پایا کہ ہم میں سے کچھ لوگ گورنر جنرل کی کوٹھی پر جانا چاہیے اور انہیں سمجھانا بجھانا چاہیے کہ وہ دور اندیشی سے کام لیں اور وزیر اعظم کے ساتھ کسی نہ کسی طرح کا سمجھوتہ کر لیں۔ وزیر اعظم اپنے بنگلے پر جائیں اور ہمارے اشارے کے منتظر رہیں۔

محمد علی بوگرا نے ظاہر میں تو بڑی جرأت کا اظہار کیا مگر میرا خیال ہے کہ وہ دل میں بڑے خائف تھے۔ انہوں نے لندن سے پیغام بھیجا تھا کہ کراچی پہنچنے پر ان کے لیے فوجی حفاظت کا انتظام کیا جائے۔

ادھر میں خود سخت مضطرب تھا۔ میں گورنر جنرل کے مزاج سے خوب واقف تھا۔ مجھے

الجھن ہو رہی تھی کہ خدا معلوم وہ غصے میں کیا کر بیٹھیں۔ یہ ملک کی عزت کا معاملہ تھا۔ اگر کوئی سخت اقدام کیا جاتا تو اس سے ملک کی سخت بدنامی ہوتی۔ عقل مندی کی بات یہ تھی کہ گورنر جنرل اور وزیراعظم میں کسی نہ کسی طرح صلح صفائی کرا دی جائے۔

سکندر مرزا اور چودھری محمد علی اور میں، ہم تینوں تو گورنر جنرل کی کوٹھی پر پہنچے اور وزیراعظم چند آدمیوں کے ہمراہ اپنے بنگلے کو روانہ ہوئے۔

گورنر جنرل اوپر کی منزل پر اپنی خواب گاہ میں لیٹے ہوئے تھے۔ ان کے خون کا دباؤ بہت بڑھ گیا تھا اور پیٹھ میں بڑی سخت تکلیف تھی۔ جس کی وجہ سے وہ سیدھے ایک تختے پر چاروں شانے چت لیٹنے پر مجبور تھے۔ وہ غصے سے آگ بگولا ہو رہے تھے، اور گالیوں کی بوچھاڑ تھی کہ تھمنے کا نام نہ لیتی تھی۔ لیکن خوش قسمتی سے یہ گالیاں کسی کی سمجھ میں نہ آتی تھیں۔ چودھری محمد علی نے جرأت کر کے کچھ کہا۔ اس کے جواب میں ان پر بوچھاڑ پڑی۔ اس کے بعد سکندر مرزا کچھ بولے، ان پر بھی بوچھاڑ پڑی۔ ہم ان کی خدمت میں یہ گزارش کرنا چاہتے تھے کہ آپ محمد علی کو ایک اور موقع دیں۔ اس کے جواب میں انہوں نے غصے میں غرا کر کہا "جاؤ۔ جاؤ دور ہو جاؤ" ان کی زبان سے بار بار "نہیں نہیں" کے الفاظ نکلتے۔ وہ بس ہم کو بھگا دینا چاہتے تھے۔

ہم ایک کے پیچھے ایک ان کی خواب گاہ سے نکلے آگے آگے سکندر مرزا، ان کے پیچھے چودھری محمد علی، اور سب سے پیچھے میں۔ میں کمرے سے باہر قدم رکھنے ہی کو تھا کہ اس نرس نے جو ان کی خدمت پر مامور تھی، میرا کوٹ پکڑ کر کھینچا۔ میں پلٹا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ میں بالکل مختلف آدمی سے دوچار ہوں۔ یہی ہمارے بیمار اور بوڑھے گورنر جنرل جو لمحہ بھر پہلے غصے سے دیوانے ہو رہے تھے، اب ان کا چہرہ مسرت سے کھل اٹھا تھا اور وہ قہقہے لگا رہے تھے۔ میں نے دل میں کہا "آپ بھی بڑے حضرت ہیں"۔ انہوں نے ایک خاص مسرت کی چمک آنکھوں میں لیے مجھے اشارہ کیا "میری پر بیٹھ جاؤ"

اس کے بعد انہوں نے تکیے کے نیچے سے دو دستاویزیں نکالیں۔ ان میں سے ایک پر کچھ اس قسم کی عبارت تھی کہ "میں غلام محمد فلاں فلاں وجوہ کی بنا پر فلاں فلاں اختیارات جنرل ایوب خان کو سونپتا ہوں، اور انہیں حکم دیتا ہوں کہ وہ تین مہینے کے اندر اندر آئین تیار کریں" میں نے اس کاغذ پر نظر ڈالی اور دل میں کہا "خدا آپ سے سمجھے۔ پچھلے آٹھ برس تو آپ کو ہوش نہ آیا اور اب آپ چاہتے ہیں کہ میں تین مہینے میں دستور بنا کر پیش کر دوں"

دوسری دستاویز اس مضمون کی تھی کہ میں نے اس پیش کش کو قبول کر لیا ہے۔ لمحہ بھر کے

لیے میں ان تاریخی دستاویزوں کو اپنے ہاتھ میں تھامے رہا۔

جیسے ہی میں نے ان کاغذوں پر نظر ڈالی میرا تن بدن پکار اٹھا کہ "نہیں، ہرگز نہیں"
[illegible] آپ جلد بازی سے کام لے رہے ہیں۔ اس سے ملک کو سخت نقصان پہنچے گا۔
میں [illegible] کی تیاری میں مصروف ہوں۔ ہمارا ایک دشمن ہے ہندوستان جس کو رام کرنا بڑا دشوار
ہے۔ ہم ہزار چاہیں کہ وہ ہمیں دشمن نہ سمجھے مگر وہ دشمن سمجھنے پر تلا ہوا ہے۔ میں اپنے پیشے میں
رہ کر ملک کی بہتر خدمت کر سکتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ میں کچھ مفید کام سرانجام دے سکتا ہوں۔
آپ اپنی موجودہ ذہنی کیفیت میں کوئی ایسی بات کر گزرنا چاہتے ہیں جس کا نتیجہ آگے چل کر
سوائے ملک کے نقصان کے اور کچھ نہیں ہوگا۔"

اس کے جواب میں انہوں نے مجھ پر گالیوں کی ایک اور بوچھاڑ کر دی۔ لیکن انہیں احساس
ہو گیا کہ میں اس جلد بازی کے کام میں ان کا ساتھ نہیں دوں گا۔

ادھر مجھ پر تو یہ گزر رہی تھی اور ادھر محمد علی بوگرا اپنے مشیروں سے صلاح مشورہ کر رہے
تھے۔ ان کے مشیر ان سے کہہ رہے تھے کہ گورنر جنرل تمہارا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا۔ ہمیں محمد علی بوگرا
کو گورنر جنرل کی ملاقات پر رضامند کرنے میں خاصی دقت پیش آئی۔ آخر کار گورنر جنرل اور
وزیراعظم میں کچھ سمجھوتہ ہو گیا۔ ان دونوں میں ایک قسم کی صلح کرا دی گئی اور اس طرح ایک
سخت مصیبت وقتی طور پر ٹل گئی۔

میں نے جب غلام محمد کی پیش کش کو نامنظور کیا تھا تو خدا کی مدد میرے شامل حال تھی۔
اگر میں اس ترغیب میں آگیا ہوتا تو ممکن ہے آج پاکستان کی تاریخ کچھ اور ہوتی۔ ایک بات
تو یقینی ہے کہ ہماری فوج صحیح معنوں میں فوج کہلانے کی مستحق نہ ہوتی، اور ہم اس نازک دور
میں ملک کے استحکام کے اس واحد ذریعے سے محروم ہو جاتے۔

ملک کا ابھی تک کوئی آئین نہیں بن سکا تھا۔ اولین بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی رپورٹ
جسے لیاقت علی خان نے تیار کیا تھا نامقبول ثابت ہو چکی تھی۔ ناظم الدین کو دوسری رپورٹ
تیار کرانے میں اور سوا برس لگ گئے۔ اس رپورٹ کا بھی وہی حشر ہوا جو پہلی کا ہو چکا تھا۔ محمد علی
بوگرا دو سال سے زیادہ عرصے تک اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش کرتے رہے۔ پھر بھی آئین
کے بنیادی اصولوں کے بارے میں کوئی سمجھوتہ نہ ہو سکا۔ حالانکہ آزادی حاصل ہوئے سات
برس ہو چکے تھے۔

ادھر دستور ساز اسمبلی کو جو اپنا وقار کھو چکی تھی توڑ دینے کا مطالبہ زور پکڑتا جا رہا تھا۔

قریب قریب اسی زمانے میں سہروردی نے جن کی سربراہی میں متحدہ محاذ کو مشرقی پاکستان میں زبردست کامیابی حاصل ہوئی تھی، ایک بیان زیورچ سے جاری کیا جس میں گورنر جنرل کو مشورہ دیا گیا کہ وہ دستور ساز اسمبلی کو توڑ دیں، کیونکہ وہ مطلقاً غیر نمائندہ بن گئی ہے۔ یعنی کم از کم جہاں تک مشرقی پاکستان کے ممبروں کا تعلق ہے۔ انہوں نے یہ مشورہ بھی دیا کہ موجودہ صوبائی قانون ساز مجالس میں سے تازہ انتخابات کرائے جائیں۔

آخر ۲۴ اکتوبر ۱۹۵۴ء کو دستور ساز مجلس کو توڑ دیا گیا اور گورنر جنرل نے مجھ سے کہا کہ تم بھی محمد علی کی نئی وزارتی کابینہ میں شامل ہو جاؤ۔ مجھے یہ بات بادلِ ناخواستہ منظور کر لینی پڑی لیکن میں نے گورنر جنرل پر واضح کر دیا کہ مجھے سب سے زیادہ دلچسپی فوج کے کام سے ہے۔ ایک بات جس نے مجھے اس پیش کش کو قبول کر لینے پر آمادہ کیا، یہ تھی کہ میں سیاست دانوں اور مسلح افواج کے درمیان ایک ٹکر روک کی حیثیت سے کام کرنا چاہتا تھا۔ اس وقت حکومت میں سخت ابتری پھیلی ہوئی تھی۔ اس کا کوئی لیڈر نہیں تھا اور سارے سیاستدانوں کی نظریں بار بار فوج کی طرف اٹھتی تھیں۔ وہ چاہتے تھے کہ فوج میں اپنے حمایتیوں کے گروہ پیدا کر لیں۔ یہی وہ زمانہ تھا جب میں نے کابینہ کے سامنے اپنا پروگرام پیش کیا۔ یہ ایک دستاویز تھی جس کا مضمون میں نے پہلے سے تیار کر لیا تھا۔ اس کا ذکر میں تفصیل کے ساتھ آگے چل کر کروں گا۔

نئی دستور ساز اسمبلی جون ۱۹۵۵ء میں بنائی گئی۔ سہروردی، محمد علی بوگرا کے ماتحت دسمبر ۱۹۵۵ء میں کابینہ میں شامل ہو چکے تھے۔ وہ وحدت مغربی پاکستان کے بڑے سرگرم حامی تھے۔ درحقیقت انہوں نے "ون یونٹ" کا مسودۂ قانون تیار کیا تھا، اور انہیں نے اسے اسمبلی میں پیش کرنا تھا۔ اس بل کا مقصد یہ تھا کہ شمال مغربی سرحدی صوبے، پنجاب، سندھ، بلوچستان اور ریاستوں اور سرحدی علاقوں کو ملا کر مغربی پاکستان کا ایک متحدہ صوبہ بنا دیا جائے۔ یہ مختلف صوبے جو زبان یا نسل کی بنیاد پر قائم تھے، خود غرض سیاستدانوں کی سیاسی چالبازیوں کے لیے بڑا اچھا اکھاڑا بنے ہوئے تھے۔ یہ لوگ صرف اپنے ذاتی فائدے کو دیکھتے۔ انہیں اس سے غرض نہ تھی کہ ان کی کارروائی سے ان علاقوں کے لوگوں کو کس قدر اقتصادی اور سیاسی نقصان پہنچ رہا ہے۔ ون یونٹ بل کا مقصد ان سب باتوں کو ختم کرنا اور سارے مغربی پاکستان کو یکساں طور پر پھلنے پھولنے کا موقع دینا تھا۔ لیکن جب اگست ۱۹۵۵ء میں چودھری محمد علی متحدہ محاذ کی حمایت سے وزیر اعظم مقرر ہو گئے تو ون یونٹ کی تجویز کی طرف

سہروردی صاحب کا رویہ کچھ ٹھنڈا سا پڑ گیا۔ اور انہوں نے یہ مشورہ دیا کہ اس مسودۂ قانون کو عوام کی رائے معلوم کرنے کے لیے تقسیم کرایا جائے۔ سہروردی سیاسی چال بازی میں پیچھے تھے۔ گورنر جنرل جو انہیں کابینہ میں لائے تھے، بیمار ہو کر رخصت پر چلے گئے تھے اور ان کی جگہ سکندر مرزا قائم مقام گورنر جنرل بن گئے تھے۔ انہوں نے سہروردی کا زور توڑنے کے لیے فضل الحق کے ساتھ رشتہ استوار کرنا چاہا۔ وہ یہ بھول گئے کہ پچھلے سال انہوں نے فضل الحق کو غدار قرار دیا تھا۔ غرض صورت حال عجیب سے عجیب تر ہوتی چلی جا رہی تھی۔

چودھری محمد علی نے جیسے تیسے آئین تیار کر لیا۔ جو ۲۳۔ مارچ ۵۶ ۱۹ء کو نافذ کیا گیا۔ یہ بڑی مایوس کن دستاویز تھی۔ وزیر اعظم نے جو اس امر کے سخت متمنی تھے کہ انہیں تاریخ میں آئین کے مصنف کی حیثیت سے یاد کیا جائے، اپنی کوشش کو کامیاب بنانے کے لیے ہر قسم کے نظریوں کو آئین میں سمو لیا تھا۔ آئین کیا تھا چوں چوں کا مربہ تھا۔ اس میں ایسے متعارض نظریے شامل تھے جو ایک دوسرے کی کاٹ کرتے تھے اور جن سے ملک میں پہلے ہی بڑی ابتری اور گڑبڑ پھیل چکی تھی۔ اس آئین نے اقتدار کو صدر، وزیر اعظم اور اس کی کابینہ، اور صوبوں میں تقسیم کر کے اس کی مرکزیت ہی کو نیست و نابود کر دیا تھا اور کسی کو صاحب اختیار نہیں رہنے دیا تھا۔

قدرت کی ستم ظریفی دیکھیے کہ جس شخص نے آئین بنایا، وہی اس کا پہلا شکار بنا۔ اس زمانے میں ایک دفعہ میں نے انہیں بڑی بے بسی کی حالت میں ان کے دفتر میں دیکھا۔ چونکہ وہ وزارت دفاع کا قلمدان بھی خود ہی سنبھالے ہوئے تھے اس لیے مجھے ایک دفاعی مسئلے کے سلسلے میں ان سے ملنے کے لیے جانا پڑا۔ انہوں نے مجھ سے کہا "میری جماعت نے مجھے چھوڑ دیا ہے۔ بس اب معاملہ ختم ہے۔" میں نے ان کی ہمت بندھانے کے لیے چند الفاظ کہے مگر ان کی تشفی نہ ہوئی۔ "نہیں نہیں۔ یہ معاملہ بہت سنجیدہ صورت اختیار کر گیا ہے۔ تم یہ کام کیوں نہیں سنبھال لیتے اور مجھے اس سے چھٹکارا کیوں نہیں دلا دیتے؟" میں نے کہا "دیکھیے ان باتوں کا ذکر مجھ سے نہیں اپنے صدر سے کیجیے اور اس الجھن سے نکلنے کا کوئی مناسب طریقہ سوچیے۔"

سکندر مرزا جو ۱۹۵۶ء کے آئین کے تحت اتفاق رائے سے جمہوریۂ پاکستان کے پہلے صدر منتخب ہو گئے تھے، اس وقت تک ملکی معاملات کو مضبوطی کے ساتھ اپنی گرفت میں لے چکے تھے۔ وہ بڑے زیرک تھے اور جانتے تھے کہ اس آئین کے ذریعے کس طرح جوڑ توڑ اور سیاسی سودے بازی کی جا سکتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اب کسی کو خبر ہی نہیں رہی کہ کس کا تعلق

کس جماعت سے ہے۔ یہ بس ایک لیبل اتار کر دوسرا چسپاں کر لینے کا معاملہ تھا۔ جو شخص آج مسلم لیگی تھا وہ کل ری پبلیکن بن جاتا۔ جو ماضی میں "غدار" کہلاتے تھے۔ وہ آئندہ وزیر اعلیٰ بننے والے تھے، ہر شخص ایک کو دوسرے سے پہچاننا مشکل تھا۔

ستمبر ۱۹۵۶ء میں چودھری محمد علی نے سہروردی کے لئے کرسی خالی کی، جنہوں نے اس وقت تک صدر سکندر مرزا کو رام کر لیا تھا۔ اب سہروردی پھر سیاسی منظر پر ون یونٹ کے زبردست حامی کی حیثیت سے نمودار ہوئے۔ انہوں نے بڑی دیدہ دلیری کے ساتھ مشرقی پاکستان کو یقین دلا کر ان کے وزیر اعظم کا عہدہ سنبھالنے کے ساتھ ہی ۹۸ فیصد صوبائی خودمختاری ملنی ہی تھی۔ بہرحال صوبائی خود مختاری کا نعرہ جس کی بدولت وہ برسر اقتدار آئے تھے، سوائے سیاسی بازی گری کے اور کچھ نہ تھا۔ ایک سال اور کچھ ہی دن بعد اکتوبر ۱۹۵۷ء میں سہروردی کی جگہ چندریگر نے لی۔ انہوں نے جیسے تیسے مصیبت کے انسٹھ دن پورے کیے اور پھر ملک فیروز خان نون کے لئے کرسی خالی کر دی۔

مغربی پاکستان میں صدر سکندر مرزا، وزیر اعظم چودھری محمد علی اور گورنر گورمانی کی متحدہ کوششوں سے ڈاکٹر خان صاحب وزیر اعلیٰ مقرر ہو گئے تھے۔ یہ واقعہ درحقیقت ون یونٹ کی اسکیم پر عمل درآمد ہونے سے کچھ ہی دن پہلے رونما ہوا۔ جنوری ۱۹۵۶ء میں مغربی پاکستان اسمبلی کے انتخابات ہوئے جن میں مسلم لیگ کو مجلس قانون ساز میں واضح اکثریت حاصل ہوئی۔ مسلم لیگ وزیر اعلیٰ کو ان کے عہدے سے ہٹا دینا چاہتی تھی۔ مگر صوبے کے گورنر نے یہ بات منظور نہ کی۔ اس پر کابینہ کے مسلم لیگی وزیروں نے استعفے دے دیئے۔ ان کی جگہیں راتوں رات مسلم لیگ ہی میں سے ان کے حریفوں سے پُر کر دی گئیں۔

ڈاکٹر خان صاحب نے ایک قدم اور آگے بڑھایا، اور اپریل ۱۹۵۶ء میں ری پبلیکن پارٹی کے نام سے ایک نئی جماعت قائم کی۔ اس میں وہ لوگ شامل تھے جو مسلم لیگ سے نکل گئے تھے اس وقت ان پارٹیوں کی حالت بڑی ناگفتہ بہ تھی۔ ان میں نہ تو کسی قسم کا نظم و ضبط تھا اور نہ کوئی استواری۔ لوگ کھلے بندوں دھمکیاں دیتے، اور دباؤ ڈالتے۔ ممبر جب چاہتے ایک پارٹی کو چھوڑ کر دوسری میں شامل ہو جاتے۔ یہاں تک کہ دونوں جماعتوں پر اسمبلی کے ممبروں کو اغوا کرنے اور ان سے تشدد کا برتاؤ کرنے کے الزام بھی لگائے جاتے۔

مغربی پاکستان کی سیاسیات کے اہم مسائل میں ری پبلیکن پارٹی کا مسلک جداگانہ انتخابات کے حق میں تھا اور ون یونٹ کی اسکیم کی حمایت میں بھی۔ تاہم ڈاکٹر خان صاحب سکندر

مرزا، ورسہروردی کے دباؤ سے، جو مرکز اور مشرقی پاکستان میں اس وقت کے سیاسی توازن کو برقرار رکھنا چاہتے تھے، انتخابات کے بارے میں اپنے وعدے سے پھر گئے۔ ادھر مسلم لیگ ری پبلکن گورنمنٹ کو نکال باہر کرنے کی کوشش میں نیشنل عوامی پارٹی سے مل گئی۔ اس نے بہانہ یہ بنایا کہ وہ ون یونٹ کو توڑنا چاہتی ہے۔

ری پبلکن پارٹی کے کئی ممبر اپنی پارٹی کو چھوڑ کر مسلم لیگ سے جا ملے، اور مسلم لیگ ایک مرتبہ پھر اکثریت والی پارٹی بن گئی۔ اس پر سکندر مرزا نے مغربی پاکستان میں دفعہ ۱۹۳ نافذ کر دی، جس کا مطلب یہ تھا کہ وزارت کو برطرف کر دیا جائے اور حکومت کی باگ ڈور گورنر کو سونپ دی جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب دو مہینے کے بعد گورنر کی حکومت ختم ہوئی تو وہی ری پبلکن پارٹی جو اسمبلی کے اجلاس میں شکست کھا چکی تھی پھر برسر اقتدار آ گئی۔ لیکن ڈاکٹر خان صاحب مستعفی ہو گئے اور ان کی جگہ سردار عبدالرشید کو سربراہ مقرر کیا گیا۔ اب ری پبلکن پارٹی نے بھی نیشنل عوامی پارٹی کی حمایت حاصل کرنے کے لیے، ون یونٹ توڑنے کا وعدہ کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مرکز میں عوامی لیگ اور ری پبلکن کا گٹھ جوڑ ٹوٹ گیا اور مغربی پاکستان سردار عبدالرشید کو وزیر اعلیٰ اور ری پبلکن پارٹی کے سربراہ دونوں عہدوں سے الگ ہو جانا پڑا۔ کیونکہ نیشنل عوامی پارٹی نے پھر اپنی حمایت واپس لے لی تھی اور وہ اصلاحات کے ایک مبہم پروگرام کی بنیاد پر مخالف مسلم لیگ پارٹی کی حامی بن گئی تھی۔ رشید کی جگہ مظفر علی قزلباش نے لے لی۔ یہ مغربی پاکستان میں ری پبلکن پارٹی کے تیسرے وزیر اعلیٰ تھے۔

مشرقی پاکستان میں ۳۱ مارچ ۱۹۵۸ء کو ایک بہت نازک صورت حال پیدا ہو گئی کیونکہ فضل الحق نے عطاء الرحمٰن خان کی کابینہ کو برطرف کر دیا۔ اس کے کچھ دیر بعد اسی رات کو سکندر مرزا نے خود فضل الحق کو برطرف کر دیا۔ عطاء الرحمٰن کی جگہ ابو حسین سرکار نے لے لی لیکن ابھی انہیں اپنا عہدہ سنبھالے بارہ گھنٹے بھی نہ گزرنے پائے تھے کہ انہیں برطرف کر دیا گیا۔ اور عطاء الرحمٰن کی کابینہ پھر برسر اقتدار آ گئی۔ نیشنل عوامی پارٹی نے جس طرح مغربی پاکستان میں پہلے ایک وزارت کی حمایت اور پھر اسی کی مخالفت کر کے تفرقہ انگیزی کا کردار ادا کیا تھا وہی کردار اس نے مشرقی پاکستان میں بھی ادا کیا۔ ۱۹ جون کو جب اس نے عوامی لیگ کی حمایت سے منہ موڑ لیا تو عوامی لیگ کی وزارت شکست کھا گئی اور متحدہ محاذ کی وزارت نے اقتدار سنبھال لیا۔ مگر اسی روز نیشنل عوامی پارٹی نے اپنی حمایت کا رخ عوامی لیگ کی طرف پھیر کر متحدہ محاذ کی وزارت کو نیچا دکھا دیا۔ غرض صورت حال ایسی ابتر ہو گئی کہ صدر کو ۲۴ جون

کو صوبے میں دفعہ ۱۹۳ نافذ کرنی پڑی۔ دو مہینے کے بعد عطاء الرحمٰن خان پھر وزیر اعلیٰ مقرر ہوئے۔ صوبائی اسمبلی نے اسپیکر کو "غیر صحت مند دماغ والا شخص" قرار دے دیا۔ اس پر ۲۱ ستمبر کو اسمبلی کے اجلاس میں دنگا فساد شروع ہو گیا جس کے سبب شاہد علی کو اپنی جان سے ہاتھ دھونے پڑے۔

۱۹۵۸ء کے وسط میں ملک ایک سخت اقتصادی بحران کی لپیٹ میں آگیا۔ اندھا دھند خرچ اس زمانے کا عام دستور نظر آتا تھا۔ ہم جتنا غیر ملکی زرمبادلہ کما رہے تھے اس سے زیادہ تین سے لے کر چار کروڑ روپے ماہانہ کے حساب سے گنوا رہے تھے۔ زرمبادلہ کی محفوظ رقوم گھٹتے گھٹتے ۲۴ کروڑ روپے رہ گئی تھیں۔ ان میں سے نو یا چودہ کروڑ جتنا تو بآسانی منتقل بھی نہیں کیے جا سکتے تھے۔ دس مہینے اور یہی حالت رہتی تو ہمارے سکے کی کوئی قیمت ہی نہ رہتی۔ اور ممکن تھا کہ ہمارا روپے پیسے اور بنکاری کا نظام بالکل چوپٹ ہو جاتا۔

ادھر تو ملک میں یہ ابتری پھیلی ہوئی تھی اور ادھر ۱۹۵۶ء کے آئین کے تحت عام انتخابات کے چرچے ہو رہے تھے۔ یہ انتخابات نومبر ۱۹۵۷ء میں ہونے والے تھے مگر بعد میں انہیں ۱۹۵۹ء تک ملتوی کر دیا گیا تھا۔ صدر نے آئین کی کمزوریوں سے پورا پورا فائدہ اٹھایا تھا، اور جس شخص کا ملکی سیاست سے ذرا بھی تعلق تھا، اسے بے نقاب کر کے اس کی ساکھ مٹی میں ملا دی تھی۔ میں نہیں سمجھتا کہ وہ کبھی انتخابات ہونے دیتے۔ وہ تو بس کسی بہانے کی تلاش میں تھے جس کی آڑ لے کر آئین ہی کو منسوخ کر دیں۔ حقیقت میں وہ اس کے لیے زمین ہموار کر رہے تھے۔

ادھر سیاست داں، خاص طور پر وہ لوگ جن پر سیاسی زندگی کے دروازے بند کر دیئے گئے تھے، عام انتخابات سے طرح طرح کی امیدیں وابستہ کرنے لگے تھے۔ انہیں یہ ترغیب ہوئی کہ وہ بظاہر سیاسی حمایت کرنے کے لیے مگر درپردہ اپنے مخالفوں کو ڈرانے دھمکانے کے لیے ملک گیر مہم شروع کریں۔ اس کام میں سب سے آگے آگے خان عبدالقیوم خان تھے جو ملک کے دورے کر کر کے اپنی شعلہ بیانی سے لوگوں کو خانہ جنگی کی تلقین کر رہے تھے۔ وہ لوگوں سے کھلم کھلا کہتے کہ اگر میری پارٹی کو انتخابات میں کامیابی نہ ہوئی تو خون کی ندیاں بہ جائیں گی۔ ان کو دو بڑے فصیح البیان رفیق مل گئے تھے۔ ان میں ایک تو میرے بھائی سردار بہادر خان تھے اور دوسرے راجہ غضنفر علی خان۔

خان عبدالقیوم خان نے مسلم لیگ نیشنل گارڈ تیار کرنے شروع کیے اور کوئی ساٹھ ہزار جوان بھرتی کر لیے۔ یہ لوگ وردیاں اور فولادی خود پہنے، رائفلیں اٹھائے سرِبازار پریڈ کرتے۔ ۲۰ ستمبر کو حکومت نے فوجی وردیوں کا پہننا اور فوجی یا فوج سے ملتے جلتے ادارے قائم کرنا، خواہ وہ افراد کی طرف سے ہوں یا جماعتوں کی طرف سے، ممنوع قرار دے دیا۔ وزیر اعظم فیروز خان نون

نے ۲۲ ستمبر کو اعلان کیا کہ اگر ہر سیاسی جماعت کے پاس اپنی پرائیویٹ فوج ہوئی تو ملک میں آزادانہ اور منصفانہ انتخابات مطلق نہ ہو سکیں گے۔ قیوم خان ٹس سے مس نہ ہوئے۔ وہ اسی روز کراچی پہنچے اور ان کے ہزاروں حمایتیوں نے حکومت کے، تمامی احکام کی کھلے بندوں خلاف ورزی کی۔ ۲۸ ستمبر کو مسلم لیگ کی ورکنگ نے ایک قرارداد منظور کی کہ "اگر ضرورت پڑی تو غیر آئینی طریقوں سے حکومت کو برطرف کیا جائے گا۔"

ملک کی صورت حال اس وقت اور بھی پیچیدہ ہو گئی جب خان قلات نے عام ابتری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے قلات کو پاکستان سے الگ کرنے کے لیے سازشیں شروع کر دیں۔ اس زمانے میں بڑی سنجیدگی کے ساتھ یہ خیال کیا جا رہا تھا کہ خان قلات کو اس امر میں خود سکندر مرزا کی طرف سے شہ مل رہی ہے جو اپنا آخری حربہ استعمال کرنے کے لیے زمین ہموار کر رہے ہیں۔ ۱۰ اکتوبر ۱۹۵۸ کو خان قلات کو گرفتار کر لیا گیا۔ اور ان کے تمام اعزازات، مراعات اور اختیارات چھین لیے گئے۔

اس سے بھی زیادہ خطرناک بات یہ تھی کہ قیوم خان اور ان جیسے کچھ اور سیاست دانوں نے مسلح افواج کے بعض ارکین سے رابطہ قائم کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ طرح طرح کی افواہیں پھیلا رہے تھے تاکہ سینئر افسروں کو گروہوں کی حمایت حاصل کی جائے۔

ایک فوجی کی حیثیت سے مجھ پر یہ بات بخوبی عیاں ہو گئی تھی کہ انتخابات میں دو بدو جنگ کا نقشہ سامنے آئے گا اور ملک بھر میں فساد پھوٹ پڑیں گے۔ سول حکام جو سیاست دانوں کے آگے پہلے ہی بے دست و پا ہو چکے ہیں، صورت حال پر قابو نہ پا سکیں گے۔ فوج خواہ پسند کرے یا ناپسند، اسے دخل دینا ہی پڑے گا کیونکہ آخر ملک میں نظم و ضبط تو قائم رکھنا ہی ہو گا۔

گرد و پیش جو حالات پیدا ہو گئے تھے فوج ان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکتی تھی۔ نہ یہ خیال کیا جا سکتا تھا کہ فوجی افسر اور جوان زندگی کے ہر شعبے میں جو سیاسی جوڑ توڑ، چال بازی، بے ایمانی اور بد نظمی دیکھتے تھے اس سے کوئی اثر قبول نہ کریں گے۔ ان کے عزیز و اقارب بھی تھے، وہ اخبار بھی پڑھتے تھے۔ چونکہ فوج محب وطن تھی، اور ایک قومی فوج تھی اس لیے لازمی بات تھی کہ وہ عوام کے خیالات کا ساتھ دے۔ میں نے دیکھا کہ بہت سے فوجی افسر اور جوان بڑے مایوس اور دل شکستہ ہیں۔ ان سے اکثر کہا جاتا کہ "اے فوج کے لوگو! خود کو نمک حلال ثابت کرو، ملک کا یہ حشر ہو رہا ہے اور تم مزے اڑا رہے ہو۔ کچھ بھی کرو نہیں، ہر دردی پوش

کو بھی الزام دیا جاتا تھا۔ بڑے بڑے معزز لوگ مجھ سے ملنے آتے اور کہتے "تم چاہو تو ملک کی حالت سنبھال سکتے ہو۔ مگر تم جو کھوں میں پڑنا نہیں چاہتے۔" میرے بعض دوستوں نے اور بعض حیثیت ہو کر یہی بات مجھ سے کہی۔ میں نے کہا "بھلا میں کیا کر سکتا ہوں۔ یہ جو کچھ ہو رہا ہے اس کی ذمہ داری تو مجھ پر تو نہیں آتی۔ تم تو میری انہیں باتوں پر نکتہ چینی کر سکتے ہو جن کا میں ذمہ دار ہوں۔"

جوں جوں حالات خراب ہوتے گئے، زیادہ سے زیادہ لوگ میرے پاس آئے اور اسی سلسلے میں گفتگو کرنے لگے۔ مجھے ان کی آنکھوں میں بڑی مایوسی جھلکتی نظر آتی تھی۔ میں جہاں کہیں جاتا ——— اور میں اکثر دورے پر رہا کرتا، کبھی ایک چھاؤنی کا معائنہ کرنے کے لیے کبھی دوسری کا ——— اور جب کبھی لوگ مجھ سے ملتے۔ مجھے ان میں وہی ویران زندگی دکھائی دیتی پست ہمتی کا احساس عوام میں تیزی سے سرایت کرتا جاتا تھا اور انہوں نے کھلم کھلا کہنا شروع کر دیا تھا کہ "کاش کوئی اللہ کا بندہ آئے اور ملک کو بچائے۔" ظاہر ہے کہ ان کا اشارہ فوج کی طرف تھا۔ کیونکہ فوج ہی اس خلا کو بھر سکتی تھی۔ فوج ہی وہ واحد منظم ادارہ تھی جو مشکل کے وقت ان کی سپر بن سکتی تھی، ان کو سہارا دے سکتی تھی تاکہ وہ اپنے قدموں پر کھڑے ہو سکیں، اور ان مصیبتوں سے نجات حاصل کر سکیں جن میں وہ گھرے ہوئے تھے۔ حالات میں کوئی بہتری کی صورت نظر نہ آتی تھی۔ مگر میں تمنا کیا کرتا کہ شاید کوئی اللہ کا بندہ پیدا ہو ہی جائے۔ ایسی صورت میں میں پہلا آدمی ہوتا جو اس کا خیر مقدم کرتا اور پوری طرح اس کی مدد کرتا۔ میں آس لگائے رہا اور دعائیں مانگا کیا۔

ایک اور بات جو مجھے پریشان کرتی، یہ تھی کہ اگر ایک دفعہ فوج سیاسیات میں پڑ گئی اور یہ اب یقینی ہوتا جا رہا تھا، تو پھر اس کو اس سے علیحدہ کرنا مشکل ہو جائے گا۔ بیرونی دنیا اس کارروائی کو فوجی بغاوت ہی کے نام سے یاد کرے گی اور ۔ فوجی بغاوت کئی ملکوں میں ہو چکی تھی۔ اس سے پاکستان کی نیک نامی پر حرف آنے کا اندیشہ تھا۔ ایک اعلیٰ درجے کی منظم، تربیت یافتہ اور قاعدے قانون کی پابند فوج کے لیے یہ بات حد درجہ ناخوشگوار ہوگی کہ وہ سیاسی طاقت کے حصول کا ایک آلہ بن جائے۔ ادھر نوبت یہ آ پہنچی تھی کہ فوج ہی حالات کی اصلاح کر سکتی اور انہیں معمول پر لا سکتی تھی۔

میرے لئے تو یہ ایسی بات تھی جیسے میں اپنے ہی پالے پوسے بچے کو ان جانی مصیبتوں میں جھونک دوں۔ میں صبر کی تلقین کرتا رہا۔ میرے دل میں ایک خیال یہ بھی پیدا ہوتا کہ شاید

سکندر مرزا اس ابتری میں کوئی ترتیب کی صورت پیدا کر سکیں جو انہیں کی آوردہ ہے۔ لیکن
وہ خود اپنے کو غیر محفوظ سمجھنے لگے تھے۔ اور لوگوں میں ان کی ساکھ جاتی رہی تھی۔ وہ جوڑ توڑ
ہی کی فضا میں کام کرتے اور اسی میں پھل پھول سکتے تھے۔ اس زمانے میں میری ان سے
کئی بار ملاقات ہوئی۔ میں نے دیکھا کہ وہ خود ہراساں اور پریشان ہیں۔ میں ان سے کہا کرتا
کہ ملک کی بقا کے لیے آپ کو کوئی تعمیری قدم اٹھانا چاہیئے۔

اس زمانے میں خود میرے ذہن پر بھی سخت بوجھ معلوم ہوتا تھا، کیونکہ میں نے
ان دنوں ایک ڈائری سی لکھنی شروع کر دی تھی، جو میری عادت کے خلاف بات تھی۔ اس
میں پہلی عبارت کی تاریخ ۲ مئی ۱۹۵۸ء ہے۔ اور آخری عبارت کی تاریخ ۲۵ ستمبر ۱۹۵۸ء
ان تحریروں کے اقتباسات سے آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ اس زمانے میں میرے ذہن
کی کیفیت کیا تھی۔

۲ مئی ۱۹۵۸ء

جنرل ناتھن ٹوائننگ، اور جنرل عمر بریڈلے کے ساتھ "برننگ ٹری" گالف کورس
میں گالف کھیلا۔ جنرل بریڈلے کے غیر معمولی وقار اور انکسار سے بہت متاثر ہوا۔ سرسٹھ
(۶۷) سال کی عمر میں بھی بڑے گٹھے ہوئے جسم کے آدمی ہیں۔ انہوں نے اسی (۸۰) ضربوں
میں ایک بہت مشکل کورس پورا کیا۔ ٹوائننگ بھی اچھے کھلاڑی ہیں۔ کھیل کے دوران میں
بڑی گرمجوشی سے گفتگو کرتے رہے۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ ہندوستان کے بارے میں
اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کی پالیسی میری سمجھ میں نہیں آئی۔ انہوں نے کہا کہ میں ۵ مئی کو تمہارے
اعزاز میں ایک لنچ کا انتظام کر رہا ہوں۔ جس میں تمام سروسوں کے سربراہ شریک ہوں گے۔ ان
سے تمہیں اپنے مسائل کے بارے میں غیر رسمی بات چیت کرنے کا موقع ملے گا۔ میں چاہتا ہوں
کہ تم مقدور بھر صاف گوئی اور بے باکی سے گفتگو کرو۔

۵ مئی

لنچ پر سروسوں سے ملاقات ہوئی۔ میں نے ان سے اپنے دفاعی مسائل نیز فوجی امداد
سے متعلقہ مسائل کھول کر بیان کیے۔

شام کو ایلن ڈلس سے ملاقات ہوئی۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا کہ انہوں نے اپنے
بھائی کو جو امریکہ کے امور خارجہ کے سیکرٹری ہیں ہمارے مسائل سے آگاہ کر دیا تھا۔

۶ مئی

کانگرس کی عمارت میں امورِ خارجہ کی کمیٹی سے خطاب کیا۔ اس تقریر میں میں نے مشرقِ وسطیٰ میں گڑبڑ کی وجوہ پر روشنی ڈالی، نیز اس بات کی وضاحت کی کہ ہندوستان کو کسی قسم کی امداد دینا کتنا خطرناک ہے جب تک کہ وہ صلح جو رویے کی ضمانت نہ دے اور ہم سے منصفانہ اور باعزت بنیاد پر جھگڑے چکانے پر آمادہ نہ ہو۔ میں نے اس واہمے کو بھی دور کرنے کی کوشش کی کہ ہندوستان کی جنگی تیاری چین کے خوف کی وجہ سے ہے اور یہ کہ وہ پاکستان کے خلاف کوئی جارحانہ ارادہ نہیں رکھتا۔ کمیٹی نے مجھ سے کچھ باتیں بہت کرید کرید کر پوچھیں۔

اسی رات ایل پاسو (فورٹ بلیس) تک ہوائی جہاز سے سفر کیا۔ ہوائی جہازوں کو نشانہ بنانے والے گائیڈڈ میزائلوں کا مظاہرہ دیکھا۔ خوب تھا۔ ظاہر ہے کہ اب اے۔ اے۔ آرٹلری بیکار ہو کر رہ گئی ہے۔ ضرورت ہے کہ ان میزائلوں کو حاصل کیا جائے جو اڑنے والی چیز کے خلاف، خواہ وہ کسی رفتار سے بھی پرواز کر رہی ہو سو فیصدی کارگر ہیں۔

رات کو نیویارک روانہ ہوا۔

۸ مئی

پرنس علی خان کے ہاں ٹھہرا۔ انہوں نے کیبٹ لاج کو لنچ پر بلایا تھا۔ کیبٹ وہی شخص ہیں جو امریکہ کو ہندوستان کی امداد پر آمادہ کرنے کے ذمہ دار ہیں۔ میری ان سے طویل بات چیت ہوئی۔ میرا خیال ہے کہ آخر میں انہیں اپنی سفارشات کی معقولیت پر کچھ کچھ شبہ ہونے لگا تھا۔

۹ مئی

لندن روانہ ہوا۔

۱۲ مئی

بیگم لیاقت علی خان سے ملنے ہیگ گیا۔ ان کی صحت بہتر معلوم ہوتی تھی، مگر وہ ملک کی سیاسی صورت حال سے بڑی مضطرب نظر آتی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ اس کا واحد حل یہ ہے کہ ملک میں دس سال تک ایک کڑا نظم و نسق نافذ رہے۔

۱۳ مئی

امجد علی کے ساتھ شامل ہونے کے لئے برسلز پہنچا۔ برسلز کا عالمی میلہ دیکھا۔ روس والے ٹیکنیکل میدان میں زبردست ترقی کر رہے ہیں۔ چند سال کے اندر وہ کسی سے پیچھے نہ رہیں گے۔

۱۸ مئی

کراچی پہنچا۔ اخبارات میں گورمانی کے مقدمے کا فیصلہ دیکھا۔ ججوں نے فیروز خان نون کے

بارے میں بڑے افسوس ناک ریمارکس لکھے تھے۔ اس سے ہمارے ملک کو عالمی سیاست میں ایک دھکا لگے گا۔ اور ہمارے عوام کی ہمت اور پست ہو جائے گی۔

۲۱ مئی

۲۰ مئی کو بذریعہ ٹرین کراچی سے پنڈی روانہ ہوا۔ مجھے ۲۱ کی شام کو پنڈی پہنچنا تھا مگر میں جہلم اتر گیا اور اعظم سے ملاقات کی۔ انہوں نے ایک افواہ کا ذکر کیا جو ایبٹ آباد سے چلی تھی۔ وہ یہ کہ جنرل فلاں اور بریگیڈیئر فلاں گرفتار کر لئے گئے ہیں۔ میں اس کو بے پر کی سمجھ کے ہنس دیا۔ اگر اس افواہ میں ذرا بھی سچائی ہوتی تو چیف آف اسٹاف جس سے میں نے کراچی سے ٹیلیفون پر بات چیت کی تھی، اس کا ذکر ضرور مجھ سے کرتا۔ پنڈی میں میں نے کچھ اور افواہیں سنیں۔ میں نے اس کا ذکر اپنی بیوی سے کیا۔ انہوں نے کہا "ہاں میں بھی طرح طرح کی باتیں سنتی رہی ہوں"۔ ان کا انداز ہمیشہ یہی ہے کہ کڑی سے کڑی مشکل پر بھی بے پناہ جرأت اور ضبط و تحمل کا ثبوت دیتی ہیں اور اس بات کا خیال رکھتی ہیں کہ مجھے کسی قسم کی الجھن نہ ہونے پائے۔

میں سمجھتا ہوں کہ ایسی دانا اور دوراندیش رفیقۂ حیات کے بغیر زندگی میں وہ کچھ بھی حاصل نہ کر سکتا جو میں نے حاصل کیا ہے۔ گھریلو پریشانیوں سے آزادی اور ایک وسیع کنبے کو پروان چڑھانے سے بے فکری جو مجھے حاصل رہی، اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی دین ہے، جس کے بغیر انسان اپنی تعمیری صلاحیتوں سے پورا کام نہیں لے سکتا۔ میری بیوی نے ان افواہوں کا خلاصہ مجھ سے بیان کیا جو یہ تھا کہ بہت سے سینئر افسروں پر ہندوستان کے جاسوس ہونے کا الزام لگایا گیا ہے۔ میں نے سوچا کہ انسان اپنی خودغرضی یا محض حسد کی وجہ سے دوسروں کو بدنام کرنے پر کیسا مستعد رہتا ہے۔ سخت تعجب ہوا کہ بعض لوگ کیسے کانوں کے کچے ہوتے ہیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے انتہائی وفاشعار خدمت گزاروں کے خلاف بھی ہر قسم کی بات باور کر لینے پر ادھار کھائے بیٹھے رہتے ہیں۔ یقیناً یہ ذہن کی ناپختگی یا کسی قسم کے زوال کی علامت ہے۔

میں فطرتاً بڑا سیدھا واقع ہوا ہوں۔ لیکن ان افواہوں سے مجھے سخت صدمہ ہوا اور میں اداس ہو گیا۔ فرض کرو کہ ہم غنیم کے ساتھ جنگ میں مصروف ہوں اور اس کا پلہ بھاری ہونا شروع ہو جائے اور وہ ہماری فوج کے متعلق ایسی افواہیں محاذ کے پیچھے پھیلانا شروع کر دے تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا ظاہر کرتا ہی۔ ہم ایک گولی بھی چلائے بغیر جنگ ہار جائیں۔ کیسا خوفناک تصور ہے!

۲۲ مئی

جنرل موسیٰ سے ان افواہوں کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے بتایا کہ تحقیقات سے

پتہ چلا ہے کہ ان افواہوں کو ایبٹ آباد میں بعض سیاست دانوں نے پھیلانا شروع کیا تھا۔ انتخابات قریب آ رہے ہیں۔ سیاست دان ہر قسم کی چالاکی اور عیاری کے ساتھ برسرِ اقتدار آنا چاہتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ اقتدار حاصل کر لینے کے بعد ان کے پاس ملک کی فلاح و بہبود کا کوئی منصوبہ نہ ہوگا سوائے اس کے کہ وہ ملک میں اور زیادہ انتشار پھیلائیں۔ ایسی صورت میں انہیں مجھ سے اور فوج سے دوچار ہونا پڑے گا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مجھے اپنا دشمن نمبر ایک خیال کرتے ہیں۔ محض اس لیے کہ میں اپنے فرض سے روگردانی نہیں کرنا چاہتا۔ ان کا ضمیر اس درجے مردہ ہو چکا ہے کہ وہ سیاسی فائدہ حاصل کرنے کی غرض سے فوج کو بھی تباہ کرنے سے نہ چوکیں گے جو ان کی واحد سپر ہے۔

میں ان لوگوں میں سے ہوں جنہوں نے جمہوریت کے لیے کام کیا ہے، کیونکہ میرے خیال میں اگر ہم اس پر کاربند رہ سکیں تو اس سے بہتر اور کوئی طریق حکومت نہیں۔ جب غلام محمد مرحوم نے مجھے اقتدار کی پیش کش کی تھی تو میں نے صاف انکار کر دیا تھا کیونکہ اس وقت مجھے امید تھی کہ سیاست دانوں میں سے کوئی نہ کوئی اٹھے گا، جس میں وطن دوستی اور ایثار و قربانی کا جذبہ ہوگا اور جو ملک کو ترقی کی راہ پر لگائے گا۔ لیکن ان سب کو آزمایا جا چکا ہے اور وہ ان صفات سے خالی پائے گئے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر اب ملک کی باگ ڈور ان کے ہاتھ میں چلی گئی تو سوائے تباہی کے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہمیں شاید ایک نسل تک حکومت کا ایک طریقہ اختیار کرنا ہوگا جو رفتہ رفتہ ملک کو جمہوریت کے لیے تیار کر دے، اور ہمارے بعض بڑے بڑے مسائل کو حل کر دے۔ موجودہ آئین کے تحت تو سوائے نظم و ضبط کو ختم کرنے اور ملک کو نقصان پہنچانے کے اور کوئی اختیار کسی کے پاس معلوم نہیں ہوتا۔ کوئی سیاست بھلائی کا کام تو کیا کرے گا، وہ اگر اپنی کرسی ہی پر جما رہے تو اس کی بڑی خوش قسمتی ہوگی، اور اگر وہ کوئی کام کرنا بھی چاہے تو اس کے ساتھی جو سب کے سب غرض کے بندے ہیں، اسے ایسا کرنے ہی کب دیں گے۔

ان افواہوں کی روک تھام کے لیے بعض اقدامات کیے گئے۔

۲۷ مئی

اپنے امریکی دورے کے تاثرات کے بارے میں اسٹیشن افسروں سے خطاب کیا اور پاکستان کے دفاع کی بنیادی باتوں پر روشنی ڈالی۔

یکم جون

امور کشمیر کی کانفرنس میں شریک ہوا جس کی صدارت وزیر اعظم نون نے کی۔ اس کانفرنس میں تین اور سابق وزیر اعظم بھی تھے۔ اگر چند دن توقف کیا جاتا تو ان میں اور دو کا اضافہ ہو جاتا۔ میرا خیال تھا کہ یہ ایک دوسرے کے خلاف سیاسی برتری حاصل کرنے کے لیے تیار کیا گیا ہے لیکن اس کے برخلاف وہ میری گفتگو غور و فکر سے سنتے رہے۔ انہوں نے پوچھا کہ کشمیر کے بارے میں اور ہندوستان کی طرف سے نہروں کا پانی بند کر دینے کے بارے میں ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ جذباتی طور پر تو اس کا جواب یہی ہے کہ ہم ابھی جا کر ہندوستان پر دھاوا بول دیں لیکن دانائی کا تقاضا کچھ اور ہے جس کی میں نے ان لوگوں سے وضاحت کی۔

۶ جون

کور کمانڈروں اور ڈویژنل کمانڈروں سے ملاقات کی۔

۷ جون

ہمارا نیا تجرباتی بریگیڈ قائم کیا گیا ہے۔ ہم اپنے یونٹوں کی آئندہ تنظیم کے بارے میں بڑے پُرجوش ہیں۔ طرح طرح کی نئی تجویزیں ذہن میں آ رہی ہیں۔ لب لباب ان کا یہ ہے کہ ہم اپنے فوجی اداروں کو اس نظریے کے تحت پروان چڑھائیں کہ حملے کے وقت یا کسی قطعۂ زمین کی حفاظت کے وقت انسانی جانوں کو نہیں بلکہ فائر کی طاقت کو کام میں لایا جائے۔ اس کے نتائج بڑے مفید ہونے چاہئیں۔ میں نے اس مسئلے پر تحقیقاتی کام شروع کرا دیا ہے کہ ہم اپنے بکتر بند ڈویژن اور موٹرائزڈ انفنٹری کو کس طرح استعمال کریں۔

۹ جون

ڈیفنس سیکرٹری نے مجھے بتایا کہ آپ کے عہدے کی میعاد میں دو سال کی توسیع ہو گئی ہے۔ اس کا اعلان دوپہر کو ہو گا۔ یہ توسیع کس طرح عمل میں آئی اور اس کے بارے میں میرا ردِ عمل کیا تھا، اس کی کیفیت مندرجہ ذیل سگنلوں سے معلوم ہو گی۔

مسٹر فیروز خان نون وزیر اعظم کی طرف سے کمانڈر انچیف پاک آرمی کے نام تار مورخہ ۹ جون ۱۹۵۸ء:

"مجھے بڑی خوشی ہے کہ آپ نے دو برس تک اور ہماری افواج کے کمانڈر انچیف کے عہدے پر رہنا منظور کر لیا ہے (وقفہ) آپ ابھی بہت کم عمر ہیں آپ کی عمر ابھی صرف اکیاون (۵۱) سال ہے لیکن تجربے اور قابلیت میں نہایت پختہ کار (وقفہ) پاکستان موجودہ حالات میں آپ کی خدمات سے محرومی کا نقصان

کسی طرح برداشت نہیں کر سکتا اور مجھے یقین ہے کہ پہلے کی طرح ملک کا دفاع آپ کے ہاتھوں میں محفوظ رہے گا. (ختم)"

کمانڈر انچیف کا جواب:

"میں اپنی ملازمت کی توسیع پر آپ کے تعریفی اور حوصلہ افزا پیغام کا شکرگزار ہوں (وقفہ) ذاتی طور پر مجھے سبکدوشی پر بھی ویسی ہی خوشی ہوتی جیسی اس عظیم الشان فوج کی خدمت کا مزید موقع ملنے پر ہوئی ہے جس کی تعمیر میری عمر بھر کی تمنا رہی ہے (وقفہ) بہر حال میں نے اکتیس (۳۱) برس تک اس کا نمک کھایا ہے اور میں نے جو کچھ حاصل کیا، اس کی بدولت اور وہ اسی کی ملکیت ہے (وقفہ) آپ مطمئن رہیں میری بہترین خدمات فوج اور اس کے ذریعے ملک کی خدمت کے لیے وقف رہیں گی. (ختم)"

۱۲ جون

بذریعہ ہوائی جہاز پشاور پہنچا. اور ایک امدادی بٹالین اور ایک میڈیم بٹالین کا معائنہ کیا. ان دونوں کی فائر کی طاقت خصوصاً ٹینکوں کو نشانہ بنانے کی طاقت بڑی زبردست ہے مگر مجھے محسوس ہوا کہ ان کی باربرداری کا سلسلہ طویل ہے یعنی ڈیڑھ سو سے اوپر گاڑیاں. اس کے لیے کم نہیں تو تین میل لمبی سڑک چاہیئے. چھان بین کی جانی چاہیئے کہ کہاں کہاں کمی کی جا سکتی ہے.

۱۴ جون

کچھ دن آرام کرنے وادی کاغان گیا. رات شوگراں میں گزاری. یہ ایک خوبصورت مقام ہے جس کے نظارے بے حد حسین ہیں. چہل قدمی کے لئے نکلا. بارہ سو فٹ کی بلندی تک چڑھا. زیادہ جوش نہیں دکھایا کیونکہ پہاڑوں پر یہ میرا پہلا دن تھا.

۱۵ جون

ناران پہنچا اور وہاں چار روز قیام کیا. کچھ وقت مچھلیاں پکڑنے میں گزرا. لیکن زیادہ تر وقت کتاب "ہیں ہو، رولڈ انڈیا" (وہ لوگ، جنہوں نے ہندوستان پر حکومت کی) پڑھنے میں گزارا.

جھیل سیف الملوک تک گیا. چار میل کا سفر ڈھائی ہزار فٹ کی بلندی طے کرنے میں مجھے دو گھنٹے اور پندرہ منٹ لگے. یہ سخت ترین چڑھائی تھی جو میں نے کبھی چڑھی اگر

اس کا گر یہ ہے کہ انسان آہستہ آہستہ چڑھتا رہے۔ بلندی پر پہنچ کر میں نے جو عظیم الشان نظارہ دیکھا اس سے مجھے اپنی کلفت کا صلہ مل گیا۔

۲۱۔ جون

کاغان سے لوٹا تو معلوم ہوا کہ غلام عباس نے بڑے جتھے لے کر جنگ بندی لائن کو توڑنے کی جو دھمکی دی ہے، اس سے نظم و ضبط کا بڑا سخت مسئلہ پیدا ہو گیا ہے۔ صدر کو جو ان دنوں نتھیا گلی میں آرام کر رہے ہیں، یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ غلام عباس کو ملاقات کے لیے بلائیں اور اس کی بابت مناسب اقدام کی ہدایت کریں۔ یہ معلوم کر کے میرے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی کہ انہوں نے یہ ہدایت کی ہے کہ جب تک عباس اور ان کے آدمی جنگ بندی لائن پر ہی نہ پہنچ جائیں، ان کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی جائے۔ اس کے بعد فوج بغیر طاقت استعمال کیے انہیں گرفتار کر لے۔ میں نے اسی وقت صدر کو ٹیلی فون کر کے اس طفلانہ فیصلے کے خلاف احتجاج کیا۔ میں نے مطالبہ کیا کہ اگر کوئی کارروائی کرنی ہے تو پاکستان یا آزاد کشمیر کے علاقے کے سول حکام کے ذریعے کی جائے۔ اس پر کابینہ کا اجلاس ہوا اور میری سفارشات کو منظور کر لیا گیا۔ میرے کام کی مشکل یہ ہے کہ مجھے فوج کے انتظام کے ساتھ ساتھ ملک کے تحفظ کے سلسلے میں بہت سی اور باتوں پر بھی نظر رکھنی پڑتی ہے۔ اگر ہماری حکومت کے حلقے میں بلند سیرت اور با اصول آدمی ہوں تو اس کی ضرورت ہی پیش نہ آئے۔

۲۴۔ جون

واہ کی اسلحہ ساز فیکٹری کے مستقبل کے بارے میں کابینہ کی سب کمیٹی کے اجلاس میں شرکت کی جو کراچی میں منعقد ہوا۔

۲۸۔ جون

صدر سے ملنے نتھیا گلی پہنچا۔ نواب قزلباش وزیر اعلیٰ مغربی پاکستان سے بھی ملاقات کی۔ ان سے سرحدی پولیس کے مستقبل کے بارے میں خوب گفتگو کی۔ مشرقی اور مغربی پاکستان میں ان لوگوں کی تعداد کوئی اٹھاون (۵۸) ہزار ہے یعنی تقریباً تین ڈویژنوں کے برابر۔ میری تجویز یہ تھی کہ ان کی حیثیت سول فورس کی رہے۔ مگر ان کے افسر فوج سے لیے جائیں جیسا کہ اسکاؤٹوں کے معاملے میں ہوتا ہے۔ تاکہ انہیں فوجی کارروائی کی تعلیم دی جا سکے۔ اس طرح ان سے امن کے زمانے میں سول کام اور جنگ کے زمانے میں فوجی کام بہتر طریقے سے

لیا جا سکے گا۔ ملک کے اعلیٰ مفاد کو نظر میں رکھتے ہوئے بھی اس نے کام ہو جانا چاہیئے لیکن قزلباش ایک بار اس امر کو منظور کر کے اپنے وعدے سے پھر گئے۔ چنانچہ مجھے ان سے یہ باتیں صاف صاف کہنی پڑیں۔ ان کو کوئی پچاس پولیس افسروں کو ٹھکانے لگانے کا مسئلہ پریشان کر رہا تھا جو زائد از ضرورت قرار دیئے جانے والے تھے چنانچہ اس مسئلے کو حل کرنے کے لئے فیصلہ کیا گیا کہ ایک کمیٹی بنائی جائے جس میں ڈیفنس سیکرٹری، چیف سیکرٹری اور جنرل ہیڈ کوارٹرز کا ایک نمائندہ شامل ہو یہ کمیٹی اس معاملے کی چھان بین کرے۔ مشرقی پاکستان کی حکومت کے ساتھ بھی مجھے اسی قسم کی مشکل پیش آرہی ہے۔ تاہم میں نے ٹھان رکھی ہے کہ انجام کار انہیں صحیح کارروائی کرنے پر مجبور کر دوں۔ پاکستان جنگ کی صورت میں اس نفری سے محروم رہنے کا نقصان نہیں اٹھا سکتا۔ ہو سکتا ہے کہ اس نفری کا وجود فیصلہ کن ثابت ہو

۳۰ جون

میں کچھ دنوں سے بعض بہت دلچسپ کتابیں پڑھ رہا ہوں۔ ہندوستان کے حکمرانوں والی کتاب کے علاوہ میں نے گنتھر کی کتاب "اندرون روس" اور کپتان واٹنز کے مضامین "پیٹرن فور لمیٹڈ نیوکلیئر وار" (محدود ایٹمی جنگ کا خاکہ) اور "رول آف دی ٹیکٹیکل پلین" پڑھا جو "روسی" نامی جرنل میں شائع ہوا۔ ان مضامین نے ہمیں سوچ بچار اور اپنے بعض تنظیمی نظریوں اور جنگی اصولوں کی بابت نئے سرے سے چھان بین پر اکسایا ہے۔

مجھے عید اور دوسرے تہواروں پر تہنیت کے بہت سے پیغاموں کا جواب دینا پڑتا ہے جس سے میرا بہت وقت ضائع ہو جاتا ہے لیکن میں ایسا کرنے پر مجبور ہوں کیونکہ میں نہیں چاہتا کہ لوگوں کی دل شکنی ہو۔ ان میں سے بعض پیغام بڑے ہی پر خلوص ہوتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ مجھ پر اندھا دھند بھروسا کرتے ہیں۔ مجھے اس سے بڑی شرمساری ہوتی ہے۔ اور میں خدا سے دعا کرتا ہوں کہ وہ مجھے ان لوگوں کی امیدوں پر پورا اترنے کی توفیق عطا فرمائے۔

۴ جولائی

گورنمنٹ ہاؤس لاہور میں ایک اجلاس میں شرکت کی جس میں صدر، وزیر اعظم اور مغربی پاکستان کے وزیر اعلیٰ مع اپنی کابینہ کے شریک تھے۔ وزیر اعلیٰ نے یہ اجلاس اس لئے منعقد کیا تھا کہ عباس نے اپنے والنٹیروں کے ساتھ جنگ بندی لائن کو توڑنے کا جو ارادہ کیا ہے اس سے نمٹنے کا کوئی واضح طریقہ سوچا جائے نیز حکومت کو نیچا دکھانے کے لئے سیاسی پارٹیوں کی غیر ذمہ دارانہ حرکات اور گروہ بندی کی بڑھتی ہوئی کشاکش پر بھی غور و خوض کیا

جاننے میں عباس کی تحریک کے بارے میں حکومت کے فیصلوں سے خاص طور پر دلچسپی رکھتا تھا، کیونکہ آگے چل کر اس کا اثر فوج پر پڑنا ضروری تھا۔ فیصلہ کیا گیا کہ ہم عباس اور اس کے آدمیوں کی بابت مضبوطی سے کارروائی کریں اور انہیں ملک میں گڑبڑ پھیلانے دیں۔

۱۲ جولائی

جوائنٹ چیفس کا ایک جلسہ طلب کیا۔ کئی اہم باتوں پر بحث ہوئی۔ ایڈمرل چودھری نے تحفظ پاکستان کے نظریئے کے سوال کو پھر اٹھایا، جس کے متعلق کابینہ کی ڈیفنس کمیٹی پہلے ہی فیصلہ دے چکی تھی، اور دو پچھلے اجلاسوں میں ہم سب سے اتفاق رائے کر چکے تھے۔ بڑی گرما گرم بحث ہوئی۔ اس کے بارے میں حکومت کو ایک مراسلہ بھیجا۔

۱۴ جولائی

سوا چار بجے صبح کراچی سے صدر کے ساتھ ان کے ذاتی کاؤنٹ میں طہران کے رستے استنبول روانہ۔ جہاں بغداد پیکٹ کی اسلامی مملکتوں کے سربراہوں کی کانفرنس ہونے والی تھی۔ ایرانی مسلح افواج کے چیف آف اسٹاف جنرل ہدایت سے ملاقات کی تاکہ منصوبہ بندی کے مسائل کے بارے میں بعض شکوک رفع کئے جا سکیں۔ اسی ملاقات کے دوران میں ایک اسٹاف افسر نے جنرل ہدایت کو بتایا اور کہا کہ خانقین سے ایرانی کمانڈر نے خبر بھیجی ہے کہ عراق میں فوجی انقلاب ہو گیا ہے۔ ایک کرنل نے جس کے حامی ناصر کے طرفدار اور کمیونسٹ عناصر ہیں، اقتدار سنبھال لیا ہے، بادشاہ کے چچا پرنس عبدالالہ کو قتل کر دیا گیا ہے۔ اور ان کی نعش کو بغداد کے بازاروں میں گھسیٹا گیا ہے۔ محل اور برطانوی سفارت خانے کو جلا کر راکھ کر دیا گیا ہے۔ عوام خوشیاں منا رہے ہیں۔ اور ناصر کی تصویریں ہر جگہ نظر آ رہی ہیں۔ بادشاہ اور نوری السعید کے بارے میں متضاد خبریں آئی تھیں۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ نوری بچ نکلے ہیں، گو ان کا مکان جلا دیا گیا ہے، اور بادشاہ کو قید کر لیا گیا ہے۔

یہ بڑی اہم اور افسوسناک خبر تھی۔ ہم لوگ غمزدہ دل سے ساتھ استنبول روانہ ہوئے۔ جب ہم استنبول کے قریب پہنچنے والے تھے تو ہم سے کہا گیا کہ آپ انقرہ جا کر اتریں۔ وہاں صدر ترکی اور مسٹر مندریس نے ہمارا استقبال کیا۔ جو سوگ کا رنگ لئے ہوئے تھا۔ ترک بغداد کی خبروں سے بہت پریشان تھے۔ انہوں نے بڑی حد تک ان خبروں کی تصدیق کی جو ہم نے طہران میں سنی تھیں۔ بغداد میں ترکی کے سفیر کے پاس ایک ٹرانسمٹر تھا، جس کے ذریعے اس نے اپنے ملک کو وہاں کے حالات سے باخبر رکھا تھا۔ لیکن ان کی اطلاعات بھی مبہم تھیں، کیونکہ وہ اور اس کا عملہ شہر میں

سخت گڑبڑ ہونے کی وجہ سے باہر نکل کر تفصیلات کی چھان بین نہیں کر سکا تھا

صدر بایار کے ساتھ ڈنر کھایا۔ یہ ایک غیر رسمی سی تقریب تھی جس میں شاہ ایران، ہمارے صدر، مندریس اور زورلو شریک تھے۔ ڈنر کے بعد ایک اجلاس ہوا جس میں لبنان اور عراق کی صورت حال اور بغداد پیکٹ کے مستقبل کے بارے میں گفتگو ہوئی۔

شاہ ایران کو صورت حالات پر جو عبور حاصل تھا اور انہوں نے اس کا جو تجزیہ کیا اس سے میں بہت متاثر ہوا۔

۱۵ جولائی

بارہ بجے دوپہر صدر ترکی کے محل میں جمع ہوئے۔ عراق کی صورت حال کے باعث فضا بڑی المناک تھی۔ اتنے میں خبر آئی کہ نوری السعید کو بھی قتل کر دیا گیا ہے۔ ان کی نعش کو بغداد میں گھسیٹا جا رہا ہے۔ افسوس، یہ اس شخص کا انجام ہے جس نے ان لوگوں کی اتنی خدمت کی تھی۔

۱۶ جولائی

تین اسلامی ملکوں کے سربراہوں نے فیصلہ کیا کہ معاہدہ بغداد کے اجلاس جو لندن میں ہونے والے تھے، ملتوی کر دیئے جائیں، گو میرا یہ خیال تھا کہ ان کو منعقد ہونا چاہیئے تاکہ بدلی ہوئی صورت حال پر غور کیا جا سکے۔

۱۹ اور ۲۰ جولائی

ترک بعض علاقوں کے بارے میں بڑے حساس ہیں لیکن انہوں نے کمال مہربانی سے مجھے جزیرہ نمائے گیلی پولی کا دورہ کرنے اور پہلی جنگ عظیم کے میدان کارزار کو دیکھنے کی اجازت دے دی۔ یہ سفر بڑا تھکا دینے والا تھا۔ خراب سڑک اور دو دن میں آٹھ سو میل۔ لیکن تھا بڑا دلچسپ اور سبق آموز۔ بعض جگہوں پر طرفین کی خندقوں کے نشان ابھی تک دکھائی دیتے تھے۔

یکم اگست (پاکستان میں واپسی پر)

اٹک فورٹ اور چراٹ میں سپاہ کی تنظیم کا معائنہ کیا۔ اس یونٹ کی ٹریننگ۔ جو جنگ میں انتہائی کارآمد ثابت ہوگا، بہت اچھی طرح ہو رہی ہے اور ہر شخص خاص کر نوجوان افسر بڑے پر جوش معلوم ہوتے ہیں۔ یہ لوگ وہاں ہمیشہ کے لیئے بس جانا چاہتے ہیں۔

اس یونٹ میں یہ اہلیت پیدا کرنے کے لیے کہ وہ دشمن کے عقب میں دور دور تک کارروائی کر سکے، میں چند خاص نمونے کے ہوائی جہاز حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

جس میں چھ آدمی بیٹھتے ہیں اور جو محدود جگہ میں اُتر چڑھ سکتا ہے۔

سہ پہر کو مردان پہنچا تاکہ نئی پنجاب رجمنٹ کے کمانڈنگ افسروں سے ملاقات کر سکوں جو (رجمنل) سنٹر کی سالانہ کانفرنس کے لیے جمع ہوئے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ وہ بڑے چاق و چوبند ہیں اور ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر کام کر رہے ہیں۔ اس توسیع شدہ رجمنٹ میں نئی روح پیدا ہو رہی ہے۔

۵۔ اگست

مری میں بارہویں ڈویژن کی مشق کا معائنہ کیا۔ پیشہ ورانہ علم کے عام معیار سے میں خاصا متاثر ہوا۔ ہمارے افسر اب واقعی اپنے جوانوں کی قدر و قیمت سے واقف ہوتے جا رہے ہیں۔

۱۱۔ اگست

ایک سول افسر، کیڈٹ کور کی تنظیم کے سلسلے میں مجھ سے ملنے آیا، وہ بہت آزردہ تھا تھا اس نے سول انتظام کا بڑا تاریک نقشہ کھینچا، جو سیاسی گروہ بندی کے باعث روز بروز ابتر ہوتا جا رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ بہت سے سول ملازم خود اپنی مرضی سے اہل سیاست کا آلۂ کار بن جاتے ہیں۔

۱۵۔ اگست

ایک انفنٹری کمپنی کا مظاہرہ دیکھنے لاہور پہنچا۔ اس کمپنی کو نئے جنگی نظریئے کے تحت کوئی چار میل لمبے محاذ کی حفاظت کرنی تھی ہم نے نئے نظریئے کے تحت ایک بٹالین کی تنظیم پر بھی تبادلۂ خیال کیا۔

۱۹۔ اگست

تنکیاری میں "ریکے" بٹالین کا معائنہ کرنے گیا۔ یہ بٹالین خوب ترقی کر رہی ہے۔ البتہ ہر پلاٹون کو ۱۰۶ ملی میٹر کی ٹینک شکن رائفلوں کی اشد ضرورت ہے۔

بعد ازاں کمانڈو اسکول کا معائنہ کیا۔ اس کی ترقی کی رفتار سے اطمینان ہوا۔

۲۰۔ اگست

پی۔ایم۔اے کا معائنہ کیا (پاکستان ملٹری اکیڈمی کاکول)

۲۳۔ اگست

جہاز کے ذریعے نوشہرہ پہنچا، اور ٹینکوں کے خلاف ایک بہت دلچسپ دفاعی مظاہرہ دیکھا جس میں معدودے چند ٹینکوں کی ایک پوری رجمنٹ کا مقابلہ کیا گیا۔ بلا شبہ یہ دافعل

ٹینکوں کے خلاف بڑا زبردست ہتھیار ہے لیکن اس سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کے لیے اس کے استعمال میں بڑی مہارت درکار ہے۔

۲۶۔ اگست

فیلڈ مارشل مونٹ گمری کے بارے میں ایک پیغام ریڈیو پاکستان کے لیے ریکارڈ کرایا۔

۱۰۶۰۱ ملی میٹر ریکوئل لیس رائفل

۲۸۔ اگست

سیکرٹری وزارت دفاع نے مغربی پاکستان کے چیف سیکرٹری، ڈپٹی انسپکٹر جنرل اور پولیس کے نمائندوں کے ساتھ ایک میٹنگ میں شرکت کی جس میں سرحدی پولیس کو فوجی فرز میں تبدیل کرنے، دور افتادہ اور زبردست پولیس افسروں کو ٹھکانے سے لگانے کے مسئلے پر تبادلۂ خیال کیا۔ پولیس والے قدرتی طور پر ہر قسم کے اعتراض کرنے اور روڑے اٹکانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ادھر سیاست دان بھی کوئی سخت فیصلہ کرنے سے جان چرا رہے ہیں۔ وہ پولیس والوں کو ناراض کرنا نہیں چاہتے کیونکہ ان سے آئندہ انتخابات میں انہیں بڑی مدد ملنے کی امید ہے۔ میرا خیال ہے کہ پولیس والے ہی اصل انتخاب جیتنے والے باور کیے جاتے ہیں۔ میری ہدایات ہیں کہ بڑے تحمل کے ساتھ برابر دباؤ ڈالتے رہو تا وقتیکہ یہ کارروائی عمل میں نہ آ جائے۔ شاید اس میں کچھ وقت لگ جائے لیکن ملک کے استحکام کے لیے یہی ضروری ہے کہ اس جمعیت کو فوجی طرز کا بنا دینا چاہیے۔

مجھے بڑی افسوسناک اطلاعات مل رہی ہیں۔ اقتصادی بدحالی کے بارے میں، بدانتظامی کے بارے میں، جو سیاسی دخل اندازی کا نتیجہ ہے، عوام کی دل شکستگی کے بارے میں، کیونکہ ان کا اعتماد صدر سمیت سب سیاسی رہنماؤں پر سے اٹھ گیا ہے۔ عوام کا خیال ہے کہ ان میں سے کوئی شخص بھی مخلص نہیں، نہ کسی کا کوئی سیاسی مسلک ہے، اور نہ کسی میں وطن پرستی کا جذبہ ہے کہ وہ کوئی سخت اقدام کر کے ملکی برائیوں کو دور کرے۔ اور اب تو وہ خود مجھے اور فوج کو الزام دینے لگے ہیں کہ ہم اپنے فرائض سے غفلت برت رہے ہیں۔ یہ خطرناک خیال اس لیے پیدا ہوا ہے کہ لوگ فوج کے کام کی اصل نوعیت کو نہیں سمجھتے۔ لیکن انسان تنگ آ جائے تو ہر طریقے سے نجات پانے کی سوچنے لگتے ہیں۔ خدا جانے ان لوگوں کو یہ احساس ہے یا نہیں کہ اگر میں خود کو سیاسیات سے الگ تھلگ نہ رکھتا، تو آج ان کے پاس یہ فوج کہاں ہوتی۔ اور اگر اس قسم کی فوج نہ ہوتی تو وہ اب تک اپنی آزادی سے ہاتھ دھو بیٹھے ہوتے۔

۳ ستمبر

امریکہ اور دوسرے مغربی ملکوں سے ہندوستان کو بڑی بھاری اقتصادی امداد ملنے کی خبریں آ رہی ہیں۔ جس سے بڑی پریشانی ہے۔ اس طرح ہندوستان اقتصادی فکروں سے آزاد ہو کر اپنا سارا زور فوجی تعمیر پہ لگا دے گا اور ہمارے حالات کو اور بھی زیادہ مشکل بنا دے گا

۱۰ ستمبر

کراچی پہنچا۔ مسٹر دکو جا مداد کے مسائل پر وزارت مالیات سے گفت و شنید کی۔ علاوہ ازیں ڈیفنس سیکریٹری کے ساتھ ڈائرکٹر جنرل ڈیفنس پرچیز کے چارٹر کے بارے میں بھی تبادلہ خیال کیا۔ میں نے ان پر زور دیا کہ سامان خریدنے اور پرانے سامان کو اٹھوانے میں عجلت کرنی چاہیے

۱۳ ستمبر

او. ٹی. ایس (آفیسرز ٹریننگ سروس) کی پاسنگ آؤٹ پریڈ دیکھی۔

۱۴ ستمبر

فوجی جتھا ۱۲ اور ۱۳ رنگروٹوں کے میلے میں شرکت کی

۱۵ ستمبر

ساڑھے پانچ بجے صبح بذریعہ ہوائی جہاز لاہور روانہ ہوا۔ دسویں پنجاب کی صد سالہ تقریب میں شرکت کی۔ لنچ کے بعد واپس آیا۔

۱۸ ستمبر

شمالی علاقوں کو روانہ ہوا۔ پولیٹیکل ایجنٹ اور ریذیڈنٹ سے ملاقات کی۔

۲۰ ستمبر

گوپس دریا میں کچھ ٹراؤٹ مچھلیاں پکڑیں۔

۲۱ ستمبر

گلگت واپس آیا۔

۲۲ ستمبر

ہنزہ روانہ ہوا

۲۳ ستمبر

قیام کیا۔ چیف آف اسٹاف سے کراچی کی سیاسی ہلچل کی اطلاع ملی۔

۲۴ ستمبر

گلگت واپس آیا۔ میر آف ناگر کے ساتھ لنچ کھایا۔ مسلم لیگ کی کارروائی کے بارے میں چیف آف اسٹاف کا تفصیلی پیغام ملا۔

میں نے چیف آف اسٹاف کو بتایا کہ پیشگی منظوری کے بغیر کسی قسم کی بڑی کارروائی کی ہرگز نہ کیا جائے۔

۲۵ ستمبر

صبح سوا دس بجے راولپنڈی واپس آیا۔

(۶)

انقلاب

نقارے پر چوٹ پڑ چکی تھی۔ وہ لمحہ جس کا مدت سے انتظار تھا، آخر کار آ پہنچا تھا۔ اب ذمہ داری سے جان چرانا ممکن نہ رہا تھا۔ یہ ۴۔ اکتوبر ۱۹۵۸ء کا دن تھا۔ اور جب میں اپنے ریلوے سیلون میں سوار ہوا، تو میں جانتا تھا کہ اب یہ دور ختم ہونے کو ہے۔ میں کراچی جا رہا تھا۔ جہاں ایک سیاسی سوانگ ایک لمبے عرصے سے کھیلا جا رہا تھا اور اب اس کے ختم ہونے کا وقت آ پہنچا تھا۔ اس سے چند روز پہلے صدر سکندر مرزا نے مجھے بتایا تھا کہ اب صورت حال ناقابل برداشت ہوتی جا رہی ہے اور میں نے اقدام کا فیصلہ کر لیا ہے۔

برسوں سے ہم سب لوگ یہ آس لگائے بیٹھے تھے کہ ملک کے سیاسی رہنماؤں کو اپنی اہم ذمہ داریوں کا احساس ہو گا۔ ان میں وطن دوست بھی تھے، اور لائق اور فائق لوگ بھی۔ کچھ ایسے تھے کہ انہوں نے پاکستان کی جدوجہد کی کس بصیرت، تدبر، حوصلے اور عزم کے ساتھ رہنمائی کی تھی اس کے بعد انہوں نے یہ بھی دیکھا تھا کہ لیاقت علی خان کیسے ٹھنڈے دل، جرأت اور مضبوط ارادے کے ساتھ حکومت کے سفینے کو بھنور سے نکالنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان میں سے ہر ایک نے اقتدار کی رسی کو جھپٹ کر پکڑ لیا تھا اور ایک آن کے لیے اُجالے میں آ کر جوڑ توڑ اور نااہلی کے اندھیرے میں جا پڑا تھا۔

میں ۵۔ اکتوبر کو کراچی پہنچا۔ یحییٰ، حمید، وہ دو ایک اور افسر مجھ سے پہلے وہاں پہنچ چکے تھے۔ میں جنرل سکندر مرزا سے ملنے گیا۔ وہ لان میں بیٹھے تھے۔ سوچ میں ڈوبے ہوئے، چہرے سے ملال اور مایوسی ٹپکتی ہوئی۔ میں نے ان سے پوچھا۔ "کیا آپ نے اچھی طرح سوچ سمجھ لیا ہے؟"

"ہاں" انہوں نے کہا۔

"کیا آپ کے خیال میں یہ مطلقاً ضروری ہے؟"

"ہاں۔ یہ مطلقاً ضروری ہے۔" انہوں نے مضبوط ارادے کے ساتھ کہا۔

میں اس کو بڑی بدقسمتی کی بات سمجھتا تھا کہ وقت کی نزاکت میں ایسا سخت قدم اٹھانے پر مجبور کر دے اور پھر خود کو اس کارروائی میں شریک دیکھنا بھی تو کوئی خوشگوار بات نہ تھی۔ مگر اس کے سوا کوئی چارۂ کار بھی نہ تھا۔ ملک کو بچانے کا یہ آخری موقع تھا۔

اس سے پندرہ روز پہلے سات وزیر جن میں چار سرکاری وزیر تھے، مرکزی کابینہ میں اپنے عہدے کا حلف اٹھا چکے تھے۔ ان کو ملا کر وزیروں کی کل تعداد چھبیس تک پہنچ گئی تھی یہ قدم ری پبلیکن اور عوامی لیگ کی ملی جلی حکومت کو جس کے سربراہ ملک فیروز خان نون تھے سنبھالا دینے کے لیے اٹھایا گیا تھا۔ کیونکہ وہ بری طرح ڈول رہی تھی۔ اس کے بعد عہدوں کی تقسیم پر بڑی تو تو میں میں ہوئی۔ ۷ اکتوبر کو دن کے ایک بجے عہدے از سر نو تقسیم کیے گئے اس پر عوامی لیگ نے جھٹ استعفیٰ دے دیا۔ شام کو سات بجے عہدوں کی تازہ تقسیم کا اعلان کیا گیا۔ مگر اس وقت تک مرکزی اقتدار کی عمارت ڈھے چکی تھی۔ شام کو آٹھ بجے سکندر مرزا نے بڑے ڈرامائی انداز میں آئین کو منسوخ کر دیا۔ سارے پاکستان میں مارشل لاء کا اعلان کر دیا، مرکزی اور صوبائی حکومتوں، قومی اسمبلی اور صوبائی اسمبلیوں کو منسوخ کر دیا اور مجھے مارشل لاء کا منتظم اعلیٰ مقرر کر دیا۔

اس گھڑی کے بعد کی کارروائی میں جذباتی باتوں کا کچھ دخل نہ رہا۔ جب ایک کام کرنا ہی ہے تو مناسب ہے اچھی طرح کیا جائے۔ ایک سیدھا سادہ طریق کار سوچا گیا۔ اور اس پر عمل درآمد شروع ہو گیا۔ میں نے جنرل سکندر مرزا کو مشورہ دیا "بہتر ہو گا کہ آپ اپنے وزیراعظم کو اس صورت حال کی اطلاع دے دیں۔" لیکن ان کا خیال تھا کہ اس کی ضرورت نہیں، کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ یہ کارروائی قانونی طور پر بالکل صحیح ہے۔

میں نے کہا۔ میں آپ سے دو باتیں تحریری صورت میں چاہتا ہوں۔ ایک تو یہ کہ آپ مارشل لاء کا انتظام میرے سپرد کرتے ہیں۔ اور دوسری یہ کہ آپ وزیراعظم کو خط لکھیں کہ یہ فیصلہ آپ نے کیا ہے۔ آپ نے حکومت کو برطرف کیا ہے، آئین کو منسوخ کیا ہے، مارشل لاء کا اعلان کیا ہے، اور مجھے مارشل لاء کا منتظم مقرر کیا ہے۔"

انہوں نے ملک فیروز خان نون کو خط تو بغیر حیل و حجت کے لکھ دیا، مگر وہ مجھے مارشل لاء کے انتظام کا تحریری اختیار دینے پر آمادہ نظر نہ آتے تھے۔ میں چاہتا تھا کہ وہ وزیراعظم کو خط لکھ دیں۔ تاکہ اپنے اس فیصلے کی پوری ذمہ داری ان پر عائد ہو۔ وہ حکومت کے آئینی سربراہ کی حیثیت سے اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ ملک کا انتظام آئینی طور پر ممکن نہیں رہا۔

میں نے کہا "آخر آپ نے کوئی قدم تو اٹھانا ہی ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ صحیح قدم اٹھایا ہے لیکن میں چاہتا ہوں کہ آپ کا فیصلہ تحریری صورت میں میرے پاس موجود ہو۔"

وہ ٹال مٹول کرنے لگے۔ لیکن آخر کار انہوں نے دو تین دن کے بعد یہ خط لکھ کر دینا منظور کر لیا

انقلاب کے لیے بہت پہلے سے تیاریاں کرنی پڑتی ہیں۔ لمبے چوڑے منصوبے بنائے جاتے ہیں۔ خفیہ جلسے ہوتے ہیں، اور ملک بھر میں فوج کی نقل و حرکت ہوتی ہے۔ ہمارے معاملے میں ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔ اس کو ایک فوجی کارروائی کے طور پر انجام دیا گیا۔ بس اتنا ہوا کہ ایک بریگیڈ کو حرکت میں لایا گیا۔ دراصل عام طور پر کراچی میں دو بریگیڈ ایک انفنٹری اور ایک آرٹلری بریگیڈ تو متعین رہتے ہی ہیں۔ چنانچہ اگر مارشل لاء جاری کر دینے کے بعد کچھ گڑبڑ ہوتی تو اس پر قابو پانے کے لیے ہمارے پاس کافی فوج موجود تھی۔ لیکن ہم نے احتیاط کے طور پر ایک اور بریگیڈ کوئٹہ سے بلوا کر کراچی سے باہر جنگ شاہی میں ٹھہرا لیا۔ بس یہ تھی ہماری فوجی تیاری۔ فوج کو ہر قسم کی غیر متوقع صورت حال کے لیے ہر وقت تیار رہنا پڑتا ہے۔ اس قسم کی کارروائی میں ناکامی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اگر کہیں مارشل لاء کے خلاف آواز اٹھائی جاتی خواہ لمحہ بھر کے لیے ہی سہی، تو اس سے بڑی خطرناک صورت حال ہو جاتی۔ جنگ شاہی میں بریگیڈ کو ٹھہرانے میں اسی احتیاط کو مد نظر رکھا گیا تھا۔

انقلاب کی رات کو ہم نے کمانڈر انچیف، اور تمام مقامی کمانڈروں کو اس صورت حال سے آگاہ کر دیا تھا۔ اور ان سے کہا تھا کہ ہر صورت میں امن و امان قائم رکھیں۔ بس یہ تھی کل کارروائی۔ اس کے بعد ہم مارشل لاء کے منتظمین کے درجہ بدرجہ تقرر میں مصروف ہو گئے۔ ان لوگوں کو ان کے فرائض سے آگاہ کیا گیا۔ رفتہ رفتہ سول حکام اور فوج کے درمیان رابطہ پیدا ہونا شروع ہو گیا۔

ہم نے اس بات کا پورے طور پر اطمینان کر لیا تھا کہ یہ کارروائی کامیاب رہے گی۔ اب سوال یہ تھا کہ اس کارروائی کو کن حدود میں رکھا جائے۔ میرا اپنا خیال یہ تھا کہ اگر کہیں مزاحمت ہوئی بھی تو وہ برائے نام ہی ہو گی۔ اور ہم اس پر آسانی سے قابو پا لیں گے۔ چنانچہ طاقت کے استعمال کا موقع ہی نہیں آئے گا۔ لوگ ملک کے حالات سے بہت بیزار ہو چکے ہیں اور تبدیلی کے سخت خواہش مند ہیں۔ اور پھر ان کے دل میں فوج کا بے حد احترام بھی ہے۔

اس دوران میں یہ ذکر بھی آیا کہ یہاں بھی مارشل لا کا وہی ضابطہ نافذ کیا جائے جو
۱۹۵۳ء میں لاہور میں پہلے مارشل لا کے موقع پر جاری کیا گیا تھا اور جس کی رو سے ان
لوگوں کے خلاف کارروائی کی جا سکتی تھی جو ملک میں نظم و ضبط کی بربادی کے ذمہ دار تھے
انقلاب کے موقع پر ہم نے سب سے پہلے اس ضابطے پر غور کیا، تجویز تھی کہ اس سے گڑبڑ پھیلانے
والوں کے خلاف اقدام کرنے کا اختیار مل جاتا جو ملک و قوم کی غارتگری کا باعث ہوتے تھے لیکن
میں نے کہا: ”ہمیں یہ خیال ترک کر دینا چاہیے۔“ میں چاہتا تھا کہ لوگ جلد سے جلد پھر کام پر لگ جائیں اور
ملک کی تعمیر نو اور معاشرے کی بحالی کے منصوبوں میں مصروف ہو جائیں۔ ان کا بار جلد سے جلد اتر جائے
مارشل لا ایسی آسانی سے جاری ہو گیا جیسے کوئی بجلی کا بٹن دبا دے۔ حالات آپ سے آپ
سدھرنے شروع ہو گئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہمارے لوگ بنیادی طور پر بڑے باشعور تھے اور
ہماری سول ملازمتوں میں اچھے لوگوں کی پچھلی حرکتوں پر سزا دینے کا ذریعہ نہیں بنایا گیا۔ اگر ایسا ہوتا تو
ہمارے اقدام کی تعمیری نوعیت کے خلاف ہوتا۔

ملک کو ترقی کرنے اور خود کو ایک جیتی اور بڑھتی ہوئی طاقت میں ڈھالنے کے لیے
صحیح قسم کی جدوجہد کی ضرورت تھی۔ ہمارے پاس کام کے آدمی ویسے ہی کم تھے۔ ان کو تعمیری کاموں
میں لگانے کی بجائے ملک میں خوف و ہراس کی فضا پیدا کرنا اور لوگوں کو جبر کا نشانہ بنانا بے فائدہ
تھا۔ عقل کی بات یہ تھی کہ اپنے آدمیوں سے اچھے کام لیے جائیں۔ میرے ذہن میں یہ بات واضح
تھی کہ اگر مارشل لا سے کوئی فائدہ اٹھانا ہے تو یہی کہ حکومت کی مشینری کو پھر سے استوار کر دیا
جائے تاکہ وہ اپنا کام شروع کر دے۔

مارشل لا جاری ہونے کے بعد اگلی صبح کو میں نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ مرکزی حکومت
کے تمام سیکرٹریوں کی ایک میٹنگ بلوائی۔ میں نے ان کو صورت حال سے آگاہ کیا اور بتایا کہ ان کا
کام کیا ہوگا۔ میں نے پالیسی کا ایک خاکہ بھی ان کے سامنے پیش کیا۔ میں نے دیکھا کہ ان میں سے
دو ایک سیکرٹری کچھ ڈرے ہوئے سے معلوم ہوتے ہیں۔ میں نے ان کی مزاج پرسی کی۔ اس کے
بعد جلد ہی سب راضی خوشی کام کرنے لگے۔ ہم نے سیکرٹریوں کی ایک کونسل بنائی جو دو مہینے تک
کام کرتی رہی۔

جیسا کہ میں بتا چکا ہوں کہ مارشل لا والے دن کچھ فوجیوں کو بعض اہم مقامات پر پہنچایا تھا
کہ اگر کوئی شورش ہو تو اس سے نمٹ سکیں۔ لیکن دو ایک یونٹوں کو بڑے متضاد احکام ملے۔ خیال
کیا جاتا تھا کہ یہ احکام ڈیفنس سیکرٹری کی طرف سے ایک بریگیڈ کے کمانڈر کو دیے گئے تھے۔ اس

کے بعد فوج کے لوگ شک و شبہ میں مبتلا رہنے لگے۔ وہ اب دوسرے کو بھی شبہ کی نظر سے دیکھنے لگے، کیونکہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ شک و شبہ کے پیچھے کون ہو رہا ہے۔

میرے خیال میں وہ آخر کار اس نتیجے پر پہنچے کہ سکندر مرزا ٹھنڈے پڑ چکے ہیں۔ ہمیں اطلاع ملی کہ ان کی بیوی ہر وقت ان سے لڑتی جھگڑتی رہتی ہے اور بار بار کہتی ہے کہ تم نے سخت غلطی کی۔ خیر وہ تو جو ہوا سو ہوا، اب تمہیں چاہئیے کہ ایوب خان کو ختم کر دو۔ سکندر مرزا نے انٹیلی جنس بیورو اور دوسرے ذرائع سے بعض اہم مقامات پر فوجوں کی ترتیب کا نقشہ معلوم کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے کراچی کے ارد گرد حرکت میں آنی ہوئی فوج کی ترتیب بھی معلوم کرنے کی کوشش کی

مارشل لاء کے بعد قدرتی طور پر میں مشرقی پاکستان جانا چاہتا تھا، جہاں پاکستان کی ایک بہت بڑی اکثریت آباد ہے۔ لیکن سکندر مرزا میرے اس ارادے سے کچھ ناخوش سے دکھائی دیئے انہوں نے مجھے خبردار کیا "بہت ہوشیار رہنا، کیونکہ بہت سے لوگ تمہارے خون کے پیاسے ہیں۔" میں نے کہا: "میں تو موت سے بہت آنکھ مچولی کھیلتا رہا ہوں، میری زندگی ہی یہ ہے۔"

ڈھاکہ میں ایک بڑا بھاری عام جلسہ ہوا جس میں میں نے تقریر کی۔ میرا خیال ہے کہ اسکے بعد سکندر مرزا کچھ ڈرے سہمے سے رہنے لگے۔ لیکن میں نے خود انہیں پہلے سے بتا دیا تھا: "دیکھئے اب حالات بدل گئے ہیں۔ ملک میں انقلاب ہو گیا ہے۔ آپ خود اس انقلاب کے نقیب ہیں آپ نے ملک کا انتظام میرے سپرد کیا ہے۔ لیکن یہ انقلاب کوئی ایسی تبدیلی نہیں جو چلتے چلاتے ہو جایا کرتی ہے۔ اب تو ملک میں حقیقی اور بنیادی تبدیلیاں کی جائیں گی۔ یہ میری پالیسی ہے آپ خائف نہ ہوں۔ اب یہ میری ذمہ داری ہے۔ یہ بوجھ مجھی کو اٹھانا ہے۔ میں نے ملک میں بعض بنیادی اصلاحات کو عمل میں لانے کی ٹھان لی ہے۔ اس لئے مہربانی کر کے آپ کسی جوڑ توڑ میں حصہ نہ لیں۔ اس کی کوئی بھی وجہ نہیں ہونی چاہئیے۔ کیونکہ میں نے آپ کے اقتدار کو برقرار رکھنے کا تہیہ کر رکھا ہے۔ اور میں مقدور بھر آپ کا وفادار رہوں گا۔"

انہوں نے کہا "بس تو پھر ٹھیک ہے۔"

میں نے کہا "بہت خوب!"

لیکن ہمیں برابر اطلاعیں ملتی رہیں کہ ان کی بیوی ہمیشہ ان کے پیچھے پڑی رہتی ہے کہ ایوب خان کے خلاف جلد کچھ کرو۔

جب میں مشرقی پاکستان سے واپس آیا اور ماری پور ائیرپورٹ پر اترا تو میجر شیر بہادر

میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ آپ کے جانے کے بعد پاکستان ائیر فورس کے ائیر کموڈور رب کو صدر جنرل سکندر مرزا نے ٹیلی فون کیا تھا اور پوچھا تھا "کیا تم اس ملک کے وفادار ہو؟"

رب نے کہا "ہاں میں وفادار ہوں۔"

"کیا میرے بھی بہ حیثیت صدر وفادار ہو؟"

رب نے کہا "ہاں میں وفادار ہوں۔"

"کیا تم میرے احکام کی تعمیل کرو گے خواہ اس میں تمہاری جان خطرے میں پڑ جائے؟"

اس کے جواب میں رب نے کہا "جناب پہلے مجھے احکام معلوم ہونے چاہئیں"

سکندر مرزا نے کہا "میں چاہتا ہوں کہ تم جا کر تین جنرلوں کو گرفتار کر لو۔ ان کے نام ہیں جنرل یحیٰی، جنرل بہادر اور جنرل حمید۔"

اس پر ائیر کموڈور رب جھجکے اور طرح دیتے ہوئے کہا "جناب میں حاضر ہو جاؤں گا۔ کیا آپ مجھے تحریری حکم دے دیں گے؟"

میں نے جنرل شیر بہادر سے کہا "اس کا کچھ خیال نہ کرو" میں نہیں چاہتا تھا کہ بات بڑھے۔ گو میں جانتا تھا کہ سکندر مرزا سے ایسی احمقانہ بات تھی کہ اس سے فوراً سروسوں میں ٹھن جاتی اور پھر خدا جانے کیا پیش آتا۔ سکندر مرزا نے یہ نہیں سوچا تھا کہ اگر وہ فوج اور اس کے سربراہوں کے خلاف کوئی کارروائی کریں گے تو فوج سب سے پہلے خود انہیں کا کام تمام کر دے گی۔ چنانچہ میں ان کے پاس گیا اور کہا "آپ کا ارادہ کیا ہے؟" "میں نے سنا ہے کہ آپ فوجی افسروں کی گرفتاری کے احکام دیتے رہے ہیں۔"

انہوں نے تردید کرنے کی کوشش کی "آپ کو غلط اطلاع ملی ہے۔ اس میں ذرہ بھر سچ نہیں۔"

میں نے انہیں تنبیہ کی: "دیکھئے یہ عیاری اور چالبازی ختم کیجئے۔ ہوشیار رہیئے۔ آپ آگ سے کھیل رہے ہیں، حالانکہ اس کی کچھ ضرورت نہیں۔ ہم سب آپ کی وفاداری کا دم بھرتے ہیں۔ پھر آپ ایسی شرارتیں کیوں کر رہے ہیں؟"

ادھر فوج کے قانونی مشیروں نے یہ رائے ظاہر کی کہ آئین منسوخ ہو چکا ہے اور مارشل لاء کا منتظم اعلیٰ مقرر ہو چکا ہے، اس لیے صدر کا عہدہ محض فاضل ہو کر رہ گیا ہے۔ یہ ان کے خیال کے مطابق اس معاملے کی قانونی حیثیت تھی۔ میں نے کہا: "دیکھو تم لوگ میرے لیے اور الجھنیں پیدا نہ کرو۔ تم مجھے کیوں تنگ کرتے ہو۔ اس سے کچھ فائدہ نہ ہوگا۔"

جب اس معاملے پر بحث ہو رہی تھی تو مجھے یاد پڑتا ہے کہ چیف جسٹس منیر بھی وہاں موجود
تھے۔ وہ انقلاب سے پہلے سکندر مرزا کو بعض امور میں مشورہ دیتے رہے تھے۔ میں نے انہیں بلایا۔
ساتھ ہی مجھے خیال آیا کہ میں سکندر مرزا سے بھی ملوں۔ میں نے کرنل قاضی سے کہا کہ اپنا نقطۂ نظر
بیان کرو۔ ان کا دعویٰ تھا کہ نئے نظام میں صدر کی کوئی جگہ ہی باقی نہیں رہی۔ منیر کو اس سے اتفاق
نہ تھا۔ میں نے قاضی سے کہا: "میں منیر سے متفق ہوں۔ بس یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔" اس کے بعد میں
نے اسے رخصت کر دیا۔

مجھے امید تھی کہ سکندر مرزا نئی صورت حال کو قبول کر لیں گے۔ ہم میں ہمیشہ بڑی دوستی رہی
تھی۔ میں نے دل میں کہا کہ جب تک وہ صریحاً کوئی غلط بات نہیں کرتے، ان کے خلاف کسی قسم کی
کارروائی کرنا بے وفائی کے مصداق ہوگا۔ اس کے کچھ دن کے بعد میرے عسکری کمانڈر میرے پاس آئے اور
کہنے لگے: "اب یہ شخص ناقابل برداشت ہو گیا ہے۔"

میں نے پوچھا "وہ کیسے؟"

اس کے جواب میں ان لوگوں نے کچھ واقعات سنائے کہ سکندر مرزا نے فلاں فلاں آدمیوں کو
ٹیلی فون کر کے ان سے کچھ سودا بازی کرنی چاہی تھی۔

ادھر لوگوں میں یہ احساس بڑھتا جا رہا تھا کہ جب تک سکندر مرزا موجود ہیں، ریشہ دوانیاں ہی جوڑ توڑ
ہوتے رہیں گے اور کوئی تعمیری کام نہ ہو سکے گا۔ میرے رفقائے کار نے کہا: "تمہاری مشکل یہ معلوم ہوتی
ہے کہ تم ایک دوست کے پاس جا کر اس سے یہ کہنا نہیں چاہتے کہ تم سخت بے وفا ثابت ہوئے
ہو۔ لیکن یہ معاملہ تمہاری ذاتی دوستی سے کہیں بالا ہے۔ ہم بڑے خلوص سے تمہیں مشورہ دیتے
ہیں بلکہ تم سے التجا کرتے ہیں کہ اس بات کو سمجھنے کی کوشش کرو کہ اب ہمارا اور ان کا ساتھ ممکن
نہیں۔"

میں نے کہا: "اچھی بات ہے مجھے سوچنے کے لئے دو دن کی مہلت دو۔"

مجھے امید تھی کہ شاید سکندر مرزا اب بھی سنبھل جائیں۔ اور شاید میرے رفقا بھی اپنے خیال
سے باز آ جائیں۔ مگر جنرل ہیڈ کوارٹرز اور فوجی افسروں کا شور و غوغا بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ ان
سب نے مجھ سے کہا: "آپ جو کام بھی کرنا چاہیں گے یہ شخص اس کو ملیامیٹ کر دے گا۔
ہمیں ڈر ہے کہ عوام کو ہماری پالیسیوں پر کچھ اعتماد نہیں رہے گا۔ ملک میں امن چین نہیں ہو گا۔
اصلاح کی جو کوشش بھی کی جائے گی، اس کا نتیجہ صفر ہوگا۔"

آخر کار میں نے کہا: "تمہاری یہی مرضی ہے تو میں جا کر سکندر مرزا کو بتا دیتا ہوں۔"

انہوں نے کہا: "نہیں۔ آپ نہ جائیں۔ ہم خود آپ کی طرف سے انہیں بتا دیں گے۔"

اس پر تین جنرل ان کے پاس پہنچے۔ جنرل برکی، جنرل اعظم، اور جنرل خالد شیخ۔ انہوں نے میری طرف سے مرزا سے کہا: "مجھے افسوس ہے کہ آپ نے اپنے طور طریقے میں سمجھ داری سے کام نہیں کرتے، اور آپ کی ذات کے دو دار نہیں ہیں۔ اب کیا کیا جائے؟ یہ پاکستان کے مفاد کا معاملہ ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ وقت کا تقاضا پورا کریں گے۔"

غرض سکندر مرزا کو صورت حال کی نزاکت کا احساس ہو گیا، اور انہوں نے اقتدار سے دستبردار ہونا منظور کر لیا۔

آسٹریلیا کے ہائی کمشنر میجر جنرل کا تھورن نے جو سکندر مرزا کے پرانے دوست تھے، مجھ سے پوچھا کہ سکندر مرزا کہاں جا رہے ہیں۔ میں نے بتایا کہ وہ انگلستان جانا چاہتے ہیں۔ ان کے لیے وہاں مکان تلاش کیا جا رہا ہے۔ اور ان کے لندن جانے کے لیے موزوں ہوائی جہاز کا انتظام بھی ہو رہا ہے۔

چار یا پانچ روز تک ہمیں کوئی ہوائی جہاز نہ مل سکا۔ ہمیں خدشہ ہوا کہ اگر وہ کراچی میں رہے تو لوگ شاید بھڑک اٹھیں اور صورت حال خراب ہو جائے۔ چنانچہ ہم نے ان سے کہا کہ آپ کوئٹہ چلے جائیں۔ وہ مان گئے، اور ہم نے ہوائی جہاز کے ذریعے انہیں وہاں بھجوا دیا۔ کا تھورن نے کہا: "میں ان سے ملنا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا: "آپ جب چاہیں شوق سے مل سکتے ہیں اور چاہیں تو ان کے ہمراہ بھی جا سکتے ہیں۔ وہ کوئی قیدی تھوڑا ہی ہیں۔"

میرا خیال ہے کہ وہ ان سے ملنے کراچی ایئر پورٹ پر گئے تھے۔ آخر کار جب سکندر مرزا انگلستان روانہ ہونے لگے تو انہیں ماری پور کے ہوائی اڈے پر کچھ گھنٹے انتظار کرنا پڑا۔ ان کے بہت سے دوست ان سے ملنے گئے، اور انہیں الوداع کہی۔

مجھے یہ فیصلہ کر کے بہت دکھ ہوا تھا اور میرا دل سکندر مرزا کے لیے بھی کڑھا تھا۔ کیسی بد قسمتی کی بات ہے کہ انہوں نے کسی کے ساتھ بھی وفا نہیں کی۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ میرا سکندر مرزا پر اعتماد کرنا بے محل تھا۔ لوگوں کو اکثر حیرانی ہوتی ہے کہ مجھے یہ احساس کیوں نہیں ہوا کہ وہ ایسے آدمی نہیں تھے جو انقلاب کے مقاصد کو سر انجام دے سکتے۔ لیکن جب تک وہ وزارت دفاع کے سیکرٹری رہے وہ فیصلے کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگاتے تھے۔ اور جہاں ان کے ذاتی مفاد پر زد نہیں پڑتی تھی وہ بڑی تیزی اور ہوشیاری سے کام کرتے تھے۔ چنانچہ مجھے ان کی ذات سے یہ امید رکھنا کہ وہ ہماری حمایت کے ساتھ ملک کے لیے ایک مفید سربراہ ثابت ہوں گے، کچھ زیادہ بے جا بھی نہ تھا۔ آخر

ان کا تجربہ دوسرے سیاست دانوں سے کہیں زیادہ وسیع تھا۔ سارے سیاست دان آزمائے جا چکے تھے اور محض خام نکلے۔ سول کے لوگوں میں ان کے علاوہ اور تھا ہی کون۔

یہی وجہ تھی کہ میں سکندر مرزا پر اعتماد کئے گیا حالانکہ اور سب ان سے ناامید ہو چکے تھے لیکن یہ میری طبیعت کی افتاد ہے۔ میں زندگی میں بڑی بڑی مشکلات کا سامنا کر سکتا ہوں۔ لیکن کسی کے ساتھ درشت یا غیر مہذب طریقے سے پیش نہیں آسکتا۔ میں اسی وقت قدم اٹھاتا ہوں، جب میرا صبر جواب دے چکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات ایسے معاملوں میں میرا اقدام بروقت نہیں ہوتا۔

اب مجھے اس بات کا یقین ہو گیا ہے کہ اگر سکندر مرزا سیدھی راہ جانا بھی چاہتے تو وہ ان حالات کی تاب نہ لا سکتے جو اصلاحات جاری کرنے کے بعد پیدا ہوئے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان کا اپنے عہدے پر رہنا کچھ مفید ثابت نہ ہوتا وہ خود کو ان تبدیلیوں کے مطابق ڈھال سکتے۔

مارشل لاء کے دوران میں ایک مرتبہ میں نے اخباری نمائندوں سے کہا تھا "میری کیفیت اس شخص کی سی ہے جو جلدی میں ہو۔ کام بہت زیادہ ہیں اور وقت بہت تھوڑا!" میرا مقصد یہ نہ تھا کہ لوگ ہر بات میں مجھ پر انحصار کریں اور سارے اختیار میرے ہاتھ میں ہوں۔ بلکہ خود کام کریں، وہ جتنی جلدی اپنے آپ کام کرنا سیکھ جائیں اتنا ہی بہتر ہو گا۔ یہی وجہ تھی کہ میں جلد سے جلد مارشل لاء کو ختم کرنا اور آئینی حکومت قائم کرنا چاہتا تھا۔ ملک کو بعض بڑی بڑی اصلاحات کی سخت ضرورت تھی۔ مارشل لاء تو بس ان اصلاحات کا نقطۂ آغاز تھا۔ بلاشبہ اگر کوئی ان اصلاحات میں مزاحم ہوتا تو اس کے خلاف سخت کارروائی کی جاتی لیکن خوش قسمتی سے ایسا کوئی موقع ہی نہیں آیا۔

مثال کے طور پر یہ دیکھئے کہ لوگوں نے اپنی چھپی ہوئی دولت کا جس پر انہوں نے ٹیکس نہیں دیا تھا، کس قدر رغبت سے اعلان کر دیا۔ انہوں نے ایک ارب ستر کروڑ روپے کی رقم کا اعلان کیا تھا۔ میں نے ایک تاجر سے پوچھا "تم نے ایسا کیوں کیا؟"

اس نے جواب دیا: "میں نے آپ کا فوٹو دیکھا جس میں آپ اپنی انگلی سے یوں اشارہ کر رہے تھے۔ اور آپ اپنے ہونٹ یوں سکیڑے ہوئے تھے۔ میں نے دل میں کہا، بابا یہ آدمی ہمارا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔ اگر ہم نے اس کی بات نہ مانی تو ہماری شامت آ جائے گی۔ ہم سب نے مل کر فیصلہ کیا کہ اس کی بات مان ہی لو۔ اور پھر ہمیں انکم ٹیکس بھی تو ۷۵ فیصد کے بجائے ۲۰ فیصد ادا کرنا تھا۔ اسلئے ہم نے سوچا کہ یہ سستے چھوٹے!"

آخر میں اس نے کہا "آپ نے خود تو جنٹل مین نہ تھا، مگر وہ فوٹو کام کر گیا۔"

(۷)

مارشل لا

مارشل لا کے فوری مقاصد بھی تھے اور طویل المیعاد مقاصد بھی۔
ایک فوری مقصد یہ تھا کہ حکومت کے سول اور آئینی اداروں کو بحال کیا جائے جو ایک عرصے کے غلط اور خود غرضانہ استعمال کے باعث ناکارہ اور بے جان ہو چکے تھے۔ ان کو مارشل لا کی طرف سے تقویت کی ضرورت تھی تاکہ وہ آئین کے تحت پھر سے اپنے اپنے اصلی کاموں میں مصروف ہو جائیں۔
اس زمانے میں فوج کو بعض اہم مقاموں پر متعین کیا گیا تھا جہاں سے اس کو ضرورت کے وقت بلایا جا سکتا تھا۔ انقلاب کے ابتدائی دنوں میں جب لوگوں کو فوج کہیں نظر نہ آئی تو ان کو کچھ حیرانی سی ہوئی۔ لفظ "انقلاب" کا مطلب ہے سول کی جگہ فوج کا یا کم از کم ایک "خاص" اقتدار کا عمل دخل ہو جانا۔ یہ تبدیلی درحقیقت رونما تو ہو چکی تھی، مگر میں نہیں چاہتا تھا کہ اس کا مظاہرہ ہو۔ لازم تھا کہ فوج کو پس منظر میں رکھا جائے کیونکہ ملک کی عام زندگی میں فوج کا اصل مقام وہی ہے۔ اگر فوج کا براہ راست سول انتظام میں دخل ہو جاتا تو اس سے سول اقتدار کی حالت اور پتلی ہو جاتی، اور وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا۔ علاوہ ازیں فوج کو شہری زندگی سے واپس بلانے میں بھی بڑی دشواری پیش آتی۔ مجھے تو اس امر میں بھی شک نہیں کہ اگر فوج سول انتظام کے چلانے میں کچھ زیادہ مشغول ہو جاتی یا اسے ملک کے اقتصادی، سماجی یا سیاسی معاملات میں کچھ زیادہ الجھ جاتی، تو اس کی اپنی افادیت غارت ہو جاتی۔
انقلاب کے طویل المیعاد مقاصد میں ایسی بڑی بڑی اصلاحات کا جاری کرنا شامل تھا جن کے ذریعے ملک کی سماجی اور اقتصادی زندگی میں ابتری اور ناہمواری کو دور کیا جا سکے۔ ان اصلاحات کی غایت ملک میں ایک مناسب آئین کا اجرا اور آئینی زندگی کی بحالی تھی۔
ایک مرتبہ مجھے یہ مشورہ دیا گیا کہ آپ اصلاحات کے ساتھ ساتھ ایک عارضی آئین کیوں نہیں جاری کر دیتے جو کام چلاؤ قسم کا ہو۔ اس سے اس وقت تک کام لیا جائے جب تک کہ

مستقل آئین نافذ نہیں ہو جاتا، مگر میں نے اسے خطرناک تصور کیا۔ مارشل لا بھی تو ایک قسم کا کام چلاؤ آئین ہی تھا۔ اس کے اُٹھ جانے سے پہلے ملک کے لیے ایک مستقل آئینی ڈھانچہ بن جانا ضروری تھا۔ میں نے دل میں کہا "جب ملک کو آئین ملے تو اسے ہر طرح مکمل ہونا چاہیے۔"

فوری اور کم مدت والے مقاصد کو حاصل کرنے میں مجھے چھ مہینے سے زیادہ عرصہ نہیں لگا۔ سول انتظام کا بنیادی ڈھانچہ مضبوط تھا۔ اس کو بس آزادی و خوداعتمادی کے احساس اور خارجی اثرات سے یکسوئی کی ضرورت تھی۔ سول داروں نے قابل تعریف طور پر وقت کے تقاضے کو پورا کیا۔ وہ تھوڑے ہی عرصے میں اپنے فرائض منصبی مستعدی سے بے کھٹکے انجام دینے لگے۔ لیکن فوج میں یہ احساس پایا جانے لگا کہ ترقی کی رفتار زیادہ تیز نہیں ہے۔ لوگ اتنی زیادہ خوشی نہیں دکھا سکے جتنی کہ انہیں دکھانی چاہئے تھی، اور یہ خیال بھی کہ عوام میں مایوسی پیدا ہونی شروع ہو گئی ہے۔

میں نے ان سے کہا: "آپ لوگ ایک ایسے نظام کے عادی ہیں جس پر ملک اپنی پائی پائی خرچ کر دیتا ہے۔ آپ کو اچھے سے اچھا ساز و سامان اور اسلحہ دیئے جاتے ہیں تاکہ وقت آنے پر آپ سو فیصدی حسن و خوبی کے ساتھ اپنے فرائض انجام دے سکیں۔ اس لئے کہ ملک کی بقاء اسی پر منحصر ہے۔ مگر باوجود ان تمام سہولتوں، ساز و سامان اور اعلیٰ ٹریننگ کے آپ کی ہر مشق پر کتنی نکتہ چینی کی جاتی ہے۔ آدمیوں کو ان باتوں میں صبر سے کام لینا چاہیئے۔ آپ کی زندگی منظم زندگی ہے۔ ایک سول افسر کو اختیار ملے تو وہ بھی اپنا کام حسن و خوبی سے کرنے لگتا ہے۔ مگر اس کو ضابطے کی بندشوں کے اندر رہ کر کام کرنا پڑتا ہے، اور پبلک کی نگاہیں ہر وقت اس پر رہتی ہیں۔ اب اگر کسی شخص کے ساتھ ناانصافی ہوئی ہو تو کوئی افسر خواہ کتنا ہی چاہے فوراً اس کا مداوا نہیں کر سکتا۔ کیونکہ اس کو ضابطے کی پابندیوں کا پورا پورا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ اس وقت سول انتظام ستر (۷۰) فیصدی عملے سے کام چلا رہا ہے۔ اس پر زیادہ دباؤ نہیں ڈالا جا سکتا۔ اور پھر بعض لوگوں کی شکایتیں بھی تو جعلی اور ناواجب ہوتی ہیں۔"

یہ سن کر فوجی افسر چپ تو ہو جاتے مگر ان کی تشفی نہ ہوتی۔ ان کی سمجھ میں یہ بات نہ آتی کہ سول کارروائی قانون کی حدود کے اندر رہ کر ہی کی جا سکتی ہے، اور اس میں پبلک کی موافق اور مخالف دونوں قسم کی رائے کا لحاظ رکھنا پڑتا ہے۔ میں ان کو بتاتا کہ دیکھو ہم نے انقلاب کے ابتدائی دنوں میں دو فوری قدم اٹھائے۔ ہم نے مارشل لا کی دو دفعات جاری کیں۔ ایک دفعہ کی رو سے کھانے پینے کی چیزوں میں ملاوٹ کرنا جرم قرار دیا گیا، اور دوسری دفعہ کی رو سے

بلیک مارکیٹ کرنے والوں کو سخت سزا کا مستوجب ٹھہرایا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مٹھائیاں ڈیڑھ روپے فی سیر کے بھاؤ بکنے لگیں۔ اور کھانے پینے کی چیزوں میں ملاوٹ بالکل بند ہو گئی۔ لیکن دو ہی ہفتے کے اندر سارا مال ختم ہو گیا، اور کاروبار ختم ہو گیا۔ قیمتوں پر کنٹرول رکھنے کی بھی بڑی واہ واہ ہوئی اور ہر شخص نے کراکری اور کٹلری، گھڑیاں دھڑا دھڑ سستے داموں خریدنی شروع کر دیں لیکن جب مال ختم ہو گیا تو ادھر جہاں سے آتا تھا تاجروں کو اندر روپیہ لگانے کی ہمت نہ پڑی۔

مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ فوج کے بڑے افسروں کی ایک میٹنگ ہوئی۔ اس میں مجھے ایک مقالہ پیش کیا گیا، جس میں بتایا گیا تھا کہ ملک میں کس طرح ہر کام غلط طریقے پر ہو رہا ہے۔ کمانڈر انچیف جنرل موسیٰ بھی اس میٹنگ میں شریک تھے۔ میں نے ان سے پوچھا: "کیا آپ کے بھی وہی خیالات ہیں جو اس مضمون میں ظاہر کیے گئے ہیں؟"

انہوں نے جواب دیا: "ہاں ہم سب ایسا ہی سمجھتے ہیں۔"

میں نے کہا: "آج جب یہ مضمون مجھے پڑھنے کو دیا گیا تو میں چائے پی رہا تھا۔ میں نے اسے پڑھا تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ بس پاکستان کا خاتمہ ہونے والا ہے۔ اس کے بعد میں نے صبح کا اخبار پڑھا۔ اس میں کسی اطالوی نے یہ پیش گوئی کی تھی کہ کل قیامت آنے والی ہے۔ قیامت آئی کہ نہ آئی اس کی تو مجھے خبر نہیں البتہ جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے وہ زندہ و پائندہ ہے اور کوئی شخص بھی اس کی ترقی کو نہیں روک سکتا۔"

اس سے انہیں ذرا مایوسی ہوئی۔ لیکن میں فوجی افسروں کو بتانا چاہتا تھا کہ وہ معجزوں کی توقع نہ کریں۔ شروع شروع میں لوگوں نے جو جوش و خروش دکھایا تھا، اس سے انہیں بڑی خوشی ہوئی تھی کہ جب اس جوش و خروش میں کمی آنے لگی تو اس سے انہیں تکلیف ہونے لگی۔ لوگ بیشتر فوری نتائج کے خواہاں ہوتے ہیں۔ جب پاکستان قائم ہوا تو انہوں نے سمجھا کہ بس اب زندگی کی ساری کلفتیں دور ہو گئیں۔ اسی طرح جب انقلاب آیا تو انہوں نے خیال کیا کہ بس راتوں رات کایا پلٹ ہو جائے گی۔ حالانکہ انقلاب ان حالات کا لازمی نتیجہ تھا، جو ملک میں رونما ہو رہے تھے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہ تھا کہ بس ساری گتھیاں سلجھ گئیں۔ اس کا مطلب صرف اتنا تھا کہ ہمیں ان گتھیوں کو مستعدی سے حقیقت پسندانہ طریق سے سلجھانے کا ایک اچھا موقع مل گیا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھانا عوام کا کام تھا۔ انہیں ضرورت تھی تو بس محنت مشقت کی، اخلاص کی، صبر و تحمل کی۔ صبر و تحمل آسانی سے ہاتھ آنے والی چیز نہیں، ورنہ بغیر کوشش کے محنت مشقت کی عادت پڑ سکتی ہے۔

مجھے حیرت انگیز کامیابیوں کی نہ توقع تھی نہ طلب۔ عوام کے جوش و خروش کو بہ آسانی سنسنی پیدا کرنے والے طریقوں سے برقرار رکھا جا سکتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ بعض لوگوں کو انقلابی حکومت سے کچھ اسی قسم کی توقعات تھیں، اور اگر میں عوام کو اس قسم کے تماشے دکھا کر خوش رکھنے کی ترغیب کا شکار ہو جاتا تو اس سے قومی جوش و خروش کا رخ غلط راہوں کی طرف پھر جاتا۔ چنانچہ میں اس کے لیے پہلے سے تیار تھا کہ عوام کو کسی قدر بے اطمینانی ہوگی، اور فوج میں بھی کچھ مایوسی پھیلے گی۔ میں نے تہیہ کر رکھا تھا کہ انقلاب کے حقیقی اور طویل المیعاد مقاصد کو نظر میں رکھتے ہوئے معتدل اور معقول طریق پر اپنا کام جاری رکھوں گا۔

عوام کے اس رد عمل کا خیال رکھتے ہوئے میں نے اصلاحات جاری کرنے کے ٹائم ٹیبل کی ایک میعاد مقرر کر دی۔ میں نے سوچا کہ مجھے تقریباً دو سال کے اندر اندر اپنا پورا پروگرام شروع کر دینا چاہیئے۔ اس وقت تک آئین کے اجراء کے لیے بھی ہموار ہو جائے گی۔ مجھے سب سے پہلے اصلاحات اراضی نافذ کرنے اور مہاجرین کے مسئلے کو حل کرنے کی فکر تھی۔ اس کے بعد میرے مد نظر وہ اصلاحات تھیں جو تعلیم کے انتظام و انصرام سے تعلق رکھتی تھیں۔ ملک کے قانونی نظام پر نظر ثانی کی ضرورت تھی اور ثقافت کو کسی قاعدے قانون کے تحت لانا بھی ضروری تھا۔ علاوہ ازیں ملک کی سماجی اور سیاسی زندگی کے سارے ڈھانچے کو جمہوری اصولوں کے تحت از سر نو منظم کرنے کی ضرورت تھی، تاکہ عوام تعمیری اور بامقصد طریق پر ملکی معاملات میں حصہ لے سکیں۔

میں جانتا تھا کہ انقلاب کے مقاصد طاقت کے بل پر حاصل نہیں کیے جا سکتے۔ بے شک ہمیں ان لوگوں کے خلاف جو بے راہ رو ہو جائیں، تادیبی کارروائی کرنے کی ضرورت تھی، لیکن ساتھ ہی عوام کو خود مختاری اور عقل مندی سے سوچنے اور کام کرنے کی آزادی بھی ہونی چاہیئے تھی۔ آپ لوگوں کے رویے کو جبر سے نہیں بدل سکتے۔ جبر مقابلے کی دعوت دیتا ہے اور آپ آئے دن اور زیادہ سختی کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تشدد اپنی انتہا کو پہنچ جاتا ہے، اور طاقت کے استعمال کی مستقل اور مسلسل طور پر ضرورت ہے۔ سماجی طور طریقے صرف سمجھانے بجھانے اور تعلیم ہی سے بدلے اور سدھارے جا سکتے ہیں۔ ہم نے مارشل لاء کے ابتدائی مہینوں میں بعض معیار قائم کر دیئے اور لوگوں کو دکھا دیا کہ ملکی معاملات کو کس طرح انجام دینا چاہیئے لیکن عوام کو خود یہ سیکھنا ضروری ہے کہ اپنے کاموں کو کس طرح انجام دیں۔

اس زمانے میں مجھ سے یہ بھی کہا گیا کہ آپ سیاست دانوں سے، جن کے ہاتھوں ملک کی یہ گت بنی ہے، بہت نرمی برت رہے ہیں۔ انہیں چند سال کے لیے سیاست سے علیحدہ کر دینا

ہی کافی نہیں ہے۔ انہیں جب بھی موقع ملے گا وہ یہی ہتھکنڈے پھر شروع کر دیں گے۔ لیکن حقیقت میں مجھے افراد سے نہیں نمٹنا تھا۔ عام دستور کے مطابق کچھ لوگوں کا صفایا کیا جا سکتا تھا لیکن اس سے ان اصلی کمزوریوں یا ان سماجی اور سیاسی حالات کا خاتمہ نہ ہو سکتا، جس کے یہ سیاستدان محض ایک علامت تھے۔ جب تک یہ حالات باقی رہیں گے ان سیاست والوں کی خالی کی ہوئی جگہیں ان ہی جیسے اور لوگوں سے پر ہوتی چلی جائیں گی۔

افراد کے ساتھ سختی اور تشدد کا سلوک روا رکھنا صرف سختی اور تشدد کی مثالیں قائم کرنا ہے۔ اس طرح سیاسی انتقام کا ایک ختم نہ ہونے والا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ میرے سامنے مسائل تھے افراد نہ تھے۔ جب کبھی کسی ملک میں دہشت پسندی، خصوصاً سیاسی دہشت پسندی راہ پا لیتی ہے تو پھر اسے لوگوں کی رگ و پے میں سے نکالا نہیں جا سکتا۔ یہ جرم کر دہ جاتی ہے ایک مرتبہ یہ صورت رونما ہو جائے تو تہذیب کی اوپری صیقل اتر جاتی ہے اور انسان کی نہایت ابتدائی، حیوانی خصلتوں کو باہر نکلنے کا راستہ مل جاتا ہے۔ سیاسی ظلم و ستم کے زخم کا نشان ہمیشہ باقی رہتا ہے۔

انقلاب کا رخ آسانی سے ایک بھول بھلیاں کی طرف پھر سکتا تھا۔ جس میں نہ تو آگے بڑھا جا سکتا تھا اور نہ پیچھے لوٹا جا سکتا تھا۔ میں دنیا پر یہ ثابت کرنا نہیں چاہتا تھا کہ لو دیکھو میں کیسا اچھا انتظام کر سکتا ہوں۔ میں تو بس ایسے حالات پیدا کرنے اور ایسے ادارے قائم کرنے کا خواہاں تھا جس سے یہ ظاہر ہو کہ ملک خود اپنا انتظام کتنی اچھی طرح کر سکتا ہے۔ اس کے لیے لازمی تھا کہ عوام کو انقلاب کے مقاصد کا ہم خیال اور حامی بنایا جائے تاکہ ملک اپنے زور پر خود بخود آگے بڑھتا چلا جائے۔ ضروری بات یہ تھی کہ عوام کو انقلاب کے فوائد کا احساس، اور ان کے دلوں میں اپنے معاملات کو خود انجام دینے کا جذبہ پیدا ہو۔

مارشل لاء جاری ہونے کے بعد جلد ہی میں نے سول اور مارشل لاء کے حکام کے باہمی رشتہ کو واضح کر دیا۔ مقصد یہ تھا کہ ان میں آپس میں غلط فہمی نہ ہونے پائے، اور دونوں طرف کے حکام ایک ہی طرح کے کام نہ کرنے لگیں جس سے گڑبڑ اور پست ہمتی پیدا ہو سکتی تھی۔ میں نے یہ بھی جتا دیا کہ سول انتظام کے ذمہ دار صوبائی گورنر ہیں اور یہ دیکھنا ان کا کام ہے کہ ان کے افسر اپنے فرائض خلوص، دیانت داری اور تیزی سے انجام دے رہے یا نہیں۔ میں نے انتظام کے بنیادی ڈھانچے کو جوں کا توں رہنے دیا، ایک کابینہ منتخب کی، اور مارشل لاء نیز دونوں صوبوں کے عام ضابطے کے تحت، اپنے پروگرام پر عملدرآمد

شروع کر دیا۔

مارشل لاء کا اولین مقصد انتظام کی بحالی میں مدد دینا تھا تاکہ وہ ان نئے مسائل سے نمٹ سکے جو اصلاحات کے جاری ہونے سے پیدا ہوں۔ اس مدد کی صورت یہ تھی کہ اگر عام قوانین میں کہیں خامی ہو تو اسے مارشل لاء کی دفعات سے پورا کر دیا جائے، اور انتظام کے معاملے یا شورش والے علاقوں میں گشت کرنے میں تعاون کیا جائے۔ خاص اور ہنگامی عدالتیں حسب ضرورت قائم کی جائیں۔ عام اصول یہ بنایا گیا کہ مارشل لاء کی خلاف ورزی اور خلاف حکومت اور سماج دشمن کارروائی کرنے والے مقدمات فوجی عدالتوں میں پیش کیے جائیں۔ گورنروں اور مارشل لاء کے منتظمین میں اکثر و بیشتر ملاقاتیں ہوا کرتی تھیں تاکہ وہ آپس میں تبادلۂ خیال کر کے ایک دوسرے کی رہنمائی اور مدد کر سکیں۔

انقلاب کے ابتدائی سال کئی لحاظ سے نہایت کامیاب اور نتیجہ خیز ثابت ہوئے۔ نئے نظام کو سارے ملک کے عوام کی بھرپور حمایت حاصل رہی۔ عوام کے جوش و خروش نے ہماری ہمتیں بندھائے رکھیں۔ ہم نے جو قدم بھی اٹھایا عوام نے بلا تامل ہمارا ساتھ دیا۔ میں نے اس صورت حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بغیر کسی تاخیر کے اپنے پورے اصلاحی پروگرام کو ملک میں جاری کر دیا۔

ان دنوں ہماری کابینہ کے اجلاس اکثر ہوتے رہتے تھے۔ مجھے پہلا اجلاس بخوبی یاد ہے جو ۲۷ اکتوبر ۱۹۵۸ء کو ہوا تھا۔ جب جلسے کی کارروائی شروع ہوئی تو دوپہر کا وقت تھا۔ میں نے کابینہ کے اراکین کو تفصیل کے ساتھ بتایا کہ ۷ اکتوبر ۱۹۵۸ء سے پہلے ملک کی کیا حالت تھی۔ اس کے بعد میں نے ان مسائل کا خاکہ کھینچا جن سے ہم دوچار تھے۔ سب سے پہلے اس بات کی ضرورت تھی کہ ملک کی اقتصادی زندگی کو مضبوط بنایا جائے۔ پہلے اقتصادی معاملات طے کرنے میں اقتصادی اور مالی امور کا کم اور سیاسی و مقامی امور کا زیادہ لحاظ رکھا جاتا تھا۔

دوسرا مسئلہ خوراک کی کمی کا تھا۔ ہمارے پاس نہ تو زمین کی کمی تھی، اور نہ کام کرنے والوں کی۔ اس لیے ہم بہ آسانی خوراک کے معاملے میں خود کفیل بن سکتے تھے۔ ضرورت تھی تو بس صحیح سمت رہنمائی کی۔ ہم نے زرعی اصلاحات کا ایک کمیشن مقرر کر دیا تھا تاکہ زمین کی ملکیت اور کاشت کاری کے بارے میں منصفانہ طریقہ وضع کیا جا سکے۔ ملک کے تعلیمی نظام پر بھی توجہ دینے کی ضرورت تھی۔ ہمیں تعلیم کا ایک ایسا طریقہ رائج کرنا تھا جو لوگوں کی

ضرورتوں کو بھی پورا کرے اور ساتھ ساتھ قابل اور کارآمد شہری بھی پیدا کرے۔ اس کے لیے ہمیں تعلیم کو زیادہ عملی صورت دینے اور ایسا طریق انتخاب سوچنے کی ضرورت تھی جس کے ذریعے طلباء خود کو اعلیٰ تعلیم پانے کا اہل ثابت کر سکیں۔

وہ لوگ جو گھر سے بے گھر ہوئے، اور جنہیں تقسیم کے وقت ہجرت کرنی پڑی، ان کو آباد کرنے کا مسئلہ مدت سے جوں کا توں پڑا تھا۔ ان مہاجرین کی تکلیف کو دیکھتے ہوئے نیز ملکی اقتصادیات کو نظر میں رکھتے ہوئے اس مسئلے کو جلد سے جلد حل کرنا لازمی تھا۔

میرا خیال تھا کہ سول سروسوں کا عملہ ضرورت سے زیادہ ہے اور ملازمین کو تنخواہیں کم دی جاتی ہیں۔ وفاقی اور صوبائی سروسوں کی از سر نو تنظیم کی ضرورت تھی۔ اس لیے ایک "پے اینڈ سروسز کمیشن" اور ایک "ری آرگنائزیشن کمیشن" مقرر کرنا ضروری معلوم ہوتا تھا۔ جو ان معاملوں کی چھان بین کرے۔ جو سرکاری ملازم نااہل ہوں انہیں برطرف کر دیا جائے۔ ممکن ہے یہ اقدام سخت تصور کیا جائے لیکن ملکی انتظام کو بہتر اور مضبوط بنانے کے لیے ہمیں اس سے گریز کرنا لازم نہیں تھا۔

اس کے بعد میں نے کابینہ سے مارشل لاء کی ماہیت بیان کی۔ مارشل لاء ظلم ڈھانے یا سزا دینے کا آلہ نہیں بلکہ یہ ایک انتظام ہے جس کے تحت حکومت کو ملک میں بنیادی اصلاحات کے لئے چند غیر معمولی اختیارات مل جاتے ہیں۔ پاکستان کو مضبوط انتظام، مستحکم اقتصادیات اور ایک معقول معیار زندگی کی ضرورت ہے۔ نئے نظام نے ان مقاصد کو حاصل کرنے کا تہیہ کر رکھا ہے۔ عام تجارت اور کاروبار کو پھر سے استوار کرنے کی ضرورت ہے۔ اور کاروباری حلقوں میں جو خوف و ہراس پایا جاتا ہے اس کو دور کر کے تاجروں کا اعتماد بحال کرنا ضروری ہے۔

اس اجلاس میں مجھے بتایا کہ متعدد تاجروں نے ہمارے معافی نامے کی میعاد کے اندر اندر اپنی ناجائز طور پر درآمد کی ہوئی اشیاء ہمارے حوالے کر دی ہیں چنانچہ فیصلہ کیا گیا کہ انہیں کچھ سزا نہ دی جائے۔ اور ان کا مال محصول درآمد وصول کرنے کے بعد انہیں لوٹا دیا جائے۔ بعض علاقوں میں مارشل لاء کے حکام نے لوگوں سے کہا تھا کہ وہ اپنے انکم ٹیکس کے واجبات پندرہ روز کے اندر اندر ادا کر دیں۔ مجھے بتایا گیا کہ ممکن ہے بعض لوگوں کو اس حکم کی تعمیل میں اپنی دکانیں وغیرہ بیچ دینی پڑیں۔ میں نے خیال کیا کہ حکم واقعی سخت ہے اور ادائیگی کی میعاد تین مہینے کر دی۔

پاکستانی باشندوں نے دوسرے ملکوں میں جو زرمبادلہ جمع کر رکھا تھا، اس کو وطن میں

لانے کے سوال پر بھی غور کیا گیا۔ میں ایک ایسا ادارہ بنانا چاہتا تھا جس سے اس سرمائے کو قبضے میں لایا جا سکے۔ مختلف وزارتوں اور صوبائی حکومتوں میں کمیٹیاں بنائی گئیں، جو نااہل اور رشوت خور افسروں کے معاملوں کی چھان بین کریں۔ میں ایسا نظام بھی چاہتا تھا کہ اچھے اور قابل سرکاری ملازموں کو انعامات دیئے جا سکیں۔ میں نے کابینہ کے اراکین کو مشورہ دیا کہ آپ سستی شہرت حاصل کرنے کے لیے عوام سے لمبے چوڑے وعدے نہ کریں۔ لوگوں کو بتایا جائے کہ وہ معجزوں کی توقع نہ رکھیں۔ معجزے اسی وقت رونما ہو سکتے ہیں کہ ملک کا بچہ بچہ کمر ہمت باندھ کر تن من دھن سے وطن کی خدمت میں لگ جائے۔

مارشل لاء کے تحت جو گرفتاریاں عمل میں آئی تھیں، ان کو حد سے زیادہ شہرت دی جا رہی تھی جس کی وجہ سے ملک میں خوف و ہراس پھیل رہا تھا۔ میں نے کہا ہمیں کوشش کرنی چاہیئے کہ ملک کے حالات معمول پر آجائیں اور کسی کو یہ خیال نہ ہو کہ معمولی خطا پر بھی سختی سے باز پرس کی جائے گی۔ ہمیں ایسا طریقہ سوچنا چاہیئے جس سے ان تمام لوگوں کے معاملوں پر جنہیں مارشل لاء کے تحت گرفتار کیا گیا نظر ثانی کی جا سکے۔

کابینہ کے ان اجلاسوں میں جو بحث مباحثے ہوتے رہتے تھے میں ان کے متعلق کچھ باتیں بطور یادداشت لکھ لیا کرتا تھا۔ ذیل میں ان کے اقتباسات سے آپ کو ہماری مصروفیات کا اندازہ ہو سکے گا۔

یکم نومبر

میں نے مالی معاملات پر اور زیادہ قابو رکھنے کی ضرورت پر زور دیا۔ صنعتی ترقیاتی کارپوریشن کی سرمایہ لگانے کی پالیسی پر بحث ہوئی۔ فیصلہ کیا گیا کہ جب تک کارپوریشن گورنمنٹ سے پہلے منظوری نہ لے لے سرمایہ لگانے کے بارے میں کوئی معاہدہ نہ کرے۔ میں نے ۱۹۵۴ء کی دستاویز میں جو خیالات قلمبند کیے تھے ان کو نظر میں رکھ کر خودمختار اداروں کے آئندہ ڈھانچے پر غور کیا۔ سرکاری محکموں کا عام طریق کار سخت پابندیوں میں جکڑا ہوا ہے۔ لال فیتے کی گرفت بہت زیادہ ہے۔ زراعتی اور صنعتی ترقی کی ضرورتوں کا تقاضا ہے کہ ایسے خاص ادارے قائم کیے جائیں جنہیں اپنے طریق کار خود وضع کرنے کا اختیار اور آزادی ہو۔ ان خودمختار اداروں کو خاص خاص کام سونپے جائیں۔ اور انہیں تکمیل تک پہنچانے کے لیے وسائل مہیا کیے جائیں نیز ان کے کام میں کم سے کم دخل دیا جائے۔ ترقی کی رفتار کو قائم رکھنے کا یہی ایک طریقہ ہے۔ ملک میں آئین کے جاری ہونے سے پہلے ان اداروں کا کام میں مصروف ہو جانا ضروری ہے۔ یہ اس

بات کی ضمانت ہو گی کہ ترقی کے کام بغیر سیاسی رکاوٹوں کے جاری رہیں گے۔

۱۷ نومبر

میں نے کابینہ میں ذکر کیا کہ ہمیں قائد اعظم کے مقبرے کی تعمیر کا کام شروع کر دینا چاہیئے۔ میں نے مس فاطمہ جناح سے درخواست کی کہ آپ اس کمیٹی کی سرپرستی فرمائیں جو اس مقصد کے لیے قائم کی گئی ہے۔

پچھلی حکومتیں لوگوں کو روزانہ اور ہفتہ وار اخبار نکالنے کی اجازت دینے میں کچھ تامل نہ کرتی تھیں۔ بعض دفعہ ایسے لوگوں کو اجازت دے دی جاتی تھی جن کے پاس اخبار چلانے کے لیے کافی سرمایہ نہ ہوتا تھا۔ نتیجہ یہ کہ وہ روزی کمانے کے لیے بلیک میل کرنے یعنی دھونس جما کر روپیہ اینٹھنے پر مائل ہوتے تھے۔ ہمارے اخبارات کو صحت مند اور ذمہ دار ہونا چاہیئے۔

ضرورت ہے کہ ہمارے سول اور ملٹری افسر ایک دوسرے سے واقفیت پیدا کریں۔ نوجوان سول افسروں کو اپنی اپنی درس گاہوں سے تعلیم ختم کر چکنے کے بعد دو دو تین تین مہینے کے لیے فوج سے وابستہ کر دینا مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ اس سے انہیں فوج کے طور طریقوں سے آگاہ ہونے کا موقع بھی مل سکے گا، اور وہ فوجی نظم و ضبط سے بھی فائدہ اٹھا سکیں گے۔

۴ دسمبر

میں نے کابینہ سے کہا کہ ہمیں جموں اور کشمیر کے مسئلے کے بارے میں اپنی مثبت پالیسی کی وضاحت کر دینی چاہیئے۔ ہمیں اس بات پر بھی غور کرنا چاہیئے کہ اس جھگڑے کے منصفانہ اور آبرومندانہ حل کے لیے کیا قدم اٹھایا جائے۔ یہ مسئلہ ایک مرتبہ وہاں کے عوام کی خواہش کے مطابق حل ہو گیا تو اس خطۂ دنیا میں امن قائم رہ سکے گا۔

لوگوں کو زرعی اصلاحات کے لیے تیار کرنا بھی ضروری ہو گا۔ ان اصلاحات سے کسی کو ڈرنا نہیں چاہیئے کیونکہ یہ سائنٹیفک اور حقیقت پسندانہ ہوں گی اور جن لوگوں پر ان کا اثر پڑے گا حکومت ان کے ساتھ پورا پورا انصاف کرے گی۔

میں نے اجلاس میں ذکر کیا کہ میں ۲۵ دسمبر کو قائد اعظم کی سالگرہ کے موقع پر ایک تقریر نشر کرنے والا ہوں۔ اس موقع پر میں لوگوں کو ان کی ذمہ داریاں یاد دلاؤں گا۔ ہم ایک نئی زندگی کا آغاز کر رہے ہیں۔ یہ بات ہر ایک پر واضح ہو جانی چاہیئے کہ یہ حکومت کسی ذاتی فائدے کی غرض سے برسر اقتدار نہیں آئی۔ اس کی کامیابیوں کا انحصار محنت مشقت پر ہو گا جو ہم سب اپنی اپنی جگہ اور ساتھ مل کر کریں گے۔ انفرادی طور پر ہمیں چاہیئے کہ ہم اپنے اعمال

چیئرمین ماؤزے تنگ کے ساتھ نیشنل پیپلز کونسل ہال میں
۴ مارچ ۱۹۶۵ء

کا جائزہ لیں، اور پاک بازی اختیار کریں۔ اجتماعی طور پر ہمیں یہ حصول سامنے رکھنا چاہیے کہ ہم سے کوئی بات ایسی سرزد نہ ہو جس سے ملک کو نقصان پہنچا ہو۔ ہمیں اپنے ملک کی حفاظت صرف فوج اور اسلحہ کے ذریعے ہی نہیں کرنی ہے، بلکہ ان خیالات کو مٹانا بھی ہمارا فرض ہے جو پاکستان دشمنی پر مبنی ہوں۔

مستقبل کے آئین کے بارے میں بھی مجھے کچھ باتیں عوام کے ذہن نشین کرنی ہیں۔ نئی حکومت اس بات کی خواہش مند ہے کہ ملک میں ایک پوری طرح نمائندہ حکومت قائم ہو جائے اس کی بنیاد ایک ایسے جمہوری نظام پر ہو جس کو لوگ سمجھ سکیں اور چلا سکیں۔ ہمیں سیاسی ناہمواری سے بھی بچنا چاہیے۔ جیسے ہی یہ بڑے بڑے مسئلے حل ہو گئے اور اصلاحات جاری کر دی گئیں، ملک کے لائق فائق لوگوں سے جو آئین سازی میں مہارت رکھتے ہیں درخواست کی جائے گی کہ وہ ملک کے لیے آئین بنائیں۔ اس آئین میں عوام کی خواہشوں اور تمناؤں نیز ملک کے مفاد کا پورا پورا لحاظ رکھا جائے گا۔

ہمیں فوراً ایک تحریر تیار کرنی چاہیئے جس میں ہماری خارجہ پالیسی اور ہمارے مقاصد بیان کیے جائیں۔ دوسرے ملکوں سے ہمارے تعلقات کا انحصار ہمارے دفاعی تقاضوں نیز ترقی کے سلسلے میں ہماری ضرورت پر ہوگا۔ یہ لازماً ہمارے ملک کے جغرافیائی محل وقوع اور سیاسی تقاضوں پر بھی مبنی ہوں گے ہم اپنے دوستوں کا ہاتھ مضبوطی سے تھامے رہیں گے لیکن ساتھ ہی نئے دوست بھی تلاش کریں گے، خاص کر اپنے ہمسایوں میں۔

۲۴ دسمبر

معاہدۂ بغداد کی آئندہ صورت کیا ہوگی۔ میں نے اس کے بارے میں بے لاگ سوچ بچار کی درخواست کی

۳۱ دسمبر

میں نے کابینہ میں ذکر کیا کہ پاکستان کی تمام زبانوں کے لیے رومن رسم خط اختیار کرنا اس لحاظ سے مفید ہوگا کہ اس سے ایک تو خواندگی بڑھے گی، دوسرے ممکن ہے اس طرح سارے ملک کے لیے ایک مشترکہ زبان پیدا ہو جائے۔ میں چاہتا تھا کہ میرے رفقا اس مسئلے پر ٹھنڈے دل سے غور کریں۔

ملک میں متعدد وقف ہیں حکومت ان کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے کر ان کی آمدنی کو عوام کی بھلائی کے کاموں پر خرچ کر سکتی ہے۔ اسی طرح زکوٰۃ کی رقم کو بھی حکومت کے زیر اہتمام ایک جگہ جمع کیا جا سکتا ہے۔

وفاقی دارالحکومت کے لیے موزوں جگہ تلاش کرنے کے لیے جو کمیشن مقرر کیا گیا ہے میں چاہتا ہوں کہ وہ جلد اپنا کام ختم کرے۔ دارالحکومت کو کراچی سے ہٹا لینا ضروری ہے کیونکہ اس جگہ کی ہوا مرطوب اور مضر صحت ہے۔ علاوہ ازیں یہاں کاروبار کا بھی بڑا زور ہے جس سے سرکاری محکموں کو بددیانتی کی ترغیب ہوتی ہے۔

۱۰ جنوری ۱۹۵۹ء

بعض علاقوں سے اس امر کی برابر شکایتیں آ رہی ہیں کہ ان کی طرف پوری توجہ نہیں کی جا رہی۔ اس کا باعث یہ ہے کہ صوبائی انتظام کو مقامی انتظام سے علیحدہ نہیں کیا گیا ہمیں شہری اداروں کو اور زیادہ انتظامی اختیارات دینے ہوں گے

انتظامی اور سیاسی اصلاحات ہمارے آئندہ آئین میں مضمر اور اس کا جزو ہونی چاہئیں ہمیں اس معاملے پر غور شروع کر دینا چاہیے۔ ہمیں پہلے یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ ملک

کی حکومت پارلیمانی نظام کے تحت بہتر رہے گی یا صدارتی انتظام کے تحت. ملک کی مجلس قانون ساز کس قسم کی ہونی چاہیے اور کتنی بڑی ہونی چاہیے. ہر چند بالغ رائے دہی کا عالمی اصول منظور کیا جا چکا ہے. تاہم ہمیں ایک ایسا نظام وضع کرنا ہوگا، جس کے تحت عوام اپنے ووٹ دینے کے حق کو سمجھ بوجھ کے ساتھ استعمال کر سکیں.

اور یوں دن پر دن گزرتے گئے. سول محکموں کو دوبارہ استوار کیا گیا. فوج واپس بیرکوں میں چلی گئی. ایک ایک کر کے اصلاحات جاری کر دی گئیں، اور ہم ملک کے بنیادی سیاسی مسائل سے دست و گریباں ہو گئے.

(۸)

بنیادی اقدامات

۱۹۵۴ء کی دستاویز میں، میں نے کہا تھا: "جب تک ہم زرعی اصلاحات کو سائنسی ترقی میں نہ لائیں، ہمیں کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ صرف چند آدمیوں کے قبضے میں زمین کے وسیع رقبوں کے ہونے کا اب کوئی جواز نہیں رہا اور نہ بغیر معاوضے کے اراضی کے حصول کا جواز ہے۔" چنانچہ جب اکتوبر ۱۹۵۸ء میں مارشل لاء جاری کیا گیا، تو میں جانتا تھا کہ مجھے ابتداء میں کیا کیا کام کرنے ہوں گے۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ مختلف اصلاحات کو جاری کرتے وقت مجھے کیا قدم اٹھانا ہوگا۔ میں نے سکندر مرزا سے کہہ دیا تھا کہ اب جبکہ انقلاب رونما ہو گیا ہے، چند بنیادی تبدیلیاں ضرور کی جائیں گی اور کسی کو انقلاب کی راہ میں روڑے اٹکانے کی اجازت نہ ہوگی۔

۱۷ اکتوبر ۱۹۵۸ء کو میں نے ایک بیان جاری کیا جس میں میں نے کہا: "معلوم ہوتا ہے لوگ اس بات سے خائف ہیں کہ اگر مارشل لاء جلد ہٹا لیا گیا تو وہی پرانا نظام واپس آ جائے گا، ہر قسم کی برائیاں اور خرابیاں پھر شروع ہو جائیں گی، اور سب کیا دھرا خاک میں مل جائے گا۔ میں ان سب لوگوں کو یقین دلاتا ہوں کہ مارشل لاء کو نہ تو ضرورت سے ایک منٹ زیادہ رہنے دیا جائے گا اور نہ اس مقصد کی تکمیل سے ایک منٹ پہلے اٹھایا جائے گا جس کے لیے یہ نافذ کیا گیا ہے۔ اور وہ مقصد یہ ہے کہ ان تمام سیاسی، سماجی، اقتصادی اور انتظامی الجھنوں کو دور کیا جائے جو اب سے پہلے پیدا کر دی گئی تھیں۔ اگر ملک اس خستہ حالی سے پوری طرح بچ نہ جائے تو کم از کم پنپنے کی صورت ضرور پیدا ہو جائے۔ اس کے علاوہ ہمیں بعض بڑی اصلاحات بھی کرنی ہیں۔ ان سب باتوں کے لیے مارشل لاء کی سرپرستی کی ضرورت ہوگی۔"

میں نے اصلاحات کی ایک فہرست بنائی اور اپنے رفیقوں سے پوچھا کہ بتاؤ تمہارے

خیال میں ان سب میں سے کونسی اصلاح سب سے مشکل ہوگی۔ سب نے یک زبان ہو کر کہا زرعی اصلاحات۔ اس پر میں نے فیصلہ کیا کہ اچھا سب سے پہلے زرعی اصلاحات سہی۔

۱۸ اکتوبر ۱۹۵۸ء کو زرعی اصلاحات کا ایک کمیشن مقرر کیا گیا۔ ان اصلاحات کا اثر سات آٹھ ہزار خاندانوں پر پڑتا تھا۔ یہ خاندان بڑی اثر اور طاقتور تھے۔ چونکہ میں جانتا تھا کہ زمین ہمارے لوگوں کو بڑی پیاری ہے، اس لیے مجھے اس مزاحمت کے بارے میں کوئی غلط فہمی نہ تھی جس سے مجھے دوچار ہونا تھا۔ مجھے بھروسا تھا کہ اگر میں اس مرحلے میں کامیاب ہو گیا تو دوسری اصلاحات کو بروئے کار لانا نسبتاً آسان ہوگا۔

مغربی پاکستان میں اس وقت صورت حال یہ تھی کہ پنجاب میں پچاس فیصد سے اوپر قابل استعمال زمین، شمال مغربی سرحد میں پچاس فیصد سے ذرا کم اور سندھ میں اسی فیصدی سے زیادہ، چند ہزار زمینداروں کے قبضے میں تھی جو اپنی زمینوں سے دور شہروں میں رہتے تھے۔ سارے صوبے کے بارے میں جو اطلاع مل سکی اس سے ظاہر ہوا کہ مالکان زمین میں سے ۰.۱ فیصد کے قبضے میں زمین کا ۱۵ فیصد رقبہ فی کس پانچ سو ایکڑ سے اوپر والی املاک کی صورت میں تھا۔ اس کے بالمقابل ۶۵ فیصد ایسے زمیندار تھے جن کے پاس اسی قدر زمین فی کس پانچ ایکڑ سے بھی کم رقبے کی صورت میں تھی۔ ۱۹ کروڑ ۸۰ لاکھ کے کل جغرافیائی رقبے میں سے سرکاری رپورٹ کے مطابق قابل کاشت رقبہ صرف ۴ کروڑ ۲۰ لاکھ تھا۔ غیر معلومہ رقبہ جس کے بارے میں کوئی رپورٹ نہ تھی ریگستان اور دوسرے خاص رقبوں پر مشتمل تھا۔ اندازہ کیا گیا کہ "غیر معلومہ" رقبوں میں ۲ کروڑ ۲۰ لاکھ ایکڑ قابل کاشت زمین شامل ہے جس کو ملا کر مغربی پاکستان میں قابل کاشت زمین کا کل رقبہ ۸ کروڑ ۵۰ لاکھ ایکڑ ہو جائے گا۔ پنجاب، شمال مغربی سرحد اور سندھ کے پرانے صوبوں کی حکومتوں نے جس قسم کے قانون نافذ کیے تھے ان کے باعث یہاں زراعتی ترقی نہ ہونے کے برابر تھی۔

زمین کی ملکیت اور اس کے استعمال سے تعلق رکھنے والے قوانین اور روایات کا پیداوار پر براہ راست اثر پڑتا ہے اور انہی سے کھیتی باڑی کرنے والوں کا سماجی مزاج متعین ہوتا ہے۔ چنانچہ ملک کی اقتصادی ترقی اور سماجی نشوونما سے زرعی اصلاحات کا براہ راست تعلق ہے۔ پیداوار کی کمی اور کاشتکاروں کی عام بے حسی کا باعث زیادہ تر ہمارے زمینداری ڈھانچے کی خامیاں اور ان شرائط و ضوابط کا نقص ہے جن کے تحت زمین کاشت کی جاتی ہے۔

جب سے ملک آزاد ہوا، سیاست دان اس صورت حال میں تھوڑی بہت اصلاح
کی کوشش کرتے رہے، مگر کوئی مفید نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ انقلاب سے پہلے مغربی پاکستان میں
جو نام نہاد اصلاحات جاری کی گئی تھیں، ان کا مقصد سوائے ان رعایتوں کے برقرار رکھنے کے
جو زمینداروں کو حاصل تھیں، اور کچھ نہ تھا۔ جب کبھی زمین کی منصفانہ تقسیم کی کوشش کی جاتی
زمیندار سیاسی جماعتوں پر اپنا اثر ڈال کر انہیں رد کرا دیتے۔ یہاں تک کہ ان بہت ہی نرم
زرعی اصلاحات کو بھی، جو ۱۹۵۲ء میں پنجاب میں جاری کی گئی تھیں، ری پبلکن پارٹی کے وزیر
اعلیٰ ملک فیروز خان نون نے ۱۹۵۲ء میں منسوخ کر دیا۔ اس طرح طاقت کے چند ہاتھوں میں اکٹھا
ہو جانے سے جو سماجی اور اقتصادی نتائج پیدا ہوتے ہیں، اس سے قطع نظر، سیاسی اداروں کی آزادی
ہمارا بھی قدرتی طور پر اس سے بڑی رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔ جمہوریت اس صورت میں کیا پنپ
سکتی تھی کہ بڑے بڑے زمیندار اپنے اپنے محفوظ انتخابی حلقوں کے مالک بنے رہے جن پر زمانہ
کا کچھ اثر نہ ہو۔

سیاست دان جو لمبے چوڑے وعدے کرتے اور سبز باغ دکھاتے، اس کا نتیجہ اس کے سوا
کچھ نہ ہوتا کہ مزارعین کے دل میں جھوٹی امیدیں پیدا ہوں، اور زمینداروں میں بے بنیاد خوف و
ہراس پھیلے۔ اس سے زمیندار اور مزارع کے باہمی تعلقات میں اور زیادہ تلخی آ گئی، اور دونوں
اپنے اپنے حقوق اور پابندیوں کے بارے میں فریقین سخت دھوکے میں مبتلا ہو گئے۔ ان سب
باتوں کی وجہ سے زراعتی پیداوار میں ٹھہراؤ پیدا ہو گیا۔

میں نے مغربی پاکستان کے گورنر اختر حسین کو، جو زرعی اصلاحات کے کمیشن کے چیئرمین
بننے والے تھے بتایا، کہ میں زرعی اصلاحات کو ایک تعزیری قدم کے طور پر نافذ نہیں کرنا چاہتا
میرا مقصد سماجی اونچ نیچ کو دور کرنا ہے۔ میں حقوق اراضی کے بارے میں ایک معقول
پالیسی چاہتا ہوں، جس سے ایک طرف تو ہر ایک کے لیے یکساں مواقع کی فراہمی اور سماجی
مساوات میں اضافہ ہو، اور دوسری زرعی پیداوار کو بڑھانے کی اقتصادی ضرورت پوری
ہو اور دیہی کی آمدنی کی مساویانہ تقسیم سے معیار زندگی کو بہتر بنایا جا سکے۔

ہم نے جو تدبیریں سوچی تھیں، زرعی اصلاحات ان کے سلسلے کی ایک اہم کڑی تھیں۔ جب
تک ہمارے دیہات میں آبادی کی ایک بہت بڑی اکثریت غلاموں کی سی زندگی گزار رہی
ہو، ہم جمہوری نظام قائم نہیں کر سکتے تھے۔ ایسی صورت میں ووٹ محض بے معنی تھا جبکہ
تمام انتخابی حلقوں پر چند زمیندار چھائے ہوئے تھے اور ان پر انہی کا پورا قبضہ تھا۔ تجربے

سے ثابت ہے کہ براہ راست انتخاب میں بھی رائے دہی کا عام رجحان ہر علاقے میں چار پانچ ہی آدمیوں کی مرضی سے متعین ہوتا ہے۔ جاگیرداروں کی طاقت کو اس طرح کم کیا جا سکتا تھا کہ بڑی بڑی جاگیروں کو توڑ کر ہر شخص کے لیے ملکیت کی زیادہ سے زیادہ حد مقرر کر دی جائے۔ لیکن یہ بھی ضروری تھا کہ زمین کی نئی تقسیم کے باعث جو طبقہ ابھرے وہ زمین کی ترقی سے اتنی دلچسپی رکھتا ہو کہ اس میں جان اور مال کھپائے اور اسے اپنا مستقل پیشہ سمجھے۔ ایک مضبوط متوسط طبقے کے قیام میں مدد دینے کا بھی یہی طریقہ تھا۔

میں نے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ ایک کنبے کے لیے جو زمین پر گزران کرتا ہو، عزت آبرو کے ساتھ محنت کی زندگی بسر کرنے کے لیے کتنی آمدنی درکار ہوگی۔ میں ملکیت کے انتہائی رقبے کے لیے ایک ایسی حد مقرر کرنا چاہتا تھا، جہاں ایک کنبے کو زمین سے آمدنی اتنی ہو سکے کہ وہ اسی سے ہمہ وقتی پیشے کے طور پر لگا رہے اور زمین کے لیے جدید آلات مہیا کر کے اسے ترقی بھی دے سکے۔ مجھے ذاتی طور پر یہ بھی معلوم تھا کہ بہت سے خاندانوں میں بیواؤں اور ان بیاہی عورتوں کو اس امر پر مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے حصے کی زمینیں خاندان کے مردوں کو دے دیں چنانچہ اگر خاندان کے کسی مرد کی مملوکہ زمین کا رقبہ حد سے گھٹا دیا گیا تو وہ ان بیچاری عورتوں کو نکال باہر کرے گا۔ اس لیے قانون میں کوئی ایسی شق رکھنا ضروری تھا جس کی رو سے مالکان زمین اپنی زمین کا کچھ حصہ ایک مقررہ حد تک اپنے متوسلین یا اپنی بیویوں کے نام لکھ سکیں۔ ہم نے اس مقصد کے لیے اٹھارہ ہزار یونٹ کی حد مقرر کی۔ یونٹ کی بنیاد زمین کی پیداوار پر رکھی گئی، اس لیے ایک علاقے میں یونٹ کا رقبہ دوسرے علاقے کے یونٹ کے رقبے سے مختلف تھا۔ یہ تدبیر بھی زمین کی وسیع تقسیم میں معاون ہوئی۔ ان سب امور کو نظر میں رکھ کر مملوکہ زمینوں کی حدیں مقرر کی گئیں۔ ہم نے اس امر کو بھی مدنظر رکھا کہ یونٹ کا رقبہ اتنا ہو کہ زمین پر مشینوں سے کھیتی باڑی بھی ہو سکے، اور عمدہ کھادیں اور بیج استعمال کیے جا سکیں۔

سماجی انصاف اور اقتصادی ترقی کے تقاضے ہمیشہ ایک نہیں ہوتے لہٰذا یہ کام جو میں نے کمیشن کے سپرد کیا کوئی آسان کام نہ تھا۔ میں نے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ کمیشن اپنی سفارشات جلد سے جلد پیش کر دے۔ کمیشن نے اس کام کی پیچیدگیوں کے باوجود اپنی جامع رپورٹ تین مہینے کے اندر پیش کر دی۔

کمیشن اس نتیجے پر پہنچا کہ ہماری زمین، دیہاتی آبادی کا لحاظ کرتے ہوئے بہت کم اقتصادی مواقع بہم پہنچاتی ہے۔ بہت سے علاقوں میں زمین کی تقسیم ملکیت بھی ناہموار اور غیر منصفانہ

ہے چونکہ کھیتی باڑی کے علاوہ روزگار کے اور ذرائع کم ہیں، اس لئے زمین پر آبادی کا بوجھ بہت بڑھتا جا رہا ہے۔ آبادی کی کثرت اور وراثت کے قانون کی بنا پر زمین بہت چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم ہو کر رہ گئی ہے جو اقتصادی طور پر غیر مفید ہے ہر چند کہ کام کرنے والوں کی کمی نہیں لیکن بڑی بڑی زمینوں کی ترقی کی رفتار اکثر سست رہتی ہے اور بہت سی قابل کاشت زمین سے پورا پورا فائدہ نہیں اٹھایا جاتا۔ مزارعین کو بے دخلی کا دھڑکا رہتا ہے، ان کو اپنی محنت کا پورا صلہ نہیں ملتا، ادھر زمینداروں میں پہل کرنے کا شوق اور ولولہ کم ہے۔ روپیہ لگا کر پیداوار بڑھانے کی تدبیر نہیں کی جاتی۔

کمیشن نے ان خرابیوں کو دور کرنے کے لیے زرعی اصلاحات کے کم سے کم پروگرام کے طور پر چند تجویزیں پیش کیں۔ حکومت نے ان تجویزوں پر اچھی طرح غور کرنے کے بعد ۲۴ جنوری ۱۹۵۹ء کو اپنے فیصلے کا اعلان کر دیا۔

اس فیصلے کی بڑی بڑی شقوں کا خلاصہ یہ ہے:۔

کوئی شخص پانچ سو ایکڑ نہری یا ایک ہزار ایکڑ زمین سے زیادہ کا مالک نہ ہو سکے گا، صرف موجودہ مالکان اراضی کے معاملے میں کچھ معقول استثنا رکھے گئے ہیں۔ اس طرح جو زمین حاصل ہوگی اسے مزارعوں اور دوسرے مستحق لوگوں میں تقسیم کیا جائے گا۔ زمین کے مالکوں سے جو زمین لی جائے گی اس کا انہیں مناسب معاوضہ دیا جائے گا۔ یہ معاوضہ یونٹوں کی تعداد کے لحاظ سے مقررہ شرح پر ہوگا اور چار فیصدی منافع والے تمسکات کی صورت میں دیا جائے گا۔ یہ بانڈ ایک شخص سے دوسرے شخص کو وراثت میں مل سکیں گے، اور ایک سے دوسرے کے نام منتقل ہو سکیں گے اور انہیں پچیس سال کے بعد بھنایا جا سکے گا۔ جو مزارع پہلے سے زمینوں پر کام کر رہے ہوں گے انہیں موقع دیا جائے گا کہ وہ پچیس سال کے اندر قسطوں کے ذریعے ان زمینوں کو خرید لیں۔ ایسے مزارعوں کا خاص خیال رکھا جائے گا جو کہ ان رقبوں میں کام کر رہے ہوں گے۔ تمام مزارعوں کو زمین پر قبضہ رکھنے کی ضمانت دی جائے گی اگر کوئی بے دخلی قانونی طور پر ہوگی تو اس کا انہیں مناسب معاوضہ دیا جائے گا۔ اجارے کی شرح بڑھانے پر پابندی لگا دی جائے گی۔ مزارعوں سے خلاف قانون کوئی فیس وصول کرنا، بیگار یا کسی دوسری طرح کی خدمت لینا ممنوع ہوگا۔ ایک خاص اقتصادی حد سے کم زمین کی تقسیم نہ ہو سکے گی۔ اور اس بات کا انتظام کیا جائے گا کہ چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بٹی ہوئی زمینوں کو لازمی طور پر یکجا کر دیا جائے

ان اقدامات میں سے سب سے اہم اقدام یہ تھا کہ انفرادی ملکیت کی حد بہت نیچی رکھی گئی تاکہ زمین کی وہ دولت جس پر مغربی پاکستان کے کوئی چھ ہزار زمینداروں نے قبضہ جما رکھا تھا بہت سے ہاتھوں میں چلی جائے۔ اس طرح ایک تو غیر مساوی تقسیم کسی حد تک کم ہو گئی۔ دوسرے ان لوگوں کو جو اپنے ہاتھ سے کاشت کرتے ہیں، زمین کو زیادہ سے زیادہ کام میں لانے اور اس سے زیادہ سے زیادہ پیداوار حاصل کرنے کا موقع ملا۔

ان اصلاحات سے سماجی اور اقتصادی ناانصافی کو دور کرنے اور ترقی پسند زرعی معیشت قائم کرنے میں بڑی مدد ملی۔ اس بات سے قطع نظر کہ ہر ایک کے ساتھ انصاف برتنا ہمارا جزو ایمان ہے، میرے نزدیک ان اصلاحات کا جاری کرنا اس نظام حیات اور ان اقدار کی بقا کے لیے بھی اشد ضروری تھا، جو ہمیں دل سے عزیز ہیں اور جن کی خاطر پاکستان کی آزاد مملکت وجود میں آئی۔

اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے میرا اقدام محض جذباتی نہ تھا بلکہ میں چاہتا تھا کہ اصلاحات کے بعد بھی زراعت کا پیشہ ایک معزز پیشہ سمجھا جائے اور آمدنی کے لحاظ سے بھی اس میں کشش ہو تاکہ موزوں اہلیت کے لوگ اسے اپنائیں۔ یہ ایسا معیار زندگی مہیا کر سکے جو دوسرے پیشوں سے لگا کھا سکے۔ میں موجودہ نظام کو مٹانا نہیں چاہتا تھا بلکہ اس کی اصلاح چاہتا تھا تاکہ یہ ترقی کے مواقع مہیا کر سکے اور ایسے رہنما پیدا کرے جو دیہاتی زندگی کو سنوار سکیں۔ مالکان زمین کو اس امر کی ضمانت دی گئی کہ ان کے ساتھ مناسب اور منصفانہ سلوک کیا جائے گا۔ انہیں اپنی زمینوں کا جو معاوضہ ملا اس سے وہ اس قابل ہو گئے کہ بغیر کوئی ناواجب تکلیف اٹھائے، خود کو نئے حالات کے مطابق ڈھال سکیں۔

جہاں تک کسانوں کا تعلق ہے انہیں اپنے حقوق کی پہلی تاریخی دستاویز حاصل ہو گئی۔ ہم نے ان کے لیے وہ سب کچھ کر دیا، جو موجودہ حالات میں ممکن تھا۔ مغربی پاکستان میں پہلی مرتبہ ان کی حیثیت زرعی نظام کے اہم ترین عنصر کے طور پر تسلیم کی گئی۔ آئندہ کے لیے انہیں قانونی تحفظ حاصل ہو گیا اور اچھے کاشت کار بننے اور زیادہ غلہ اگانے کی ترغیب اور مواقع بھی۔

میں نے سندھ میں پرندوں کا بہت شکار کھیلا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ جہاں پرندوں کی بہتات تھی، کیونکہ ان کے چھپنے کے لیے بہت سی جھاڑیاں ہوا کرتی تھیں۔ یہاں تک کہ کھیتوں کے بیچوں بیچ جھاڑیاں پائی جاتی تھیں۔ کسان ان جھاڑیوں کو دیکھا کرتے مگر ان کو کاٹنے کا کبھی ان کو خیال تک نہ آتا۔ اب چونکہ کسان کا بھی زمین میں حق ہے، اس لیے کسی کھیت میں ایک جھاڑی تک نظر

نہیں آئی۔ اب ایک ایک انچ زمین پر کھیتی باڑی ہو رہی ہے۔

زمین سے غائب رہنے والے زمینداروں کا طبقہ اب ختم ہو گیا جو پچھلے نظام کے تحت بے پناہ سیاسی اثر و رسوخ رکھتا تھا اور یہ مغربی پاکستان میں ایک نئے عہد کا آغاز ہے۔ ایک طاقتور نیا متوسط طبقہ یقینی طور پر ابھرے گا، جو آئندہ انتخابات اور سماجی زندگی کے دوسرے شعبوں پر اپنا اثر ڈالے گا۔ بڑی بڑی زمینوں کا چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بٹ جانا، اس نئے متوسط طبقے کو اپنی زمینوں کے چھوٹے چھوٹے قطعوں کو یکجا کرنے پر مائل کرے گا، جس سے کھیتی باڑی بہتر ہو گی اور غلہ زیادہ پیدا ہو گا۔

لیکن ان اصلاحات کا سب سے زیادہ انقلابی اثر ملک کی سیاسی اور سماجی رہنمائی پر پڑے گا۔ ہماری آبادی کی بہت بڑی اکثریت کھیتی باڑی کرنے والوں پر مبنی ہے، اور پچھلے ظالمانہ نظام سے چھٹکارا پانے کے بعد اب اسی کے ہاتھ میں سیاست کی باگ ڈور ہو گی۔ ماضی میں شہری آبادی اپنی تعداد، اپنے تجربے اور صلاحیتوں کے تناسب سے بھی کہیں بڑھ چڑھ کر باقی ملک پر چھائی رہتی تھی۔ ان اصلاحات سے انجام کار شہری اور دیہاتی آبادی میں ایک مفید اور صحت مند توازن پیدا ہو جائے گا۔

مطبوعہ اعداد و شمار سے ظاہر ہوتا ہے کہ بیس لاکھ ستر ہزار ایکڑ زمین میں سے، جس سے زمیندار دست بردار ہوئے، تقریباً بیس لاکھ ایکڑ زمین چھ ہزار سے کچھ زیادہ زمینداروں کے قبضے میں تھی، جو ان کے پاس ملکیت کی مقررہ حد سے زائد تھی۔ مزید پانچ لاکھ ایکڑ زمین جاگیروں کو ختم کرنے سے حاصل ہوئی۔ کوئی نوے لاکھ ایکڑ زمین استحکام اراضی کے منصوبے کے تحت یکجا کی گئی اور ابھی یہ کارروائی جاری ہے۔

مشرقی پاکستان میں سیاست دانوں نے زرعی اصلاحات کو اس بنیاد پر جاری کیا تھا کہ ہر شخص کو زمین کا ایک ایک ٹکڑا دے دیا جائے۔ انہوں نے تمام دیہات کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بانٹ دیا اور اصلاحات کے نام سے چند تخریبی اور انتہائی شدید اقدامات کئے، جنہوں نے متوسط طبقے کو مٹا کے رکھ دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج دیہات میں کسی شخص کو بھی حقیقی دلچسپی نہیں ہے۔

یہ اصلاحات مسلم لیگ کی وزارت نے مشرقی پاکستان میں جاری کی تھیں۔ اس نے مالکان اراضی کو پورا معاوضہ دینے کا بھی وعدہ کیا تھا لیکن جب عوامی لیگ برسر اقتدار آئی تو اس نے ایک قانون منظور کر کے اسی دن سے تمام زمینوں کو اپنی تحویل میں لے لیا۔ مشرقی پاکستان میں انگریزوں

کی عمل داری میں دوامی بندوبست کے باعث زمین کا کوئی ریکارڈ نہیں رکھا گیا تھا، اور کوئی نہیں جانتا تھا کہ کس کی کتنی زمین ہے۔ چنانچہ کسی کو بھی معاوضہ نہیں دیا گیا۔

۱۹۵۸ء میں مشرقی پاکستان میں ایک "مالیہ اراضی کمیشن" مقرر کیا گیا جس کی سفارش پر مشرقی بنگال کے حصول اراضی و ملکان داری کے قانون مجریہ ۱۹۵۰ء میں ایک ترمیم کر دی گئی۔ اس کے ذریعے میں نے "خاص" خود کاشت زمین کی حد تینتیس ایکڑ سے بڑھا کر کوئی ایک سو بیس ایکڑ کر دی۔

مشرقی پاکستان میں اگر کوئی شخص محنت کرے، تو وہ ایک سو بیس ایکڑ زمین سے مناسب پیداوار حاصل کر سکتا ہے۔ زمین زرخیز ہے اور محنت وصول ہو جاتی ہے۔ اس ترمیم کے تحت مشرقی پاکستان میں گزارے کے لائق "اور" اقتصادی" زمینوں کے رقبے بھی علی الترتیب تین ایکڑ اور ساٹھ ایکڑ مقرر کر دیئے گئے۔

اس دوران میں نئی مشرقی پاکستان کی حکومت پر یہ پابندی عائد ہوئی کہ جلد سے جلد اراضی کے ریکارڈ تیار کرے اور مالکان اراضی کو معاوضہ دینا شروع کر دے جن سے زمینیں حاصل کی گئی تھیں تاکہ یہ لوگ بھی نئے سرے سے زندگی شروع کر سکیں اور سماج کے کارآمد رکن بن سکیں۔

بعض لوگوں نے مجھ سے سوال کیا ہے کہ کیا مشینی کھیتی باڑی، کیمیائی کھاد اور عمدہ بیج کا استعمال امداد باہمی سے کاشت کے ذریعے ممکن نہ ہوتا۔ ہم نے تجربے سے یہ بات معلوم کی ہے کہ کوآپریٹو فارمنگ ہمارے سماجی نظام میں کام نہیں دے سکتی۔ یہ صرف کمیونسٹ نظام ہی میں کامیاب ہو سکتی ہے۔ ہندوستان والے اپنے ہاں کوآپریٹو فارمنگ کے تجربے کر رہے ہیں۔ انہوں نے زمینوں کو تین تین ایکڑ کے ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ مجھے بہت بڑی کی ریاست میں خود کے حالات جاننے کا موقع ملا ہے۔ جیسے ہوں وہاں کوآپریٹو، اچھے نتیجے برآمد نہیں ہوتے، جب تک کہ اوپر سے دباؤ نہ ڈالا جائے۔

ہمارا ہر کہ ہر شخص زمین کا مالک ہو تو یہ کوئی عاقلانہ بات نہیں ہے۔ ہمارے پاس اتنی زمین ہے کہاں کہ ہر شخص کو دی جا سکے۔ البتہ ساجھے داری ہو سکتی ہے۔ لیکن ایک ایسے طبقے کا ہونا لازمی ہے جس کو زمین میں سرمایہ لگانے سے دلچسپی ہو اور جو اقتصادی سوجھ بوجھ اور جوش ترقی کے ساتھ کام کرنا چاہتا ہو۔ اس طبقے کو ختم کرنے کا مطلب سونے کا انڈا دینے والی مرغی کو ذبح کرنا ہے۔ پاکستان کی آمدنی کا ساٹھ فیصد زمین سے حاصل ہوتا ہے۔ ہمارے زمیندار عموماً طور پر سست واقع ہوتے ہیں۔ وہ زرعی اصلاحات کے تحت پہلے سے کہیں زیادہ محنت کر رہے اور کہیں زیادہ غلہ اگا رہے ہیں۔ وہ زمینوں پر مشینوں سے کام لے رہے ہیں، کیمیائی کھادیں اور عمدہ بیج استعمال کر رہے ہیں۔ ہمارے نوجوانوں کا ایک نیا طبقہ کاہلی کی تعلیم ختم کر

لینے کے بعد کھیتی باڑی کے پیشے کو اپنا رہا ہے۔ وہ ایک صحت مند زراعتی آبادی کے اُبھرنے کے آثار پیدا ہو رہے ہیں۔

لوگوں کو کھیتی باڑی میں سرمایہ لگانے پر مائل کرنا آسان کام نہیں۔ خشک علاقوں میں تو مالیہ کی شرح مقرر ہے، لیکن سندھ کے نہری علاقوں میں مالیہ کی رقم فصل کی قسم اور قیمت کے مطابق گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو آدمی زیادہ محنت کرے اور زیادہ خطرہ اُٹھائے وہ گورنمنٹ کو اور زیادہ ٹیکس بھرے! اس کی اس مشکل کو حل کرنے کے لیے حکومت مغربی پاکستان ان دنوں ایک ایسے نظام پر غور کر رہی ہے جس کے تحت مالیہ کی شرح مستقل طور پر مقرر کی جا سکے۔ جیسے ہی یہ مرحلہ طے ہو کاشتکار کو ہر ٹکڑے زمین سے زیادہ سے زیادہ نفع کمانے کی ترغیب ہوگی۔

امداد باہمی کی انجمنیں پاکستان میں صرف عام قرضوں کی سہولتیں بہم پہنچانے کی حد تک کارآمد ہو سکتی ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ ہر یونین کونسل میں امداد باہمی کے بینک کام کرنا شروع کر دیں، اور گاؤں کے مہاجن کی جگہ لے لیں، جس کا وجود تو اب خوش قسمتی سے باقی نہیں رہا مگر جس کی جگہ ابھی پُر نہیں ہوئی ہے۔ دیہاتیوں کو قرضے کی سہولتیں بہم پہنچانا ایک ضروری مسئلہ ہے اس کا واحد حل یہی ہے کہ یونین کونسلیں خود اپنے سیونگ اکاؤنٹ کھولیں اور امداد باہمی کا سلسلہ جاری کریں۔

نئے آئین کا جمہوری خاکہ زرعی اصلاحات کے بغیر بناوٹی سا معلوم ہوتا۔ ایک کاشتکار جس کا خاندان کئی نسلوں سے ایک قطعۂ زمین پر ہل جوتتا چلا آ رہا ہے، اس سے پوچھیے کہ ان اصلاحات کی بدولت اس کی زندگی کا سارا نقشہ کیسا بدل گیا ہے۔ وہ اپنے باپ دادا کی طرح محنت مشقت کرتا اور پسینہ بہاتا رہا، مگر نہ تو اس کے باپ دادا اس قطعۂ زمین کو اپنا کہہ سکتے تھے اور نہ وہ خود۔ زرعی اصلاحات نے اس کی قسمت ہی بدل ڈالی ہے۔ آئندہ وہ فخر سے کہہ سکے گا کہ یہ زمین میری ہے۔

ہماری سماجی اور سیاسی زندگی کی کایا پلٹ ہو رہی ہے۔ وہ طاقتیں جو اپنی وسیع ذاتی املاک کے بل پر کسی نہ کسی طرح برسرِ اقتدار آ جایا کرتی تھیں، اب واپس نہ آ سکیں گی۔ رہنما کو اب اس نظر سے جانچا جائے گا کہ وہ کتنے ایکڑ زمین کا نہیں، بلکہ کن انسانی خواص اور سماجی اقتدار کا مالک ہے۔ ہمارے دیہات میں انتہائی افلاس اور انتہائی دولت مندی کی باہمی آویزش کا جو یاس انگیز منظر برسوں سے طاری تھا، اب اس کا آخری پردہ گر چکا ہے۔

میں نے اپنے کام کا جو منصوبہ بنایا تھا، اس کا اثر ملک کے بڑے بڑے طاقتور لوگوں کی زندگی پر بھی پڑنے والا ہے اور عوام کی زندگی پر بھی۔ یہ ضروری تھا کہ سب کے ذہنوں میں اس تبدیلی کی

ضرورت اچھی طرح روشن ہو جائے تاکہ جب یہ تبدیلی واقع ہو تو خواہ شروع شروع میں کسی قدر گراں گزرے، لیکن ان کی حمایت حاصل ہو اور وہ اسے آگے بھی برقرار رکھنے کی کوشش کریں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس بات میں مجھے بڑی حد تک کامیابی حاصل ہوگی۔

جہاں اجارہ داری پر ضرب پڑے، وہاں ہر قسم کی اصلاحات ناگوار گزرا کرتی ہیں۔ اور میری اصلاحات زیادہ تر اجارہ داریوں ہی کے خلاف تھیں۔ ان کی وجہ سے مغربی پاکستان میں چھ ہزار بڑے طاقتور زمینداروں کو تقریباً بیس لاکھ ستر ہزار ایکڑ زمین سے ہاتھ دھونے پڑے۔ جہاں ایک ایک انچ زمین پر کشت و خون ہوا کرتے ہیں، وہاں تقریباً بیس لاکھ ایکڑ زمین بے چون و چرا حکومت کے حوالے کر دی گئی۔

مہاجرین

تقسیم کے وقت قتل و غارت گری کا جو ہنگامہ برپا ہوا تھا اس کا حال میں بیان کر چکا ہوں۔ اس وقت سرسری طور پر میرا اندازہ تھا کہ کوئی دس لاکھ مسلمان پاکستان میں پناہ لینے آئیں گے اور میں اتنا ہی فکرمند تھا کہ حکومت اتنے بڑے مسئلے سے کیونکر نمٹ سکے گی مگر فی الحقیقت دس لاکھ نہیں نوے لاکھ مہاجرین پاکستان آئے۔ آزاد ہندوستان میں ہندوؤں اور سکھوں کی مسلسل عداوت، اقتصادی اور سماجی بائیکاٹ، مسلمانوں پر سیاسی دباؤ، اور ملک چھوڑنے والوں کی بابت قوانین کا جابرانہ اطلاق، ان سب باتوں سے ہجرت کا ایک ایسا المناک سانحہ وجود میں آیا، جو دانستہ سیاسی اغراض کا پیدا کردہ تھا اور تاریخ کے عظیم سانحات میں سے ہے۔ پاکستان میں ہر چھٹا آدمی ہندوستان سے آیا ہوا مہاجر تھا۔ پچھلی سیاسی حکومتوں نے اپنی خیر اسی میں دیکھی کہ مہاجرین کا مسئلہ بدستور رہے اور یہ مہاجرین محض سیاست بازی کا ایک مہرہ بن کے رہ گیا۔

۱۹۵۴ء میں حکومت نے فیصلہ کیا کہ بے خانماں لوگوں کو ہندوستان میں چھوڑی ہوئی جائیداد کا معاوضہ ادا کرنے کے لئے ایک اسکیم چلائی جائے، مگر ۱۹۵۵ء سے لے کر ۱۹۵۸ء تک اس سلسلے میں کوئی قدم نہ اٹھایا گیا۔ اگر کوئی قابل ذکر کارروائی ہوئی تو بس اتنی کہ مطالبات کا اندراج اور چھان بین کرنے کے لئے ایک قانون منظور کیا گیا اور "کلیمز" کا ایک محکمہ کھول دیا گیا۔ فروری ۱۹۵۸ء میں پارلیمنٹ نے زرعی زمینوں کے "کلیمز" مستقل طور پر طے کر دینے کے لیے ایک قانون پاس کیا۔ لیکن پہلے کی طرح اب بھی اس قانون کی دفعات کو عملی جامہ پہنانے کے لئے کوئی ٹھوس کارروائی نہیں کی گئی۔

پچھلی حکومتوں سے جو بنیادی غلطی ہوئی تھی، اور جس کا شکار شروع شروع میں ہم بھی ہوئے

وجہ یہ تھی کہ اتنی بڑی تباہی اور اتنی کثیر آبادی کے افراتفری میں ہجرت کرنے کے باوجود فرض کر لیا گیا کہ ہر ایک مہاجر کی چھوڑی ہوئی جائیداد کی چھان بین کی جا سکے گی، "وہ پتہ چلا سکے گا کہ پاکستان میں اس کا کتنا معاوضہ دیا جائے۔ یہ کوشش لاحاصل ثابت ہوئی۔ ہمیں جلد ہی احساس ہو گیا کہ دستاویزوں کی عدم موجودگی میں یہ پتہ چل ہی نہیں سکتا کہ مہاجرین نے ہندوستان میں کس قدر جائیداد چھوڑی تھی اور یہاں وہ کس قدر جائیداد کے حقدار ہیں۔ ان جائیدادوں کے بارے میں تو یہ فیصلہ کرنا اور بھی ناممکن تھا، جو ہندوستان کے ان علاقوں میں تھیں جنہیں متروکہ جائیداد کی بابت دونوں ملکوں کے باہمی معاہدے سے خارج رکھا گیا تھا۔

میرے ذہن میں اس مسئلے کا ایک ہی حل تھا، وہ یہ کہ مہاجرین کو یہاں نئے سرے سے زندگی شروع کرنے کا موقع دیا جائے، اور معاوضے کے بارے میں غیر ذمہ دارانہ باتیں نہ کی جائیں۔ بھلا جب لوگ ملک مخالف پر اتنی بڑی بپتا پڑے، اور وہ گھر بار چھوڑ کر بھاگ آنے پر مجبور ہو جائیں، تو انہیں کون معاوضہ دے سکتا ہے؟ اور پھر وہ ملک جس نے انہیں پناہ دی ہو اگر معاوضہ دینے کی کوشش بھی کرے تو خیال کیجیے کہ اس کی انتظامی مشینری پر کس قدر بار پڑے گا۔ مغربی پاکستان کی مشینری تو اس مسئلے کو حل کرنے کے سوچ بچار میں تقریباً رک ہی گئی۔ مدتوں تک معطل رہی۔ اہل سیاست کو کچھ اور ہی سوجھی۔ انہوں نے اس مسئلے کا یہ مضحکہ خیز حل نکالا کہ اگر کوئی شخص دو گواہ پیش کر دے کہ یہ شخص نصف ہندوستان کا مالک تھا تو حکومت پاکستان کو اسے ماننا پڑے گا۔ اس کے بعد میں اگر وہ شخص بھی تصدیق کر دے کہ اس کے گواہ باقی ہندوستان کے مالک تھے تو حکومت کو اس کی بات بھی ماننی پڑے گی۔ غرض اس فارمولے نے بے ایمانی اور فریب کے دروازے چوپٹ کھول دیے۔

میں بے چارے مہاجرین کو الزام نہیں دے رہا ہوں۔ لیکن اس فارمولے نے مہاجرین کے اخلاق کو بگاڑ دیا، اور ساتھ ہی اس معاشرے کے اخلاق کو بھی جس میں وہ گھل مل جانا چاہتے تھے۔ ایک موقع پر ہم کسی قدر دشواری کے بعد ہندوستان سے آئے ہوئے مہاجروں کے بارے میں کچھ ریکارڈ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ ہم نے نمونے کے طور پر بعض ریکارڈ کی جانچ پڑتال کی تو معلوم ہوا کہ مہاجرین نے ہمارے پاس جو کلیم درج کرا رکھے ہیں ان میں صرف ۷½ فیصد سچائی ہے۔ اس پر وزارت بحالیات کو قدرتی طور پر بڑی تشویش ہوئی۔ یہ تو ظاہر تھا کہ مہاجرین کو نئے سرے سے زندگی شروع کرنے کا موقع دینا چاہیے۔ ان کی بحالی کا معاملہ نا اہلی بد دیانتی اور سیاسی پارٹی بازی کی وجہ سے کئی سال سے کھٹائی میں پڑا ہے، ادھر میں نے ملک

دہا تھا اور نوابوں اور زمینداروں کی تعداد کو کم کر رہا تھا۔ لیکن اگر ہم بحالی کے سلسلے میں کھلی کھوتی کی پالیسی پر عمل کرتے تو نوابوں کا ایک نیا طبقہ پیدا ہو جاتا۔ اور میں ہرگز نہیں چاہتا تھا کہ ایسا ہونے پائے۔

مارشل لاء کے جاری ہونے کے تین ماہ کے اندر ہم نے ۴ جنوری ۱۹۵۹ء کو ایک آرڈیننس کا اعلان کر کے اپنی کارروائی کا آغاز کر دیا۔ اس کے بعد اور آرڈیننسوں کا اعلان کیا گیا۔ ان میں سب سے زیادہ اہم ضابطہ نمبر ۸۹ تھا، جو ستمبر ۱۹۶۱ء میں جاری کیا گیا تھا۔ اس ضابطے کے تحت زرعی زمین کے استحقاق کا تعین ایک تدریجی نظام کے ذریعے کیا گیا۔ اور پہلے کے درج شدہ کلیموں کی بنا پر نئی زمینیں تقسیم کی گئیں۔ جو دعوے "مقررہ پیداواری انڈیکس یونٹ" کے مطابق ڈیڑھ ہزار یونٹ منظور رکھے گئے اور چار ہزار سے اوپر جتنے یونٹ تھے ان کا دس فیصد اور اس میں شامل کر دیا گیا۔

اس فارمولے کا مطلب یہ تھا کہ بڑے دعویداروں کے مطالبے میں بھاری کمی کر دی جائے۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ ایک من مانا قانون تھا۔ مگر حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے میں ہمدردانہ اور منصفانہ بلکہ رعایت و مروت پر مبنی۔ میں نے ایسے بہت سے لوگوں سے پوچھ گچھ کی جن پر اس کا اثر پڑا تھا۔ ان لوگوں نے اس وقت جبکہ معاملہ ختم ہو چکا تھا، اقرار کیا کہ وہ جتنی جائیداد ہندوستان چھوڑ آئے تھے اور اس کے بدلے میں یہاں جتنے کے حقدار تھے، اس سے ان کو تین، گنا زیادہ ملا۔ لیکن بڑی جائیداد والوں کو واقعی نقصان پہنچا۔ ہم نے ان کی اشک شوئی کے لیے یہ رعایت برتی کہ انہیں چھتیس ہزار پیداواری انڈیکس یونٹ تک زمین خرید لینے کی اجازت دے دی۔ یہ زیادہ سے زیادہ رقبہ تھا جو زرعی اصلاحات کے تحت کسی کی ملکیت ہو سکتا تھا۔ قیمت برائے نام یعنی دس روپے فی یونٹ رکھی گئی، اور آسان قسطوں میں ادا کی جا سکتی تھی۔ غرض یہ تھا وہ طریقہ جس سے ہم نے ملک کا انتظام سنبھالنے کے بعد مہاجرین کے مسئلے کو حل کیا۔ یہاں یہ بات بھی دھیان میں رکھنی چاہیے کہ اگر یہ لوگ ہندوستان ہی میں رہتے تو ان کو کیا ملتا۔ صرف پچیس سے پچاس ایکڑ تک۔

معاوضے کے اس پروگرام کے ساتھ ساتھ ہم نے حتی الامکان زیادہ سے زیادہ بے گھر مہاجرین کو آباد کرنے کے لیے بھی فوری تدابیر اختیار کیں۔ شہروں میں نئی بستیاں بسائیں، جن میں قابل رہائش مکان اور صحت و صفائی کے ضروری انتظامات مہیا کئے گئے۔ میں نے دسمبر ۱۹۵۸ء میں کراچی سے باہر کورنگی کالونی کا سنگ بنیاد رکھا اور پانچ مہینے کے اندر اندر پندرہ ہزار کوارٹر

تیار ہو گئے۔ ایسی ہی نئی بستیاں کراچی کے شمال میں اور ڈھاکہ کی محمد پور کالونی میں بسائی گئیں۔

مہاجرین کی آبادکاری کا مسئلہ یہیں ختم نہیں ہو جاتا۔ ہندوستان سوچے سمجھے منصوبے کے تحت مسلمانوں کو ان کے گھروں سے نکال کر قافلہ در قافلہ پاکستان کی طرف دھکیلتا رہا۔ خصوصاً ہمارے مشرقی صوبے میں۔ ہندوستان میں آبادیوں کے ادل بدل کی باتیں بھی زوروں پر ہوتی رہیں۔ میری سمجھ میں یہ بات اب تک نہیں آئی کہ ہندوستان والے آخر سوچ کیا رہے ہیں اور اس غیر ذمہ دارانہ حرکت کا مقصد کیا ہے۔ میری دلی خواہش اور دعا ہے کہ ان کے لیڈروں کو اپنی اس بربریت کا احساس ہو جائے اور وہ اپنے ہی ہم وطنوں کے ساتھ جو غیر انسانی سلوک کر رہے ہیں اس سے باز آ جائیں۔

حکومت برطانیہ نے ۳ جون ۱۹۴۷ء کو دو آزاد اور خود مختار مملکتیں ہندوستان اور پاکستان قائم کرنے کے منصوبے کا اعلان کر دیا۔ اس منصوبے پر اسی سال ۱۴ اگست سے عمل ہونا تھا۔ ہندوستان کو تو نئی دہلی میں بنا بنایا اور سجا سجایا دارالحکومت مل گیا مگر پاکستان کو اپنی مرکزی حکومت کے لیے کوئی موزوں صدر مقام تلاش کرنا تھا۔ اتنا وقت تو تھا ہی نہیں کہ کوئی جگہ مستقل طور پر چن لی جاتی۔ فوری ضرورت کا تقاضا یہ تھا کہ جہاں بھی جگہ ملے حکومت کا صدر مقام قائم کر دیا جائے۔ نظر دوڑائی تو کراچی سے بہتر کوئی جگہ خیال میں نہ آ سکی۔ شاید اس زمانے میں راولپنڈی کا نام بھی لیا گیا تھا مگر راولپنڈی میں زیادہ سہولتیں میسر نہ تھیں۔ اور بہر صورت اسے پاکستان کی بری فوج کا ہیڈکوارٹر تو بننا ہی تھا۔

سندھ کی صوبائی حکومت نے کراچی میں اپنے سیکرٹریٹ کی عمارت خالی کر دی۔ اور اسی میں مرکزی سیکرٹریٹ کی داغ بیل ڈال دی گئی۔ مگر یہاں گنجائش اتنی کم تھی کہ گزارا ہونا مشکل تھا۔ چنانچہ شہر کے مختلف حصوں میں عارضی تعمیریں کھڑی کر دی گئیں جن میں مرکزی حکومت کے دفتر کام کرنے لگے۔ رہنے سہنے کا بندوبست اور بھی ناکافی تھا کیونکہ حکومت سندھ نے رہنے کے مکان خالی نہیں کیے تھے۔ بہت سی فوجی بیرکوں کو عارضی مکانوں میں تبدیل کر دیا گیا۔ سرکاری ملازمین قدرتی طور پر بڑے بددل تھے کیونکہ وہ ان حالات میں اچھی طرح کام نہیں کر سکتے تھے۔

کراچی مغربی پاکستان کی واحد بندرگاہ ہے اور بین الاقوامی ہوائی راستوں کے درمیان واقع ہے۔ اسے غیر ملکی تجارتی فرموں کا مرکز بننے کی حیثیت تو آزادی سے پہلے ہی حاصل ہو چکی تھی۔ آزادی کے بعد بہت سے لوگ بمبئی، کاٹھیاواڑ اور ہندوستان کے دوسرے شہروں سے اٹھ کر کراچی آ گئے، جن کے پاس روپیہ بھی تھا اور کاروباری شعور اور تجربہ بھی۔ چنانچہ یہ شہر دیکھتے ہی دیکھتے ملک کا سب سے بڑا تجارتی اور صنعتی مرکز بن گیا۔ مہاجرین کی آمد اور صنعتی ترقی کے باعث اس کی آبادی بھی تیزی سے بڑھنے لگی۔ اور شہری سہولتوں میں ابتری آنے لگی۔ شہر کی آبادی جو ۱۹۴۱ء کی

مردم شماری کے مطابق ڈھائی لاکھ تھی اور ۱۹۵۱ء میں دس لاکھ سے زیادہ اور ۱۹۶۱ء میں بیس لاکھ کے لگ بھگ پہنچ گئی۔ کراچی کی آب و ہوا بھی اچھی نہیں یہاں کے رہنے والوں کی طبیعتیں مضمحل رہنے لگتی ہیں اور کام کرنے کی ہمت پست ہو جاتی ہے چونکہ اس وقت شہر کی عام حالت بھی تندرستی کے حق میں اچھی نہ تھی اس لیے سرکاری ملازموں کی صحت پر بہت برا اثر پڑا چند ہی سال کے اندر تمام انتظامی عملہ خستہ حال نظر آنے لگا۔

کراچی سیاسی شورش اور ہلچل کا مرکز بھی بن گیا تھا۔ سیاست بازوں نے دیکھا کہ وہ کارخانوں کے مالکوں اور تاجروں کو اپنے ساتھ ملا کر بآسانی مجمعے اکٹھے کر سکتے اور حکومت پر جس طرح کا چاہیں دباؤ ڈال سکتے ہیں۔ ایک وقت میں تو نوبت یہاں تک پہنچی کہ ایک بھاری جلسہ جس میں کچھ شوریدہ سر لوگ شامل ہوں، حکومت کا تختہ الٹ سکتا تھا۔ تاجروں کے ساتھ ہر وقت کے میل جول سے سرکاری افسروں میں بد اخلاقی بگاڑ بھی پیدا ہوا اور بہت سے لوگ بری ترغیب کا شکار ہوئے۔ علاوہ ازیں مرکزی حکومت کے وزراء کراچی کے مقامی نظم و نسق کے معاملات میں الجھے رہے۔

مرکزی حکومت انقلاب سے پہلے ہی کسی صحت بخش مقام کو منتقل ہو جانے کی سوچ رہی تھی اور اس سلسلے میں کراچی کے قریب ایک مقام گڈاپ کا نام لیا جا رہا تھا۔ مگر کوئی فیصلہ نہ ہو سکا تھا کیونکہ اس وقت حکومت اتنی مضبوط نہ تھی کہ خود غرض سندھی لوگوں کے دباؤ کو ٹال سکتی جو نہیں چاہتے تھے کہ حکومت کا صدر دفتر کراچی سے اٹھ جائے اور مرکزی حکومت پر ان کا اختیار نہ رہے۔

میں نے جنوری ۱۹۵۹ء میں جنرل یحییٰ کے تحت ایک کمیشن مقرر کیا کہ وہ محل وقوع، رسل و رسائل دفاع، آب و ہوا اور مضافات کی زرخیزی کا لحاظ رکھتے ہوئے اس بات کو جانچے کہ کراچی مستقل صدر مقام بنائے جانے کے لیے موزوں ہے یا نہیں۔ اور اگر نہیں تو اور کون سی جگہ موزوں ہو سکتی ہے۔ کمیشن کے ممبر پوری پوری چھان بین کے بعد یک زبان ہو کر اس نتیجے پر پہنچے کہ کراچی موزوں نہیں ہے۔ انہوں نے ملک کے دونوں حصوں کو خوب دیکھ بھال کر یہ رائے دی کہ پاکستان کا صدر مقام راولپنڈی کے قریب پوٹھوہار کی سطح مرتفع پر بنانا چاہئے۔ میں نے اسے منظور کر لیا۔ نئے دارالحکومت کا نام اسلام آباد رکھا گیا۔

اسلام آباد راولپنڈی سے کوئی سات میل دور مرگلا کی پہاڑیوں کے دامن میں واقع ہے۔ پوٹھوہار کے مرتفع خطے کے ساڑھے تین سو مربع میل رقبے میں پھیلا ہوا یہ مقام بتدریج چڑھتے مختلف سطح کے قدرتی سبزہ زاروں کا ایک کشادہ منظر پیش کرتا ہے۔ سمندر سے اس کی اونچائی سترہ سو سے دو ہزار فٹ تک ہے اور عقب میں پہاڑیوں کے سلسلے ہیں۔ اس علاقے کی [illegible] بڑی شاندار ہے۔

یہ ان اولین بستیوں میں سے ہے جہاں انسان نے آج سے تین چار لاکھ سال پہلے بود و باش اختیار کی تھی۔ اس کا پتہ سوہان تہذیب کی ان یادگاروں سے چلتا ہے جو پتھر کے زمانے سے تعلق رکھتی ہیں اور جو سرمور ڈٹیمر ویلر کو بھیڑ جوار کی سطح مرتفع سے دستیاب ہوئی تھیں۔ اس کے مدتوں بعد اس علاقے کے باشندوں نے مارگلہ کی پہاڑیوں کے دوسرے رخ پر ٹیکسلا کو اپنی حکومت کا مرکز بنایا۔ لوگ بدھ مت کے پیرو تھے۔ انہوں نے اور ان کے بعد یونانیوں نے ان پہاڑیوں کے دوسری طرف کے علاقے کو اس وجہ سے پسند کیا کہ صرف وہیں پانی مستقل طور پر بہم پہنچ سکتا تھا۔ ہم نے پہلا کام یہ کیا کہ یہاں راول ڈیم کی تعمیر کا حکم دیا تاکہ یہاں وہی حالات پیدا ہو جائیں جو آج سے کوئی ڈھائی ہزار سال پہلے ٹیکسلا میں تھے۔ اور یوں ہم نے پھر ٹیکسلا کی طرف عود کیا، جو عیسوی عہد سے مدتوں پہلے تہذیب و تمدن کا مشہور مرکز اور گندھارا آرٹ کا گہوارہ تھا۔

کمیشن نے تمام بنیادی باتوں یعنی محل وقوع، آب و ہوا کی موزونی ترقی کے امکانات، رسل و رسائل اور دفاع کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنی رپورٹ میں لکھا:۔

"کسی ملک کا دارالحکومت محض ایک شہر ہی نہیں ہوتا بلکہ شہروں کا سربراہ ہوتا ہے۔ اس شہر میں نظم و نسق، سیاسیات، حرفت و تجارت، ادب و فن، مذہب و سائنس کے سربراہ رہتے ہیں۔ یہیں سے فکر اور خیال کا دھارا پھوٹتا ہے جو قوم کی زندگی کو سیراب کرتا ہے۔ یہ ہماری امیدوں کی علامت ہے ہماری آرزوؤں کا آئینہ، قوم کا دل اور روح رواں ہوتا ہے۔ اس لیے لازم ہے کہ اس کی فضا اور ماحول ایسا ہو جس سے قوم کو ہمیشہ توانائی حاصل ہوتی رہے"۔

میرا اپنا بھی یہی خیال تھا کہ دارالحکومت محض کام چلانے کے لیے نہیں ہوتے اور نہ بڑی گے لیے نہیں بنائے جاتے۔ افادیت ضروری چیز ہے۔ لیکن دارالحکومت کے اور بھی کئی مقاصد ہوتے ہیں اور اس سے کچھ ایسی راہیں بھی نکلتی ہیں جن سے اہل قوم کو ان کی جدوجہد میں روشنی و رہنمائی حاصل ہوتی ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ یہ بہترین ماحول میں واقع ہو۔ پاکستان کے دونوں صوبے ایک دوسرے سے جدا ہیں۔ اس لیے اور بھی ضروری ہے کہ ان لوگوں کو ایک نئے مشترک مرکز پر لایا جائے کرنا یہی تھا کہ انہیں ایک بالکل ہی نئی جگہ پر لا بسایا جائے۔

چنانچہ یہ محض ایک شہر کی تعمیر نہ تھی، یہ ایک موقع تھا کہ اہل ملک کو متحد کیا جائے اور انہیں وہ صحیح ماحول مہیا کیا جائے جس میں رہ کر وہ وطن کی بہترین خدمات انجام دے سکیں۔ مرکزی حکومت ملکی انتظام کے تمام سرچ بچار کرنے اور پالیسی بنانے والے شعبوں پر مبنی ہے۔ یہاں عملے کے جوہر قابل کا موجود ہونا ضروری ہے تاکہ عوام کی بھلائی کے کام سوچے اور عمل میں لائے جا سکیں۔ راولپنڈی آنے

کے بعد سے افسروں اور عملے کی صحت میں میں نے نمایاں فرق دیکھا ہے۔ وہ اب مختلف آدمی نظر آتے ہیں، حالانکہ انہیں پہلے سے کہیں زیادہ محنت کرنی پڑتی ہے۔

نئے دارالحکومت کی ترقی و تعمیر و آرائش کو دیکھ کر مجھے بڑا اطمینان محسوس ہوتا ہے نئے سیکریٹریٹ کی عمارتیں قریب قریب مکمل ہو چکی ہیں۔ رہائشی علاقوں کی تعمیر کا کام بھی جاری ہے اور یہ شہر اب ملک کے اتحاد کی علامت اور عوام کی بیداری اور آرزوؤں کا آئینہ بن گیا ہے۔

(۴)

مارشل لا جاری ہونے کے دو دن بعد میں نے اپنی پہلی اخباری کانفرنس میں تین کاموں کا ذکر کیا تھا جن کو جلد سے جلد عمل میں لانا ضروری تھا یعنی زرعی اصلاحات، مہاجرین کی بحالی، اور تعلیمی اصلاحات۔

ہمیں ایک ایسے تعلیمی نظام کی ضرورت تھی جو ہمیں مختلف طرز کی قیادت کے لیے لائق لوگ مہیا کر سکے، اور اس کے اخراجات بھی ہماری بساط سے باہر نہ ہوں۔ میں نے ۳۰ دسمبر ۱۹۵۸ء کو قومی تعلیم کے سلسلے میں ایک کمیشن مقرر کیا اور اسے فوراً کام شروع کرنے کی تاکید کر دی۔ کمیشن کے اراکین تعلیمی نظام اور تعلیمی نظریے کا گہرا مطالعہ کرنا چاہتے تھے جس میں برسوں لگ جاتے، مگر میں نے ان سے کہا کہ مجھے جلد سے جلد رپورٹ چاہیے۔ انہوں نے بڑی محنت کی اور کوئی آٹھ مہینے کے اندر ایک جامع رپورٹ تیار کر دی۔

ہماری سب سے اہم ضرورت ایسے اعلیٰ تربیت یافتہ اور نظم و ضبط میں پختہ مردوں اور عورتوں کی ایک کثیر تعداد پیدا کرنا تھا جو رہنمائی اور ہدایت کا فرض ادا کر سکیں۔ میرے خیال میں ہمارے قومی تقاضوں میں سب سے اہم تقاضا یہی تھا۔ زمین، کھیتی باڑی، قانون اور انتظامیہ کے بارے میں جس قدر اصلاحات بھی نافذ کی جا رہی ہیں اور سیاسی، آئینی، سماجی اور اقتصادی استحکام اور فلاح و بہبود کے لیے جو کوششیں بھی ہو رہی ہیں ان سب کا مقصد ایک ہی ہے؛ یعنی ایسے حالات پیدا کرنا جو صحیح قسم کے مرد و زن کی نشو و نما کے لیے ضروری ہوں۔

ہماری تمام کوششوں کا مقصود ہمارے نونہال ہیں جو آج اسکولوں یا کالجوں میں تعلیم پا رہے ہیں مگر کل جن کا فرض ہوگا کہ وہ زندگی کے تمام شعبوں میں ملک کی قیادت سنبھالیں جب میں قیادت کا ذکر کرتا ہوں تو اس سے اونچے اونچے عہدوں پر فائز ہونا میری مراد ہرگز نہیں ہوتا جیسا کہ پچھلے زمانوں کے لوگ سمجھا کرتے تھے میرے نزدیک قیادت ایک ایسا ہمہ گیر وصف ہے جو ہر سطح پر پایا جاتا ہے۔ بچے کی ماں، گھر کی بیوی، کسی دور دراز علاقے کے پرائمری سکول کا استاد،

کسی دیہاتی شفاخانے کا ڈاکٹر، کسی چھوٹے سے پوسٹل دفتر کا کلرک، کھیت میں ہل جوتنے والا کسان، کارخانے کا مزدور، ہر ایک کو اپنے اپنے پیشے کا لیڈر ہونا چاہیئے اور اپنا اپنا کام خاطر خواہ لیاقت اور تعمیری جذبے کے ساتھ انجام دینا چاہیئے۔ ہمیں ایک ٹھوس اور معقول نظام تعلیم کی ضرورت تھی جس کے ذریعے قومی زندگی کے ہر شعبے میں قیادت کے لیے جوہر قابل مہیا ہو سکے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بات میرے ذہن میں واضح تھی کہ تعلیمی اصلاحات کا مقصد ان اچھی اور قابل قدر روایات کو بلا ضرورت مٹانا نہیں جو ایک مدت میں بنی ہیں۔ ہمیں ماضی کے جن ورثوں اور خزینوں پر فخر ہے ان کی حفاظت ہمارا فرض ہے، لیکن پرانے امتیازات کے نقوش اس وقت تک تر و تازہ نہیں رہ سکتے جب تک کہ انہیں نئی کامیابیوں کے ذریعے روشن نہ رکھا جائے۔

کمیشن نے سب سے پہلے ہمارے تعلیمی نظام کی جو ہمیں ورثے میں ملا تھا، بنیادی کمزوریوں کو واضح کیا۔ وہ کمزوریاں یہ تھیں:۔

"مجہولیت اور عدم تعاون، بدنظمی اور حکم عدولی، جماعت کے مقابلے میں اپنے فائدے کو ترجیح دینا۔ اور علاقہ پرستی اور صوبہ پرستی کی تفرقہ انگیز ہوا۔" کمیشن نے یہ نتائج پاکستان کی سیاسی تبدیلیوں کا گہرا مطالعہ اور ان اسباب کی چھان بین کرنے کے بعد اخذ کئے تھے جو سارے سیاسی نظام کے تعطل کا باعث ہوئے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں یہاں کمیشن کی تحقیقات کے بارے میں اسی کے الفاظ نقل کر دوں: "بدیسی حکومت کے شروع کے زمانے میں گورنمنٹ کا رویہ عوام کی طرف سرپرستانہ تھا۔ اور عوام کا رویہ گورنمنٹ کی طرف رضامندانہ اطاعت گزاری کا۔ جدت اور نئے اقدام کی نہ توقع کی جاتی تھی اور نہ حوصلہ افزائی۔ حکومت اور عوام کا رشتہ بس ایسا ہی تھا جیسا حاکم اور محکوم کا ہوتا ہے جس میں ذاتی لگاؤ کو دخل نہ تھا۔"[1] کمیشن نے کہا کہ آزادی کی جدوجہد کے دوران میں عوام کے تسلیم و اطاعت کے رویئے نے سرگرم مزاحمت کی شکل اختیار کر لی۔ لیکن پاکستان بننے کے بعد پرانے رویئے کی بعض بدترین صورتیں پھر عود کر آئیں، یعنی جمود و معذوریت کے ساتھ ساتھ نظام حکومت پر شک و شبہ۔

کمیشن نے تعلیمی نظام کی بنیادی کمزوریاں گنوانے کے بعد ان کی اصلاح کے لیے اپنی تجاویز پیش کیں۔ اس نے لکھا کہ بنیادی ضرورت بس "رویوں میں انقلاب" پیدا کرنے کی ہے تاکہ بیان کردہ خصوصیات کی جگہ ہمارے معاشرے میں "انفرادی سعی و کوشش، دیانتداری و

۱۔ تعلیمی کمیشن کی رپورٹ صفحہ ۲، حکومت پاکستان، کراچی، ۱۹۶۰ء

بلند کرداری، کامیابی پر فخر، دوسروں پر اعتماد اور اپنے فرضِ منصبی کا دلی پاس کمیشن کے الفاظ میں "پبلک فرائض کا بھی احساس" پیدا ہو سکے۔[۲]

کمیشن نے ایک منصوبہ بنایا جس کا مقصد تھا معیارِ تعلیم کو بلند کرنا، امیر بچے ہی کی نہیں ذہین بچے کی حوصلہ افزائی کرنا، اور تعلیم کے ذریعے پاکستان کے دونوں صوبوں اور مختلف زبانیں بولنے والوں کے درمیان اجنبیت اور باہمی شک و شبہ کا تدارک کرنا۔

کمیشن نے سفارش کی کہ اعلیٰ تعلیم کے معاملے میں زیادہ زور معیار پر ہونا چاہیے تاکہ ہمارے کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طلباء سمندر پار کے تعلیمی اداروں کے طلباء کے ہم پایہ ہو سکیں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ کالج اور یونیورسٹی کے استادوں کا معیارِ قابلیت بڑھایا جائے اور یہ بالآخر اس پر منحصر ہوگا کہ ایک تو ہم علمی کے پیشے میں اعلیٰ قابلیت کے لوگوں کو بھرتی کریں۔ دوسرے معلم حضرات کو علم اور تدریس کی لگن ہو، اور ذاتی تحقیق اور مسلسل مطالعے کے ذریعے اپنے علم اور طریقِ عمل کو جلا دینے کا شوق رکھتے ہوں۔

جو استاد پہلے سے ملازم تھے کمیشن نے ان کی قابلیت بڑھانے کے لیے موسم گرما کے کورسوں کا ایک سلسلہ شروع کرنے کی سفارش کی، جس میں ہر کورس مختلف تعلیمی شعبوں یا ضابطوں کا احاطہ کرے۔ یہ ایک مستقل پروگرام کا جزو ہو، جس کے ذریعے کالجوں کے استاد اپنے علم کی تجدید کر سکیں نئے اور اصلاح شدہ طریقوں سے واقف ہوں اور ان کی فکر تیز ہو۔ ان کورسوں میں یونیورسٹی اور کالج کے استاد شرکت کریں، اور ان کی نگرانی مشترکہ طور پر ایک ضابطے کے ممتاز مقامی اور غیر ملکی ماہرین خصوصی کے ہاتھ میں ہو۔ معلمین کی ملازمتوں کے اس منصوبے پر فوری طور پر عمل درآمد کیا جاسکتا تھا، چنانچہ گورنمنٹ کے کمیشن کی رپورٹ کو منظور کر لینے کے چند ہی ماہ کے اندر اس کام کی کچھ نہ کچھ ابتدا کر دی گئی۔

ثانوی تعلیم کے بارے میں کمیشن نے کہا کہ قومی تعمیر کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے ایسے لوگوں کی کثیر تعداد میں ضرورت ہے جو صنعت، تجارت اور زراعت کے شعبوں میں مختلف فنی قابلیتیں رکھتے ہوں، نیز ہماری مملکت کو ایسے افراد کی بھی ضرورت ہے جو بلند سیرت اور محبِ وطن ہوں۔ اور خدمت کو ایک بلند نصب العین کے طور پر اختیار کر لیں۔ گزشتہ زمانے میں

۱۔ تعلیمی کمیشن کی رپورٹ، حکومت پاکستان کراچی، ۱۹۶۰ء صفحہ ۵

۲۔ تعلیمی کمیشن کی رپورٹ، حکومت پاکستان کراچی، ۱۹۶۰ء صفحہ ۸

ثانوی اسکول کے پروگرام میں ان باتوں پر کم ہی دھیان دیا جاتا تھا اور درحقیقت ادب یا آرٹس کی تعلیم کی روایت اتنی پختہ ہو چکی تھی کہ اصلاح یا تبدیلی کی کوئی کوشش کارگر نہ ہونے پاتی تھی۔ ثانوی اسکول کے پروگرام میں زیادہ زور اس بات پر دیا جاتا تھا کہ طلباء کو یونیورسٹیوں میں داخلے کے لیے تیار کیا جائے۔ اس کمزوری کو دور کرنے کے لیے کمیشن نے یہ سفارش کی کہ ثانوی تعلیم کا اپنا ایک جداگانہ مقام اور مطمح نظر ہو اور اس کا مقصد محض اعلیٰ تعلیم کے لیے تیاری ہی نہ رہے۔

پرائمری تعلیم کے متعلق کمیشن نے یہ رائے ظاہر کی کہ اقتصادی ترقی کو جلد تر ممکن بنانے کیلیے عام طور پر پڑھی لکھی آبادی کی ضرورت ہوگی تاکہ وہ سائنس کی نئی ایجادوں اور بہتر فنی اور زرعی طریقوں کو سمجھ سکے اور ان سے کام لے سکے۔ اسے مقامی اور قومی مسائل سے آگاہی ہو اور وہ انتخابات کے موقعے پر سوچ سمجھ کر صحیح امیدوار کو منتخب کر سکے، جیسا کہ ہر ایک جمہوری نظام میں ہوتا ہے۔

تعلیمی اصلاحات کا سب سے بڑا مقصد دراصل یہ ہے کہ ہم اپنے عوام کو ملک کی نئی دنیا میں خود جینے کے لیے تیار کر سکیں۔ یہ مقصد رفتہ رفتہ ہی حاصل ہوگا۔ یہیں غالباً یہ صحیح ہے کہ ہم نے اس کام کی ابتداء کر دی ہے۔ البتہ ہمارے راستے میں رکاوٹیں بھی آتی رہی ہیں۔ مثال کے طور پر ۱۹۶۲ء کے سارے سال ہی ڈھاکہ یونیورسٹی نے صرف ستائیس دن کام کیا۔ ہم دونوں صوبوں کو دوش بدوش لانے کے لئے بڑی بڑی رقمیں خرچ کر رہے ہیں، لیکن بدقسمتی سے ہماری ترقی کی رفتار اس لیے سست پڑ گئی کہ بہت سے طلباء سیاست دانوں کے ہاتھوں گمراہ ہو کر اپنا وقت ضائع کرتے رہتے ہیں۔ یہ بڑی حوصلہ شکنی بات ہے۔ پھر بھی میرا خیال ہے کہ تعلیمی سدھار نے اپنا اثر دکھانا شروع کر دیا ہے اور دو تین سال میں ہمیں اپنی یونیورسٹیوں سے پہلے سے کہیں بہتر ثمر مراد ملنے لگے گا۔

رہا غیر ملکی اثر کا معاملہ تو اس کے بارے میں میری رائے یہ ہے کہ ہمیں سب اچھی اچھی باتیں خواہ وہ کہیں سے بھی ہیں اپنا لینی چاہئیں۔ افسوس یہ ہے کہ بری باتیں تیار کر لینا بڑا آسان ہوتا ہے، مثلاً نمائش اور شوقیانہ پن۔ مجھے غیر ملکی خیالات، طرز نظر اور طور طریق کے بارے میں بے جا شکوک لاحق نہیں ہیں۔ لیکن میری رائے میں ہمیں اپنی روایات ہی پر مضبوطی سے قائم رہنا چاہیے اور صرف انہیں غیر ملکی خیالات کو اپنانا چاہیے جو فائدہ مند ہوں اور ہماری زندگی میں گھل مل سکیں۔

حال ہی میں جو ملکتیں وجود میں آئی ہیں ان میں سے بیشتر نے اپنے ہاں مغربی نظامِ حکومت
ہی کو رائج کر لیا ہے، کیونکہ ان کے پاس خود اپنا انفرادی نظام سوچنے اور تیار کرنے کے لیے
وقت نہ تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ حکومت اور عوام کے درمیان کشیدگی کا باعث سیاست دانوں،
طلباء اور اخبارات کا رویہ ہے۔ طلباء کے مظاہرے تمام نئی جمہوری حکومتوں مثلاً پاکستان، ایران، ترکی
چین اور جاپان کے لیے پیچیدہ مسئلے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ قاہرہ سے طلباء کی
ہنگامہ آرائیوں کے بارے میں بہت خبریں آیا کرتی تھیں۔ لیکن جب سے وہاں حکومت کا انداز بدلا
ہے، طلباء کو قرار آگیا ہے۔ ہماری طرح کے نئے ملکوں میں ذمہ داری کی روایات ابھی پوری طرح قائم
نہیں ہوئی ہیں اور چونکہ اکثر غیر ذمہ دارانہ حرکات پر سزا نہیں دی جاتی، اس لئے لوگ بے آسانی بے راہرو
ہو جاتے ہیں۔

لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی سچ ہے کہ حکومتیں طلباء کو وہ سہولتیں بہم نہیں پہنچاتی رہیں جن کی
ان کو ضرورت ہے۔ اس کی کئی وجوہ تھیں۔ جہاں تک ہمارا تعلق ہے ہمارے پاس وسائل ہی نہیں
تھے۔ ہمارے ہاں طلباء کی تعداد نہایت کثیر تھی اور عملہ میں تجربہ کار بہت کم تھے۔ یہاں تک کہ
کھیل اور تفریح کے لیے بھی جگہیں بہت کم تھیں۔

ان میں سے بعض کمی تو جلد ہی رفع ہو سکتی ہے، بشرطیکہ انفرادی میل اور کوشش سے کچھ
نئی تدبیریں آزمائی جائیں۔ مثال کے طور پر جن کھیلوں میں صرفہ اور اہتمام زیادہ ہے ان کی جگہ منظم
جسمانی کسرت اختیار کی جا سکتی ہے۔ استاد لاؤڈ اسپیکر لے کر اونچی جگہ پر کھڑا ہو جائے اور ایک
وقت میں بہت سے طلباء کو کسرت کرانا شروع کر دے۔ اس طرح ہر روز آدھ گھنٹے کی ورزش
سے ان کے جسم اور دماغ کو تقویت بھی پہنچے گی اور شرارت بھی رفع ہو جائے گی۔

ہمارے ملک میں زبان کا مسئلہ ایک ہموار اور یکساں نظامِ تعلیم کی راہ میں سخت رکاوٹ
بنا ہوا ہے۔ کمیشن نے دونوں قومی زبانوں یعنی بنگلا اور اردو کو ذریعۂ تعلیم بنانے کی حمایت کی ہے۔
اس نے دو رسم الخطوں کے مسئلے کا بھی ذکر کیا ہے لیکن ان دشواریوں کو بیان نہیں کیا جو دو زبانوں
اور دو رسم الخطوں کے ہونے سے ایک ابھرتے ہوئے معاشرے کو پیش آ سکتی ہیں، جبکہ اس معاشرے
کا ایک ہی نصب العین اور ایک ہی مقصد ہو اور وہ متحد ہو کر ایک قوم بن جانے کا خواہشمند
بھی ہو۔ زبان کے مسئلے کو لازماً ایک علمی اور سائنسی مسئلے کے طور پر دیکھنا چاہیے۔ بدقسمتی سے یہ
ایک بڑا خطرناک سیاسی مسئلہ بن گیا ہے۔ نتیجہ یہ کہ کوئی شخص بھی اس ڈر سے کہ کہیں اس کے
الفاظ کے غلط معنی نہ لیے جائیں، اس مسئلے پر بات کرنا نہیں چاہتا۔ ہمارے ارباب عقل و دانش

جن کو اس مسئلے سے سب سے زیادہ دلچسپی ہونی چاہئے تھی مصلحتاً اس سے کنارہ کش رہے ہیں، کیونکہ ان میں اس مسئلے سے دو چار ہونے کی اخلاقی جرأت نہیں ہے۔ ان کا رویہ یہ رہا ہے کہ بس اس مسئلے کو سیاسی رہنماؤں ہی پر چھوڑ دیا جائے کہ وہ اس کا حل تلاش کریں اور اس کے نتائج کو بھگتیں۔ وہ خود آرام سے پیچھے بیٹھ کر اس حل کو تنقید کا نشانہ بنائیں۔

مجھ پر یہ بات پوری طرح واضح ہو چکی ہے کہ دو قومی زبانوں کے ہوتے ہوئے ہم ایک قوم والی مملکت کبھی نہیں بن سکتے۔ ہماری حیثیت کئی قوموں والی مملکت ہی کی رہے گی۔ اس سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ میں اس حیثیت کے خلاف کوئی حجت پیش کر رہا ہوں۔ میں تو فقط ایک حقیقت کا اظہار کر رہا ہوں جس سے چشم پوشی نہیں کی جا سکتی۔ واقعہ یہی ہے کہ ایک زبان کو پورے ملک پر مسلط نہیں کیا جا سکتا۔ نہ تو بنگالی اور نہ اردو پورے پاکستان کی زبان بن سکتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی بجا و درست ہے کہ اگر عوام یعنی مشرقی و مغربی دونوں صوبوں کے عوام ایک دوسرے کی بات سمجھنے کے لیے کوئی نہ کوئی ذریعۂ اظہار تو اختیار کرنا ہی پڑے گا اور اس ذریعۂ اظہار کو لازمی طور پر قومی ہونا چاہیے۔ ایسا ذریعۂ اظہار تیار کرنے کے لئے ہمیں بنگالی اور اردو کے مشترک عناصر کو یکجا کرنا ہو گا اور ایک مشترک رسم الخط کے ذریعے انہیں پڑھنے اور سمجھنے بولنے کا موقع دینا ہو گا۔ اس میں شک نہیں کہ یہ کام مدتوں میں جا کر پورا ہو گا لیکن جوں جوں دونوں صوبوں کے عوام ذہنی طور پر ایک دوسرے کے قریب آتے جائیں گے اور ایک دوسرے سے واقفیت بڑھتی جائے گی، ایک قومی ذریعۂ اظہار خود بخود پیدا ہو کر کوئی واضح صورت اختیار کر لے گا۔ میں اس خیال کو کسی پر مسلط نہیں کر سکتا۔ میں تو بس یہی کر سکتا ہوں کہ یہ مسئلہ آپ کے سامنے پیش کر دوں، اور اس بات پر زور دوں کہ اگر ہم اپنی قومی سالمیت اور یک جہتی کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں تو اس مسئلے کا حل ضروری ہے۔

انقلاب کے فلسفے پر عمل کرتے ہوئے ہم نے جتنی اصلاحات شروع کیں، ان سب میں تعلیمی نظام کی نئی تشکیل کے ساتھ مجھے زیادہ گہرا لگاؤ تھا۔ کسی اقتصادی منصوبہ بندی، سماجی ترقی یا روحانی اکتساب کا ایک ٹھوس اور حقیقت پسندانہ تعلیمی بنیاد کے بغیر بننا ممکن نہیں۔ یہ بڑا اجاری کام ہے جس کے لیے ملک کی تمام ذہنی صلاحیتوں کے بروئے کار آنے کی ضرورت ہے اور مجھے دلی توقع ہے کہ ایسا ضرور ہو گا، تاکہ اصلاحات کے حقیقی مقاصد کی تکمیل ہو سکے۔ بس اسی وقت ہم ایک ایسا تعلیمی نظام بنا سکیں گے جو ہماری قوم کی انفرادی اور اجتماعی ضروریات کو پورا کر سکے۔

میں نے کئی سال پہلے ۱۹۵۴ء میں نظامِ قانون کے مسئلے پر لکھا تھا کہ "ایک مسئلہ قانونی نظام کا مسئلہ بھی ہے۔ یہ نظام نہایت مہنگا، غیر مؤثر، سست رفتار اور ظالمانہ واقع ہوا ہے، اور ہمارے مزاج کے سراسر خلاف ہے۔ اس کی یکسر اصلاح کرنا اور اسے جدید دانہ، تیز رفتار اور کم خرچ بنانا ہوگا۔ اس کا علاج بظاہر یہ نظر آتا ہے کہ ملک میں جرگہ اور عدالت کا ملا جلا نظام رائج کیا جائے اور گواہی اور عدالتی کارروائی کے قوانین پر نظر ثانی کی جائے اور صرف ایک بار اپیل کا حق رکھا جائے۔ ہمیں ہر انتظامی حلقے میں ایک اونچی عدالت قائم کرنا ہوگی جس میں انہی مقدموں کو چھوڑ کر دوسرے مقدمے پیش ہوں گے۔ وفاقی یا صوبائی ہائی کورٹ میں صرف وہ مقدمے ہوں، جو آئینی نوعیت رکھتے ہوں۔"

مجھے یاد ہے میرے والد نے ایک موقع پر مجھے بتایا تھا کہ جب پہلی عالمی جنگ ختم ہوئی تو جن لوگوں نے برطانیہ کا ساتھ دیا تھا، انہوں نے حکومت سے مطالبہ کیا کہ ہمیں اس کا معاوضہ دلایا جائے حکومت برطانیہ نے ہر ضلع کے حکام سے کہا کہ تم لوگوں پر یہ بات واضح کر دو کہ برطانیہ نے اصلاحات جاری کر کے ہندوستان کے باشندوں کی کس قدر مدد کی ہے۔ ہزارہ کے ڈپٹی کمشنر نے جو کوئی کرنل تھے، ہری پور کے ممتاز لوگوں کو بلا کر ایک جلسہ کیا۔ جلسے میں صرف ایک کرسی تھی جو ڈپٹی کمشنر کے بیٹھنے کے لیے تھی۔ چنانچہ حاضرین جلسہ کو دری پر آلتی پالتی مار کر بیٹھنا پڑا۔ میرے والد کو بھی اس جلسے میں شرکت کے لیے بلایا گیا تھا۔ انہیں یہ بات بری لگی اور وہ ایک درخت کے نیچے جا کر کھڑے ہو گئے۔ ڈپٹی کمشنر نے کہا کہ حکومت ہندوستانیوں کی بہتری کے لیے ہر ممکن کام کر رہی ہے۔ مگر ان لوگوں میں جو عام پستی پائی جاتی ہے وہ ایک دن میں دور نہیں ہو سکتی۔ اس نے خاص طور پر مقدمے بازی کا ذکر کیا جس میں ضلع بھر کے لوگ مبتلا تھے۔ اس نے کہا ہر شخص عدالتوں میں جھوٹے دعوے دائر کرتا ہے اور پھر انصاف کا خواہاں ہوتا ہے۔ میرے والد نے کہا کہ یہ سچ ہے کہ لوگ جھوٹے اور من گھڑت دعوے دائر کرتے ہیں اور ہر قسم کے جھوٹ بولتے ہیں۔ لیکن اس میں لوگوں کا کچھ قصور نہیں۔ عدالتوں کا سارا نظام ہی بنیادی طور پر ہمارے لوگوں کے مزاج اور ضرورتوں کے خلاف ہے۔ لوگوں کو تجربے سے یہ بات معلوم ہو گئی ہے کہ برطانیہ نے جو عدالتی نظام قائم کر رکھا ہے اس سے وہی لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں جو جھوٹ اور مکر سے کام لے سکیں۔ حکام ان لوگوں کی ہر طرح ہمت افزائی کرتے ہیں جو خود اپنے ہم وطنوں کے خلاف الزامات لگاتے ہیں۔ لوگوں کی برائی کرنا بیکار ہے۔ ضرورت عدالتی نظام کی درستی اور اصلاح کی ہے۔

پینڈریل مون جو انڈین سول سروس کے ممبر رہ چکے ہیں اپنی کتاب "سٹرینجرز ان انڈیا" (ہندوستان میں اجنبی) میں لکھتے ہیں کہ عدالتی نظام ملک کی ایک کثیر آبادی کی فہم سے بالاتر ہے۔

پیچیدہ ہے۔ دیر لگانے والا ہے، مہنگا ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ انصاف نہیں کرتا۔ اگر کوئی شخص اس نظام کے ذریعے انصاف حاصل میں کامیاب ہو جائے تو اسے بڑا خوش قسمت سمجھنا چاہیے۔ یہ ایک ایسا نظام ہے جس نے لوگوں کے اخلاق کو تباہ کر دیا ہے، کیوں کہ اپنے دعوے کو سچا ثابت کرنے کے لیے ہر آدمی کو جھوٹ بولنا پڑتا ہے اور پھر جھوٹ کو سچ ثابت کرنے کے لیے اور زیادہ جھوٹ بولنے پڑتے ہیں۔ یہ عدالتی نظام اس ملک میں خوب چل سکتا تھا جہاں اس نے جنم لیا، ہمارے ہاں نہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس نظام نے ہماری اخلاقی اقدار کی بیخ کنی کر دی۔ مجھے پنڈیریل مون کے اس قول سے بھی اتفاق ہے کہ اس نظام کو کامیاب بنانے کی کوشش میں ہم نے اسے اخلاقی طور پر اتنا بگاڑ کر رکھ دیا اور اس نے جواب میں پورے معاشرے ہی کو اخلاقی طور پر تباہ کر ڈالا۔

جہاں تک میرا تعلق ہے مجھے موجودہ قانونی نظام پر ذرا بھروسا نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ لوگ اس نظام کی خامیوں کی وجہ سے قانون کے پیشے کو برا کہنے لگے ہیں، لیکن میں ایسا نہیں سمجھتا۔ یہ قانون پیشہ حضرات کا بنایا ہوا نظام نہیں۔ یہ تو ان پر مسلط کیا گیا تھا۔ لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ قانون پیشہ حضرات کے دل میں قانونی نظام کو پاکستانی زندگی کے مطابق ڈھالنے کی کبھی کوئی خواہش پیدا نہیں ہوئی۔ بہت سے وکلا اس نظام سے غیر مطمئن ہیں لیکن وہ اس کا اظہار کھلے بندوں نہیں بلکہ علیحدگی میں کرتے ہیں، کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ ان کے بعض ہم پیشہ نہایت سختی سے ان کی مخالفت کریں گے۔ ظاہر ہے کہ اگر اس نظام میں کوئی بڑی تبدیلی کی گئی تو اس سے بعض لوگوں کے ذاتی مفاد نقصان پہنچے گا۔

پاکستان میں بہت سے لوگوں نے قانون کا پیشہ اختیار کر رکھا ہے۔ ان لوگوں کی تعداد ضرورت سے کہیں زیادہ ہے۔ پھر ان میں بہت سے قابل لوگ بھی ہیں۔ اگر یہ لوگ اپنی قابلیت زندگی کے دوسرے شعبوں میں صرف کرتے تو اس سے ملک کو کس قدر فائدہ حاصل ہوتا۔ میں نے گاؤں کے غریب لوگوں کی آسانی کے لیے بنیادی جمہوریت کے ممبروں کو چند معمولی اختیارات دے رکھے ہیں، لیکن بعض قانون پیشہ حضرات نے اس چھوٹی سی بات پر بھی ناک بھوں چڑھائی ہے۔ میں ان کی وجوہ کو بخوبی سمجھتا ہوں، لیکن جن لوگوں کو ہمارے قانونی نظام نے سخت بددل اور ناچار کر رکھا ہے ان کی مصیبت کا کچھ نہ کچھ علاج تو کرنا ہی تھا۔ میں قانون کا ماہر نہیں ہوں۔ میں تو بس یہ چاہتا ہوں کہ عدالتی کارروائی کو آسان بنایا جائے اور ہماری عدالتیں مقدموں کے فیصلے جلد جلد کیا کریں۔ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ گواہی اور عدالتی کارروائی کے دوسرے قوانین کو بنیادی طور

پر بدل دینا چاہیے اگر مارشل لا جاری رہتا تو شاید میں اس کے بارے میں کوئی قدم اٹھا سکتا۔

ہمارے بعض وکلاء اور جج صاحبان میں یہ کمزوری پائی جاتی ہے کہ وہ طویل طویل کلام اور پر تکلف انداز بیان کے بڑے دلدادہ ہیں۔ مجھے ہائی کورٹ کا ایک مقدمہ یاد ہے، جو ایک عورت کی طلاق یا شادی کے بارے میں حال ہی میں ہوا تھا۔ چار یا پانچ جج تھے، ان میں سے ہر ایک نے دوسرے سے طویل فیصلے لکھنے میں بازی لے جانے کی کوشش کی۔ مختصر ترین فیصلہ ۳۰ صفحات پر پھیلا ہوا تھا اور نتیجہ کیا ہوا؟ آخر میں ان سب نے سفارش کی کہ اسلامی دنیا کے بڑے علماء کی ایک کانفرنس طلب کی جائے، جو اس مسئلے پر غور و خوض کر کے فتویٰ دے۔ اس فتویٰ کو آئندہ بھی اس قسم کے مقدموں کے سلسلے میں پیش کیا جا سکے گا اور فیصلوں میں یکسانی پیدا کی جا سکے گی۔ کاش کوئی ان جج صاحبان کو بتاتا کہ آپ کا کام تو فقط ملک کے قانون کی ترجمانی کرنا ہے، لمبے لمبے مقالے لکھنا نہیں۔ یہ ساری بات بڑی غیر ضروری معلوم ہوتی ہے۔ اس سے دلوں میں اعتماد پیدا نہیں ہوتا۔

میں نے اس معاملے کی چھان بین کرنے کے لیے مارشل لا کے دوران میں قانونی اصلاحات کا ایک کمیشن مقرر کیا۔ اس نے بڑی اچھی رپورٹ تیار کی لیکن میرا خیال ہے کہ اس رپورٹ نے مسئلے کی صرف سطح کو چھوا ہے۔ سچ یہ ہے کہ نظام قانون بنیادی طور پر تباہ کن ہے۔

اس رپورٹ میں طویل المیعاد قسم کے حل پیش کیے گئے ہیں جن کا مقصد یہ ہے: عدالتی کارروائی کو آسان بنانا، تاخیر کو کم کرنا، عدالت کو انتظامی شعبے سے جدا کرنا، اسلامی قوانین کا کمیشن مقرر کرنا، قوانین پر نظرثانی، وکلاء کی تربیت و تنظیم کے لیے ایک کمیٹی بنانا، کورٹ فیس میں کمی کرنا، محدود اختیارات کے ساتھ چھوٹے درجے کی عدالتیں، دیہات میں قانونی پنچایتیں، اور دوسرے شہری علاقوں میں ضلع دار عدالتیں، معمولی جرائم کے ضابطوں کو منسوخ کرنا، سارے ملک میں قوانین کو یکساں بنانا، مغربی پاکستان کے ہائی کورٹ کے عدالتی اختیار کو بلوچستان کے خاص علاقوں تک توسیع دینا اور بلوچستان میں قاضیوں کی عدالتوں کی جگہ باقاعدہ قانونی عدالتیں قائم کرنا، ازالۂ حیثیت عرفی کے قوانین میں ترمیم کرنا، موجودہ عدالتی قوانین کے ڈھانچے کی جانچ پڑتال کے لیے ایک کمیٹی مقرر کرنا وغیرہ وغیرہ۔

ان میں سے بعض سفارشات پر عمل کیا گیا۔ مثال کے طور پر ضابطہ دیوانی میں ترمیم کی گئی تاکہ عدالتی کارروائی کی پیچیدگیوں میں کمی کی جا سکے۔ مقدمے کی پہلی سماعت کو زیادہ جامع بنا دیا گیا، اور سماعت کا التواء جو پہلے بڑا آسان ہوا کرتا تھا، اب آسان نہیں رہا۔ پہلے ہائی کورٹ کا ایک جج جو فیصلہ دیا کرتا تھا اس کے خلاف دو ججوں کی بنچ کے سامنے اپیل کرنے کی اجازت ہوا کرتی تھی

جسے "ڈیفرڈ سینٹنٹ ایپل" کہتے تھے۔ یہ اپیل ختم کر دی گئی۔

تاہم جیسا کہ میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں یہ سفارشات مسئلے کی تہہ تک نہیں پہنچیں۔ اس قانونی نظام سے جو مالی اور مادی نقصان پہنچا ہے، مجھے اس کی اتنی فکر نہ تھی جتنی اس افسوسناک ذہنی اور اخلاقی نقصان کی جو اس نظام کے ذریعے لوگوں کو پہنچ رہا ہے۔ ایک بہت نیک اور ایماندار آدمی جو اپنے گاؤں میں کبھی جھوٹ نہیں بولتا، جب عدالت میں جاتا ہے تو اس سے عمداً جھوٹ بلوایا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کو اس نظام پر اعتماد نہیں ہے۔ وہ اسے اپنا نظام نہیں سمجھتا، غیروں کا نظام سمجھتا ہے۔ چنانچہ وہ اپنے دل کو یوں تسلی دے لیتا ہے کہ اس نظام کی خلاف ورزی کرنا کوئی بات نہیں، کیونکہ یہ تو غیر ملکی نظام ہے جو ہم پر ٹھونسا گیا ہے۔

طول طویل بحثیں جو عرصے تک جاری رہتی ہیں، اور غیر متعلق باتوں کو زیر بحث لانے پر دانستہ کی ڈھیل یہ ظاہر کرتی ہے کہ عدالتی نظام میں نظم و ضبط کی سخت کمی ہے۔ شاید قانون اپنی جگہ پر ٹھیک ہو لیکن گواہی اور عدالتی کارروائیوں میں قانون کا جس طرح اطلاق کیا جاتا ہے اس سے لوگ بہت ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔ عدالتی کارروائیاں ابھی تک طولانی اور تکلیف دہ ہیں اور ان کی رفتار سست ہے۔ میرا خیال ہے کہ جج اور مجسٹریٹ اس باب میں کسی قسم کی اصلاح کرنے اور معاملات کو جلد نپٹانے سے خود کو معذور پاتے ہیں۔ میرے پاس بعض دفعہ ایسے لوگوں کی جانب سے رحم کی درخواستیں آتی ہیں جنہیں قتل کے جرم میں سزائے موت سنائی گئی ہو۔ ایسا مقدمہ شاذ ہی میری نظر سے گزرتا ہے جس کا فیصلہ دو سال سے کم مدت میں ہوا ہو۔ ظاہر ہے کسی بھی قانونی نظام میں ایک فوجداری مقدمے کا اتنا طول کھینچنا، اچھا خاصا ڈھنڈ دیا ہوا۔ ادھر دیوانی مقدمات کی تہہ یہ کیفیت ہے کہ اگر آدمی کے پاس پیسہ ہو اور وہ چاہے کہ مقدمے کا فیصلہ نہ ہونے پائے تو جب تک چاہے جاری رکھ سکتا ہے۔

ایک دفعہ میں نے ایک جج سے جسے میں ایک مدت سے جانتا تھا پوچھا کہ کہو ہائیکورٹ میں کیسی گزرتی ہے۔ اس نے کہا "یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ فوجداری مقدمے میں دو فریق ہوتے ہیں، ایک مستغیث، دوسرا ملزم اور دیوانی مقدمے میں مدعی اور مدعا علیہ۔ بس آپ وہاں بیٹھے ہوئے شروع سے آخر تک فریقین کے جھوٹ اور افترا سنتے رہیے اور آپ کا کام یہ ہے کہ اس ساری خرافات میں سے مطلب نکالیں اور فیصلہ دیں۔ یہ ہے میری زندگی!"

میری ذاتی رائے یہ ہے کہ ہمیں اس سارے نظام کی چھان بین قانون دانوں ہی سے نہیں بلکہ ایسے لوگوں سے بھی کرانی چاہیے جنہوں نے اس کے ہاتھوں دکھ اٹھائے ہیں۔ مجھے اب

محسوس ہوتا ہے کہ قانونی اصلاحات کے کمیشن میں محض وکلاء اور عدالتی عہدہ داروں کو شامل کرنے میں مجھ سے بھول ہوئی مجھے ایسے لوگوں کو بھی اس کمیشن میں شریک کرنا چاہیئے تھا جنہیں لوگوں کی تکلیفوں سے بھی کچھ واقفیت ہوتی۔

میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے معاشرے میں جب کسی علاقے میں کوئی واردات ہوتی ہے، تو اس علاقے کے لوگوں کو معلوم ہوتا ہے کہ اصل مجرم کون ہے اور اگر انہیں موقع دیا جائے اور ان کی پشت پناہی کی جائے تو وہ مجرم کا نام بتلا دیں۔ اسی لیے میرا خیال ہے کہ ان معاملوں کو جس قدر بھی مقامی جماعتوں کے سپرد کیا جائے گا اتنا ہی زیادہ منصفانہ اور تسلی بخش کام ہوگا تجربے نے بتایا ہے کہ چھوٹے چھوٹے مقدموں کو مقامی جماعتوں کے ہاتھ میں دینے سے حوصلہ افزا نتائج نکلے بڑی بات یہ ہے کہ مقامی عدالتیں لوگوں میں سمجھوتے بھی کرا دیتی ہیں۔ اگر وہ صرف سزائیں ہی سناتی رہیں تو شاید ان پر سے اعتماد اٹھ جائے اور چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ اس سے لازمی طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ دادرسی کے اختیارات کو کسی حد تک بانٹ دینا چاہیئے البتہ پیچیدہ معاملوں مثلاً معاہدے کے قوانین کی بات اور ہے۔

میں اپنے ملک کے قوانین کو اسلامی بنانے کے مسئلے پر گہری سوچ بچار کرتا رہا ہوں اگر ہم اس میں کامیاب ہو جائیں، تو ہمارا قانونی نظام زیادہ ہمدرد انسانیت اور قابل عمل بن جائے آئندہ اس معاملے میں قدم اٹھانا مجلس قانون ساز کا کام ہوگا۔ اس مقصد کے لئے جو بھی معقول تجویز پیش کی جائے گی میں اس کی تائید پر آمادہ رہوں گا اس معاملے پر ادھر ادھر کی باتیں تو بہت ہو رہی ہیں، لیکن ابھی تک کسی نے یہاں تک کہ علماء نے بھی کوئی محسوس بات تجویز نہیں کی۔ میں نے اسلامی نصب العین کے بارے میں ایک مشاورتی کونسل اور ایک اسلامی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ قائم کر دیا ہے۔ ان دونوں کو دین کی روشنی میں، ہمارے قانونی مسائل کا جائزہ لے کر حکومت کو اپنا مشورہ دینا چاہیئے۔ اس سے ہماری مجلس قانون ساز کے اراکین کو اسلامی عقائد کے مطابق قوانین وضع کرنے میں مدد ملے گی۔ لیکن ان قوانین کو قابل عمل بنانے کے لیے موجودہ معاشرے کی ضرورتوں کا بھی خیال رکھنا ہوگا۔

میں جانتا ہوں کہ یہ کام آسان نہیں جب عقائد اسلام کی شرح اور وقت کے تقاضوں کو نظر میں رکھ کر قوانین میں ترمیم کی کوشش کریا علماء کو کفر کا فتویٰ صادر کرنے کی دعوت دینا ہے شادی بیاہ کے آئین ہی کو لیجئے۔ اسلام نے مرد کو بعض حالات کے تحت ایک سے زیادہ شادیاں کرنے کی اجازت دے رکھی ہے لیکن یہ اجازت اندھا دھند کثرت ازدواج کا سبب ہو

گئی ہے جس سے ان گنت بے زبان عورتیں اور معصوم بچے سخت مصیبتوں اور پریشانیوں کا شکار ہو گئے ہیں۔ مردوں نے اس اجازت کو اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے ایسے غیر ذمہ دارانہ طور پر استعمال کیا ہے کہ اس کی بدولت ہزاروں خاندان تباہ ہو گئے ہیں۔ ۱۹۵۵ء میں پاکستان کے ایک سابق چیف جسٹس کی سربراہی میں ایک کمیشن اس مقصد کے لیے مقرر کیا گیا تھا، شادی بیاہ کے قوانین کی جانچ پڑتال کر کے اصلاح کی تجاویز پیش کرے۔ اس کمیشن کے تمام ممبر عالم فاضل لوگ تھے۔ ۱۹۵۸ء میں جب میں نے ملک کا انتظام اپنے ہاتھ میں لیا تو مجھے معلوم ہوا کہ اس کمیشن نے رپورٹ تیار کر رکھی ہے جس میں متعدد سفارشات کی گئی ہیں۔ ایک اختلافی نوٹ کو کمیشن کے تمام ممبران تجاویز پر متفق تھے۔ پچھلی حکومت علماء کے ڈر سے ان سفارشات پر عمل کرنے سے کتراتی رہی۔ میں نے بعض ممتاز ماہرین قانون سے، جن میں مشرقی پاکستان کے جسٹس محمد ابراہیم اور مغربی پاکستان ہائیکورٹ کے سابق چیف جسٹس سر منظور قادر شامل تھے، اس رپورٹ کا معائنہ کرایا۔ کمیشن کی سفارشات کسی صورت میں بھی اسلامی شریعت میں خلل انداز نہ ہوتی تھیں۔ ان میں تو فقط شادی بیاہ سے متعلق احکام اسلامی پر مناسب و معقول طریقے سے عمل درآمد کے لیے ضابطۂ کار بتایا گیا تھا۔ میں نے کمیشن کی سفارشات پر عمل کرنے کا تہیہ کر لیا، کیونکہ میں ایک مسلمان اور سربراہ مملکت ہونے کی حیثیت سے اس بھاری سماجی بدعنوانی کو ختم کرنا اپنا فرض سمجھتا تھا جو لوگوں کی زندگیوں کو تلخ کر رہی تھی۔ چنانچہ ۱۹۶۱ء میں عائلی قوانین کا آرڈیننس جاری کر دیا گیا۔ اس پر علماء کی ایک جماعت نے فوراً مجھ پر شریعت میں دخل اندازی کا الزام لگایا۔ بعض علماء تو یہاں تک کہنے سے بھی نہ چوکے کہ میں نے (نعوذ باللہ) قرآن حکیم کے بعض حصوں میں تحریف کی ہے۔ خوش قسمتی سے اس نئے قانون کے سماجی فوائد کا ہماری عائلی زندگیوں اور ہمارے عوام پر بہت اچھا اور فوری اثر ہوا۔ خاص طور پر ہمارے ملک کی خواتین نے دل کھول کر اس اصلاحی قانون کی حمایت کی۔ مغالطہ پیدا کرانے والوں کی پیش نہ چلی۔ اس ذکر سے مجھے یہ بتانا مقصود تھا کہ قوانین کو حالات حاضرہ کے مطابق ڈھالنے میں کیا دقت پیش آتی ہے۔

(۹)

پاکستان اور ہندوستان میں دریائے سندھ کے طاس کے پانی پر جو جھگڑا ہے وہ بہت پرانا ہے اور اس نے کئی رنگ بدلے ہیں۔ کشمیر کا مسئلہ تو بنیادی طور پر ایک سیاسی مسئلہ ہے لیکن نہروں کے پانی کا مسئلہ ایک فنی اور اقتصادی مسئلہ ہے جس نے ہندوستان کے غیر مصالحانہ رویے کی وجہ سے ایک تلخ دیرینہ عداوت کی شکل اختیار کر لی ہے۔ پاکستان میں یکے بعد دیگرے

جو حکومتیں برسرِ اقتدار رہیں ان کی کمزور اور پس و پیش کی پالیسی بھی اس جھگڑے کے بڑھنے کا باعث ہوئی ہے۔

مارشل لاء جاری ہونے کے جلد ہی بعد میں نے کراچی کی ایک اخباری کانفرنس میں کہا تھا کہ اگر کشمیر اور نہروں کے پانی کے مسئلے صلح صفائی سے طے ہو جائیں تو نئی حکومت کوئی ایسی تدبیر سوچنے کے قابل ہو گی کہ ہندوستان اور پاکستان دونوں امن چین کے ساتھ رہ سکیں۔ میں نے حقیقت پسندانہ جذبے کے ساتھ ان دونوں مسئلوں کو حل کرنے کی ٹھان لی۔

دریائے سندھ اپنے پانچ بڑے معاونوں کے ساتھ دنیا کے عظیم دریائی نظاموں میں شمار ہوتا ہے۔ اس کے پانی کا سالانہ بہاؤ دریائے نیل سے دگنا ہے اور دجلہ و فرات کے مجموعی بہاؤ سے تگنا ہے۔ اس کی مقدار تقریباً سترہ کروڑ ایکڑ فیٹ ہے۔ یا یوں کہیے کہ اتنا پانی جس سے فرانس یا امریکی ریاست ٹیکساس کا پورا رقبہ یک فٹ گہرائی میں ڈوب جائے۔ ان دریاؤں کے آبپاشی کے نظام ہے جس کی ترقی پچھلے سو برس کی کوششوں کا نتیجہ ہے، پاکستان کے چار کروڑ اور ہندوستان کے ایک کروڑ باشندے یا یوں سمجھئے کہ دونوں ملکوں کی مجموعی آبادی کا تقریباً دسواں حصہ اپنی روزی حاصل کرتا ہے۔ دریائے سندھ کے طاس کی آبپاشی کا نظام دنیا میں سب سے بڑا نظام ہے یہ تین کروڑ ایکڑ زمین کو سیراب کرتا ہے۔ یہ مصر اور سوڈان کے اس رقبے سے بڑا ہے جسے نیل سیراب کرتا ہے۔

جب ۱۹۴۷ء میں ملک تقسیم ہوا تو ہمارے آبپاشی کے چند بڑے بڑے نظاموں کے ہیڈ ورکس ہندوستانی علاقے ہی میں رہ گئے۔ مرکزی باری دوآب کی تمام نہریں اور وادیٔ ستلج کے پروجیکٹ، پانی کی بہم رسانی کے لیے ان ہیڈ ورکس اور ان دریاؤں کے محتاج تھے، جن پر ہندوستان کا قبضہ تھا دریائے ستلج، دریائے بیاس اور دریائے راوی جن کا پانی ان نہروں میں آتا تھا ان کے منبع ہندوستان میں تھے اور وہ پاکستان میں داخل ہونے سے پہلے ہندوستانی علاقے کے لمبے لمبے فاصلے طے کرتے تھے۔

تقسیم کے تھوڑے ہی دن بعد ہندوستان کو ہماری نہروں کے پانی کی سپلائی روک دینے کی سوجھی۔ اس کے اس شدید اقدام نے ہمارے لیے بڑی نازک صورت حال پیدا کر دی آخر چند شرائط کے تحت پانی کھول دیا گیا۔ ہمارے لیے ان شرائط کو مان لینے کے سوا چارہ نہ تھا، کیونکہ دوسری صورت میں ہمارے ذرخیز علاقے تباہ و برباد ہو جاتے۔ یہ مسئلہ اس بات سے اور بھی پیچیدہ ہو گیا کہ اس وقت تک سندھ کے طاس کا آبپاشی کا نظام پانی کے جمع شدہ ذخیروں پر

نہیں بلکہ مشاقا دریا کے بہاؤ پر قائم تھا۔ پانی کی بہم رسانی موسمی تبدیلیوں ہی پر موقوف نہ تھی بلکہ سال بہ سال بدلتی رہتی تھی کیونکہ اس کا دارومدار ہمالیہ کے بالائی سلسلوں میں ہونے والی بارشوں پر تھا۔

ہندوستان ستلج، بیاس اور راوی کے سارے پانی، اور غالباً چناب کے کچھ پانی کو اپنے استعمال کے لیے ہتھیانے کی فکر میں تھا۔ چونکہ ان دریاؤں کا پانی اس کے علاقے سے گزر کر پاکستان آتا تھا اس لیے ہمیں اس سے محروم کر دینا اس کے اختیار میں تھا۔ پانی کے اس طرح بہ آسانی دستیاب ہو جانے کی توقع میں اس نے سوچا کہ سارا پانی ہی فوری اقتصادی ترقی کے لیے استعمال کرے چنانچہ اس نے انجینئروں کی بھاری بھاری تعمیرات کا کام شروع کر دیا جس کا صرف ایک ہی نتیجہ ہو سکتا تھا، وہ یہ کہ پاکستان کے لمبے چوڑے علاقے پورے کے پورے ویران ہو جائیں۔

دریائے سندھ کے نظام کے پانی کی حصہ داری برسوں سے جھگڑے کا سبب بنی ہوئی ہے۔ تقسیم سے پہلے سندھ اور پنجاب کے صوبوں میں پانی کے حق پر ہمیشہ اختلاف رہا کرتا تھا۔ تقسیم کے وقت پاکستان اور ہندوستان کے درمیان جو حد کھینچی گئی وہ سندھ کے نظام کے مین بیچ میں سے ہو کر گزرتی تھی۔ دریاؤں کا زیریں حصہ پاکستان کو ملا اور اس کی آبپاشی کی بڑی بڑی نہروں میں سے دو کے ہیڈ ورکس سرحد کے اس پار ہندوستان میں رہ گئے۔ اس طرح پانی کے استعمال کی شراکت ایک بین الاقوامی مسئلہ بن گئی۔ یہ ۱۹۵۰ء کی بات ہے۔ میں اس وقت کمانڈر انچیف تھا۔ ان دنوں اخبارات میں دریائے سندھ کے طاس کے جھگڑے کا بڑا چرچا ہو رہا تھا۔ ہندوستان والے ہماری نہروں کا پانی بند کر دینے پر تلے ہوئے نظر آتے تھے۔ اگر پانی بند ہو جاتا تو عجب نہ تھا کہ پاکستان اور ہندوستان میں جنگ چھڑ جاتی۔ مجھے اس مسئلے کا کچھ زیادہ علم نہ تھا اور پوری واقفیت حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس پر مغربی پاکستان کی حکومت نے اپنے دو انجینئر میرے پاس بھیجے جنہوں نے بڑی تفصیل کے ساتھ اس معاملے کو مجھ پر واضح کر دیا۔

مجھے سب سے زیادہ پریشانی پاکستان کے غیر محفوظ ہونے کی تھی۔ ہمارے دریاؤں کے ہیڈ ورکس بھی ہندوستان میں تھے اور منبع بھی۔ ہندوستان نے پانی کا رخ بدل دینے کے انتظامات کر رکھے تھے، اور ہندوستانی فوج ہماری فوج سے بڑھی ہوئی تھی۔ میں نے دل میں کہا کہ اگر ہندوستان کے ساتھ ہماری بات چیت کا سلسلہ ٹوٹ جائے اور ہندوستان والے دریاؤں کا رخ بدلنے کا فیصلہ کر لیں تو ہمیں جنگ کا سامنا کرنا ہوگا۔ ہر بات ہمارے خلاف پڑتی تھی اس لیے مصلحت اسی میں تھی کہ ہندوستان سے سمجھوتہ کر لیا جائے خواہ اس میں ہمیں کچھ خسارہ

ہی کیوں نہ اٹھانا پڑے۔ اگر ہم ایسا نہ کریں گے تو ممکن ہے ہم پیاسے کچھ بیٹھیں۔

اکتوبر ۱۹۵۸ء میں انقلاب کے فوراً بعد میں نے اس مسئلے پر نئے سرے سے مطالعہ کیا اور اس کے تمام پہلوؤں سے آگاہی حاصل کی۔ پھر میں نے بڑے مضبوط ارادے کے ساتھ چند قطعی فیصلے کئے۔ مئی ۱۹۵۹ء تک اس مسئلے کے تمام پہلو روشن اور اہم نکات واضح ہو چکے تھے۔ عالمی بینک ایک ایسے مرحلے پر پہنچ گیا تھا کہ وہ قطعی طور پر کوئی پیش کش کر سکے۔ اس نے اصول تلاش کر لیے تھے جن پر نہری پانی کے معاہدے کی بنیاد رکھی جا سکتی تھی۔ عالمی بینک نے نئے بند و ذخیرہ تعمیر کرنے کے بارے میں ہمارا مطالبہ منظور کر لیا تھا۔ یہ سمجھوتے کا ایک سنگ بنیاد تھا جس کی رو سے ہندوستان کو بھی مالی امداد دینی تھی۔ عالمی بینک کے وفد نے جس کے سربراہ اس بینک کے صدر یوجین بلیک تھے ہمیں منگلا بند کی تعمیر، بعض ہیڈ ورکس اور متبادل نہروں، بیراجوں اور دریاؤں کے سلسلے کو ملانے والی نہروں کی پیش کش کی۔ انہوں نے جہلم کے قریب رہتاس کے مقام پر ایک اور بند بنانے کی پیش کش بھی کی۔ اس عظیم تعمیری کام کے اخراجات کا بار زیادہ تر دوست ممالک مثلاً ریاست ہائے متحدہ امریکہ کو اٹھانا تھا اور کچھ ہندوستان اور کچھ پاکستان کو۔

لیکن یوجین بلیک سے اپنی گفت و شنید کی کیفیت قلم بند کرنے سے پہلے میں اپنے فنی ماہرین اور منتظمین کی مخالفت کا حال بیان کر دینا چاہتا ہوں جس سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ انہیں صورت حال کی نزاکت کا پورا پورا احساس نہیں ہے اور ایسی صورت میں کہ ہماری حالت ہر لحاظ سے کمزور ہے، وہ ان ہونی باتوں کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ وہ بزور اپنی پالیسی منوانے کی بھی کوشش کر رہے تھے اور معاملے کو اس کی انتہائی حد تک لے جانا چاہتے تھے۔ تقریباً تیس چالیس آدمی لاہور کے گورنمنٹ ہاؤس میں جمع ہوئے جہاں میں نے ان سے خطاب کیا۔ میں نے کہا:

"صاحبو! یہ مسئلہ ہمارے لیے بڑے دوررس نتائج کا حامل ہے۔ میں تمہیں بتا دینا چاہتا ہوں کہ ہر بات پاکستان کے خلاف پڑتی ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ہمیں اپنے حقوق سے دستبردار ہو جانا چاہیے لیکن اس کے ساتھ ہی میں یہ کہے بغیر بھی نہیں رہ سکتا کہ اگر ہم کوئی ایسا حل تلاش کر لیں جس کے ذریعے ہم زندہ رہ سکیں، تو ایسے حل کو منظور نہ کرنا سخت بے وقوفی کی بات ہوگی۔ یہ بات میں آپ لوگوں سے نہیں بلکہ حقیقت میں اپنے آپ سے کہہ رہا ہوں کیونکہ اس حل کی ذمہ داری مجھے لینی ہوگی۔"

"چونکہ آپ میں سے کسی پر بھی اس کی ذمہ داری نہیں ہوگی، اس لیے میں صاف صاف بتلا دینا چاہتا ہوں کہ پالیسی بھی میری ہی ہوگی۔ فنی تفصیلات کے سلسلے میں جب کبھی مجھے کوئی شک

ہوا تو میں آپ حضرات سے مشورہ طلب کر لوں گا، لیکن اگر آپ میں سے کسی نے میری پالیسی میں دخل دیا، تو میں خود اس سے سمجھ لوں گا۔ اگر اس مسئلے کو سمجھ بوجھ کے ساتھ حل نہ کیا گیا تو عجب نہیں کہ ملک ہی کا خاتمہ ہو جائے۔ میں نے جو کچھ کہا ہے اس کا ایک ایک لفظ صحیح ہے اس لیے اس کے بارے میں آپ میں سے کسی کو کوئی غلط فہمی نہیں رہنی چاہیے۔"

میرا خیال ہے کہ وہ میرا مطلب سمجھ گئے۔

یوجین بلیک کی پیش کش ساٹھ کروڑ ڈالر کے لگ بھگ تھی۔ اس پر میں نے اپنے فنی مشیروں سے صلاح مشورہ کیا۔ ان سب کی یہ پختہ رائے تھی کہ منگلا کے مقام پر دریائے جہلم پر بند تعمیر کرنے کے علاوہ ہمیں تربیلا کے مقام پر بھی بند بنانے کی ضرورت ہوگی تاکہ اس میں دریائے سندھ کا فالتو پانی جمع کیا جا سکے [illegible] نہ صرف نئے انتظامات کے لیے پانی مہیا ہوگا بلکہ ترقی کے کاموں کے لیے بھی کچھ پانی مل سکے گا خصوصاً سندھ کی نہروں کے لیے۔ چنانچہ تربیلا بند کی تعمیر سے ہماری مشکل حل نہ ہوتی تھی، اس طرح تعمیر کی لاگت بقدر بیس کروڑ ڈالر بڑھ جاتی تھی۔ یہ بڑی خطیر رقم تھی۔ میں جانتا تھا کہ یوجین جب سنیں گے تو بھنا جائیں گے۔ ہوا بھی یہی۔ لیکن میں نے یہ الفاظ ان سے کہے جو مجھے اب تک یاد ہیں: "میں نے ان علاقوں کا دورہ کیا ہے جن پر ہندوستان کے پانی روکنے کا اثر پڑنے کو ہے۔ ان علاقوں کے لوگوں نے مجھ سے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ اگر ہمیں بھوک اور پیاس سے مرنا ہے تو اس سے کہیں بہتر ہے کہ ہم میدان جنگ میں جان دیں۔ ان لوگوں کو توقع ہے کہ میں انہیں اس کا موقع ضرور دوں گا۔ ہمارے فوجی جوان اور دوسرے سب لوگ بھی اسی خیال کے ہیں چنانچہ اگر تم نے دستگیری نہ کی تو سارے ملک میں اس سرے سے لے کر اس سرے تک آگ لگ جائے گی۔ یہ انسانی ہمدردی کا ایک سنگین مسئلہ ہے جس سے چشم پوشی نہیں کی جا سکتی۔

"ہم سے جو سودا کیا جا رہا ہے وہ یہ ہے کہ ہماری نہروں میں جو پانی قدرتی طور پر بہہ کر آتا ہے ہم اس سے ہاتھ دھو بیٹھیں اور اس کے بدلے میں پانی کے ذخیرے پر قناعت کریں اور پانی کے بند کی یہ کیفیت ہے کہ جیسے ہی وہ بن کر تیار ہوتا ہے اس میں گاد جمنی شروع ہو جاتی ہے علاوہ ازیں ہمیں ان بندوں اور سلسلہ ملانے والی نہروں کی تعمیر میں دس یا اس سے بھی زیادہ برس لگ جائیں گے اور اتنے ہی عرصے کے لیے ہم اپنی ترقی کی راہ میں پیچھے رہ جائیں گے۔ جتنی محنت اس کام میں صرف ہوگی اسے ہم دوسرے تعمیری کاموں پر لگا سکتے تھے۔ چنانچہ درحقیقت ہم بڑی قربانیاں کر رہے ہیں۔

"میں جانتا ہوں کہ بعض ممالک بہ کمال مہربانی ہماری امداد کر رہے ہیں لیکن جب تک ہمیں نئے انتظامات کی ضرورتوں کے علاوہ دوسری ضرورتوں کے لیے پانی نہیں ملے گا ملک میں ابتری پھیل جائے گی اس لیے تربیلا ڈیم کی تعمیر ہمارے لیے اشد ضروری ہے۔"

یوجین بلیک نے کہا، آپ نے میرے کام کو سخت مشکل بنا دیا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں امداد دینے والی حکومتوں کو بیس کروڑ ڈالر کی مزید رقم دینے پر کس طرح رضامند کر سکوں گا۔ آپ مجھے سوچنے کے لیے کچھ وقت دیں۔ میں نے کہا:

"جب بات ایسی صاف اور کھلی ہو تو اس پر سوچنے کی ضرورت ہی کیا رہ جاتی ہے"۔ غرض ہم ہر پھر کر بار بار اس مسئلے پر بحث کرتے رہے۔ آخر کار وہ ہمارے مطالبے کی حمایت پر تیار ہو گئے انہوں نے کہا: میں امداد دینے والے ملکوں سے زائد رقم کی درخواست کروں گا، جو ہمیں اس کے لیے تربیلا ڈیم کے بنانے میں خرچ کرنی ہو گی۔ انجام کار ہم سے چوہتر (۷۴) کروڑ ڈالر سے زائد رقم کا وعدہ ہو گیا۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ اس سے پہلے چودھری محمد علی دس سے لے کر پندرہ کروڑ ڈالر پر فیصلہ کرنے کو تیار تھے اور یہ رقم بھی انہیں قرض کی صورت میں ملتی۔

ہمیں دوست ممالک اور ورلڈ بینک کا شکر گزار ہونا چاہیے، جنہوں نے اس کام میں ہماری امداد کی۔ بعد ازاں انہوں نے لاگت بڑھ جانے کی وجہ سے تربیلا کی تعمیر کے لیے پینتیس (۳۵) کروڑ ڈالر یا اس کے برابر رقم دینے کا وعدہ کیا۔ اس رقم کے دلانے کا سہرا جارج ووڈز کے سر ہے جو یوجین بلیک کے بعد عالمی بینک کے صدر مقرر ہوئے تھے۔

سندھ طاس معاہدۂ آب کی بنیاد دریاؤں کی تقسیم پر رکھی گئی ہے۔ اس معاہدے کے رو سے دس برس کی عبوری مدت کے بعد جو پاکستان کی درخواست پر تین برس تک اور بڑھائی جا سکتی ہے تینوں مشرقی دریا راوی، بیاس اور ستلج بلا شرکت غیرے ہندوستان کے حصے میں چلے جائیں گے۔ اس کے برعکس تینوں مغربی دریاؤں سندھ، جہلم اور چناب کا پانی بلا شرکت غیرے پاکستان کو مل سکے گا۔ البتہ ہندوستان کو اجازت ہو گی کہ وہ اسے مقبوضہ کشمیر، مشرقی پنجاب اور ہماچل پردیش کے منبع کی طرف کے علاقوں میں محدود طور پر استعمال کر سکے۔ اس عبوری مدت میں پاکستان آبپاشی کا ایک نیا نظام تعمیر کرے گا، جس سے مغربی دریاؤں کا پانی ان نہری آبپاشی کے لیے استعمال کیا جا سکے گا جو اب تک مشرقی دریاؤں کے پانی سے ہوتی تھی۔

سندھ کے نظام آبپاشی کا پروگرام دنیا میں اپنی قسم کا سب سے بڑا پروگرام ہو گا۔ اس پر ایک ارب سات کروڑ ڈالر لاگت آئے گی جس میں سے ستاسی کروڑ ڈالر پاکستان میں خرچ

کیے جائیں گے۔ اس نظام میں دو بڑے بند پانی جمع کرنے کے لیے بنائے جائیں گے۔ ایک دریائے جہلم پر جس کے پانی کے ذخیرے کی مقدار سینتالیس لاکھ پچاس ہزار ایکڑ فیٹ ہوگی۔ دوسرا بالائی سندھ پر جس کے پانی کے ذخیرے کی مقدار چالیس لاکھ ایکڑ فیٹ ہوگی۔ علاوہ ازیں پانچ بند اور آٹھ سلسلہ ملانے والی نہریں ہوں گی، جن کی مجموعی لمبائی تقریباً چار سو میل ہوگی۔ ان نہروں کے ذریعہ مغربی دریاؤں کا پانی ان علاقوں میں پہنچے گا، جنہیں پہلے مشرقی دریا سیراب کیا کرتے تھے یعنی یہ نہریں مرکزی باری دوآب اور وادی ستلج کی نہروں کے بجائے انہی کے علاقوں میں پانی بہم پہنچائیں گی۔ جہلم ڈیم پر پاور اسٹیشن قائم کیے جائیں گے جو آٹھ لاکھ کلو واٹ سے زیادہ بجلی پیدا کر سکیں گے۔ ان کے علاوہ ٹیوب ویل لگائے جائیں گے اور پانی کی نکاسی کا بندوبست کیا جائے گا، تاکہ آبپاشی کے علاقے میں جس کا رقبہ پچیس لاکھ ایکڑ ہے سیم اور تھور کا تدارک ہو سکے۔ جب تک اس نظام کی تعمیر کا کام جاری رہے گا ہندوستان طے شدہ پروگرام کے تحت مشرقی دریاؤں کا پانی دیتا رہے گا۔ اس پروگرام میں پاکستان کی بعض ترقیاتی ضرورتوں کو بھی پیش نظر رکھا جائے گا۔

ان طویل طویل مذاکرات کے دوران میں یہ بات ظاہر ہو گئی کہ پاکستان اور ہندوستان میں آبپاشی کے اس نظام پر جس کو دونوں حکومتوں نے باہمی سمجھوتے کے تحت منظور کر لیا ہے۔ اس قدر زیادہ لاگت آئے گی کہ وہ ان دونوں ملکوں کی بساط سے کہیں باہر ہوگی۔ اس پر عالمی بینک نے اس سارے پروگرام پر روپیہ لگانے کے لیے "طاس سندھ کی ترقیات کا فنڈ" کے نام سے ایک فنڈ قائم کیا۔ ہندوستان نے اس فنڈ میں سترہ کروڑ چالیس لاکھ ڈالر دینے کا ذمہ لیا۔ پاکستان میں اس نئے نظام آبپاشی کی تعمیر پر جو لاگت آئے گی وہ اسی طاس سندھ کے فنڈ سے دی جائے گی۔

اس معاہدے کی تفصیلات سے ظاہر ہے کہ سندھ کے نظام آبپاشی کے مجموعی پانی میں سے اسی (۸۰) فیصدی پاکستان کو ملے گا اور بیس فیصدی ہندوستان کو۔ اس معاہدے پر ۱۹ ستمبر ۱۹۶۰ء کو کراچی میں میں نے مسٹر نہرو نے اور عالمی بینک کے وائس پریذیڈنٹ نے دستخط کیے۔

جیسا کہ میں نے اس معاہدے پر دستخط کرنے کے وقت اپنی قوم سے بیان کیا تھا یہ حل جسے انجام کار ہم نے منظور کر لیا، ایسا تو نہ تھا جسے مثالی کہا جا سکتا لیکن موجودہ حالات میں اس سے بہتر بھی ممکن نہ تھا۔ یہ نہ بھولیے کہ اس جھگڑے نے ایسی نازک صورت اختیار کر لی تھی کہ اس برصغیر میں جنگ چھڑ جانے میں کوئی کسر باقی نہ رہ گئی تھی۔ چنانچہ اسی خطرے نے ۱۹۵۱ء میں عالمی بینک کو ہمارے جھگڑے میں ثالث بننے پر مجبور کر دیا تھا۔ ہمارے لیے اس کے سوا کوئی چارہ ہی نہ تھا کہ ہم کچے دل اور پکے ارادے کے ساتھ اس جھگڑے کا جو دونوں ملکوں کے امن کو ملیامیٹ کیا چاہتا

تھا معقول حل تلاش کرنے میں عالمی بینک کا ہاتھ بٹائیں۔ کوئی ایسا حل جو ہم کو زندہ رکھ سکے، جو ہمارے لیے مالی اور فنی وسائل مہیا کر دے جن سے کام لے کر ہم مغربی دریاؤں کا پانی اپنی نہروں میں لانے کا انتظام کر سکیں اور ہماری نہریں مشرقی دریاؤں کی محتاج نہ رہیں۔

سال ہا سال کی نہایت پیچیدہ گفت و شنید، صبر آزما رد و کد اور بحث و تعلل اور آئے دن کے تعطل کے بعد ہمیں ایک ایسا حل مل گیا تھا جو میرے خیال میں مناسب تھا۔ ہر چند اس معاہدے پر دستخط ہو جانا کوئی ایسی بات تو نہ تھی جس پر خوشی کے شادیانے بجائے جاتے، تاہم یہ احساس بھی کچھ کم موجب اطمینان نہ تھا کہ ایک نہایت بھیانک صورتحال ٹل گئی۔

جب انسان اس قسم کے نازک مسئلے سے دوچار ہوتا ہے تو اسے حقیقت پسند بننا اور صورت حال پر ٹھنڈے دل سے غور کرنا ہی پڑتا ہے تاکہ وہ اس کے حل کی کوئی معقول صورت نکال سکے۔ اکثر اوقات سارے کی طلب میں انسان آدھے سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ ہم نے خیالی حل کی جستجو ترک کر دی۔ حالات پر مجموعی حیثیت سے نظر ڈالی، حقیقت پسندانہ غور و خوض کیا اور حل کو اچھا سمجھ کر قبول کر لیا۔ اگر ہم ایسا نہ کرتے تو ممکن تھا کہ ہم ایک ایسے وقت جنگ میں الجھ جاتے جبکہ حالات کئی لحاظ سے ہمارے لیے سازگار نہ تھے۔ چنانچہ جہاں تک ہمارا تعلق تھا اس عہد نامے کی بنیاد حقیقت پسندی اور عملی اصول پر رکھی گئی تھی۔ جذبات کو اس میں دخل نہ تھا اور نہ ہو سکتا تھا کیونکہ اس حل سے لاکھوں انسانوں کا مستقبل اور عافیت وابستہ تھی۔ میں پریذیڈنٹ بلیک، وائس پریذیڈنٹ آئلف اور عالمی بینک کے فنی ماہروں کی جماعت کی کوششوں کو جس کے سربراہ جنرل وہیلر تھے، سراہے بغیر نہیں رہ سکتا۔ انہوں نے اس جھگڑے کو ایک فنی اور انسانی مسئلے کی صورت بخش دی اور اس کا درجہ سیاسی نزاع سے بلند کر دیا۔

ہم ان دوست حکومتوں کے بھی شکر گزار ہیں جنہوں نے طاس سندھ کی ترقیات کے فنڈ میں عطیے دے کر ہمارے لیے سمجھوتے کی شرائط کو قابل قبول بنانے میں آسانی پیدا کر دی۔ اس انتظام کی لاگت کا بار اٹھانا ہماری بساط سے کہیں باہر تھا۔ ان دوست ملکوں نے جن میں امریکہ، دولت مشترکہ، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، کینیڈا اور مغربی جرمنی شامل ہیں، بلا تامل مالی امداد کی پیشکش کر کے واضح کر دیا کہ انہوں نے نہ صرف اس معاملے کو ہمدردانہ طور پر سمجھنے کی کوشش کی بلکہ وہ دنیا کے اس متاثرہ خطے کے استحکام اور سلامتی کو برباد ہوتے نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ عالمی بینک نے اپنے طرز عمل سے دنیا کے سامنے اس امر کی بہت عمدہ مثال پیش

کی کہ فراخ دلی اور نیک نیتی کے ذریعے گتھیاں کیسے سلجھائی جا سکتی ہیں۔ میں یہاں یہ بھی بیان کر دینا چاہتا ہوں کہ گفت و شنید کے آخری مرحلوں میں مسٹر نہرو نے اپنا ذاتی اثر استعمال کر کے کئی الجھنوں کو دور کر دیا تھا، جو عبوری مدت کے انتظامات کے بارے میں پیدا ہو گئی تھیں۔

معاہدے کی بات چیت کے آخری مرحلوں میں جو جذبہ نظر آتا تھا اسے دیکھ کر مجھے امید پیدا ہوئی کہ شاید کشمیر کا مسئلہ بھی منصفانہ طور پر صلح صفائی کے ساتھ حل ہو جائے۔ اب چونکہ پاکستان کو صرف تین مغربی دریاؤں پر قناعت کرنا تھا اس لیے ان کے بالائی حصوں پر اختیار رکھنا ہمارے لیے اور بھی ضروری ہو گیا تھا، تاکہ ہم ان دریاؤں کے پانی کو کام میں لا کر پاکستان کی بڑھتی ہوئی ضرورتیں پوری کر سکیں۔ چنانچہ اس معاہدے کی تکمیل کے بعد مجھے مسئلہ کشمیر اور بھی زیادہ اہم اور فوری حل کا محتاج نظر آنے لگا۔

اس معاہدے پر دستخط ہو جانے کے بعد ہمارے قومی معاملات میں طویل اور تشویشناک رد و کد اور امید و بیم کا ایک باب ختم ہو گیا، اور ان تھک محنت کا ایک نیا باب شروع ہوا تاکہ ہم پانی کے نئے نظام کے لیے عظیم الشان ذخیرے اور لمبی لمبی سلسلہ ملانے والی نہریں تیار کر سکیں۔ ہمیں امید ہے کہ ہم ۱۹۷۰ء تک اس کام کو مکمل کر لیں گے۔ اس کے بعد ہم پانی کی بہم رسانی کے لیے ہندوستان کے محتاج نہ رہیں گے۔

(۹)

آئین اور نظریۂ حیات

پاکستان کے آئینی مسئلے کی بابت میرے طرزِ فکر کی وضاحت کے لیے کچھ عرصے پیچھے کی طرف لوٹنا پڑے گا۔ ۲۔ اکتوبر ۱۹۵۴ء کو میں لندن کے ایک ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا۔ میں امریکہ جاتے ہوئے دو دن کے لیے لندن رک گیا تھا۔ رات گرم گرم سی تھی۔ مجھے نیند نہ آئی، لیکن اس کی وجہ محض گرمی نہ تھی۔ وطن سے بڑی بڑی خبریں آ رہی تھیں، شگون کچھ اچھے نہ تھے۔ میں مضطرب تھا کیونکہ میں نے سنا تھا کہ گورنر جنرل غلام محمد خدا جانے کیا کر بیٹھنے والے ہیں۔ ان میں اور وزیراعظم محمد علی بوگرہ میں ٹھن گئی تھی۔ میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ غلام محمد مجھے سیاسیات میں گھسیٹنا چاہیں گے، جس سے میں خاص طور پر بچنا چاہتا تھا۔

میں کمرے میں ٹہل رہا تھا کہ میں نے اپنے آپ سے کہا "آؤ ذرا فوجی طریق پر اپنے خیالات تو قلمبند کریں۔ ملک میں کیا خرابی پیدا ہو گئی ہے اور اس کا علاج کیا ہے؟" میں نے اس معاملے کو اس انداز سے دیکھا جس طرح کوئی فوجی صورت حال کا جائزہ لیتا ہے۔ مسئلہ کیا ہے؟ کن عناصر نے اسے الجھا رکھا ہے؟ اور اگر اس کا کوئی حل ہو سکتا ہے تو وہ حل کیا ہے؟ چنانچہ میں اپنے کمرے میں میز کے پاس بیٹھ گیا اور لکھنا شروع کر دیا۔ شروع شروع میں میرے خیالات الجھے الجھے سے تھے۔ لیکن جلد ہی ہر بات روشن ہو گئی۔ چند گھنٹوں ہی میں میں نے ایک دستاویز تیار کر لی، جس میں میں نے ملک کے موجودہ مسائل پر خیال آرائی کی تھی اور اپنا نقطۂ نگاہ پیش کیا تھا۔ میں اس نتیجے پر پہنچا کہ ملک کے حالات ابتر ضرور ہیں لیکن نہ ایسے کہ ان کی اصلاح ہی نہ ہو سکے۔ وہ دستاویز یہ ہے:-

پاکستان کے موجودہ اور آئندہ مسائل کا جائزہ

مقصد:

۱۔ پاکستان کا بنیادی مقصد یہ ہونا چاہیے کہ وہ ایک مضبوط ٹھوس اور متحد قوم بنے تاکہ تاریخ عالم میں جو کام اس کے مقدر ہو چکا ہے اسے بجا لاسکے۔ یہ مقصد تبھی حاصل ہو سکتا ہے کہ ابتدا ہی سے ایک ایسا آئین وضع کیا جائے جو عوام کے مزاج کے مطابق اور ان حالات پر مبنی ہو جن سے وہ دوچار ہیں تاکہ وہ یک جہتی، اتحاد عمل اور تخلیقی ترقی کی راہ پر گامزن ہو سکیں۔

۲۔ ظاہر ہے کہ ایسا آئین وضع کرنے سے پہلے بعض ابتدائی اقدامات کرنے ضروری ہونگے۔ تاکہ یہ آئین بلا کسی رکاوٹ کے پروان چڑھ سکے۔ چنانچہ ایسے ابتدائی اقدامات کرنا پاکستان کا فوری مقصد ہے۔

عناصر:

عام

۳۔ (الف) پاکستان کے باشندے طرح طرح کی نسلوں کے ہیں۔ ہر نسل کا تاریخی پس منظر اور تمدن جداگانہ ہے۔ آبادی کا بڑا حصہ مشرقی پاکستان کے رہنے والوں کا ہے۔ یہ لوگ غالباً ہندوستان کی قدیم ترین نسلوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ کہنا شاید مبالغہ نہ ہوگا۔ کہ پاکستان کے وجود میں آنے سے پہلے انہیں حقیقی معنوں میں کبھی آزادی اور خود مختاری نصیب نہ ہوئی تھی۔ ان پر کبھی ذات پات والے ہندو حکمران تھے۔ کبھی مغل اور پٹھان اور کبھی انگریز۔ علاوہ ازیں ان پر ہندوؤں کے تہذیب و تمدن اور زبان کا خاصا اثر رہا ہے، جو ابھی تک زائل نہیں ہوا۔ ان کی ذہنی کیفیت بالکل ویسی ہے جیسی ستم زدہ اور مظلوم اقوام کی ہوتی ہے اور وہ ابھی تک نئی حاصل شدہ آزادی کے تقاضوں کے مطابق خود کو نفسیاتی طور پر ڈھال نہیں سکے۔ ان کی عام ذہنی الجھنیں یہ ہیں:۔

کم آمیزی، شک وشبہ اور ایک قسم کی مدافعانہ جارحیت پسندی۔ ان کا باعث غالباً ان کا یہی تاریخی پس منظر ہے۔ چنانچہ دانش مندی کا تقاضا ہے کہ ان عناصر کو تسلیم کر کے ان کا تدارک کیا جائے، اور مشرقی پاکستان والوں کے دل میں یہ احساس پیدا کیا جائے کہ وہ حکومت میں برابر کا ساجھا رکھتے ہیں، تاکہ وہ ملک

کے لیے قیمتی سرمایہ ثابت ہوں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انھیں اس ساجھے داری میں معقول حصہ دیا جائے۔

(ب) اس کے برعکس مغربی پاکستان کے باشندے بہت سی مخلوط نسلوں کے ہیں۔ اس قسم کی آبادی کی نظیر دنیا میں شاید ہی کہیں اور مل سکے۔ چونکہ یہ خطہ برصغیر ہندو پاکستان کے دروازے پر واقع ہے، اس لیے یکے بعد دیگرے جو فاتح قوم بھی ادھر آئی وہ لازمی طور پر اپنے نشان چھوڑتی گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نسلوں کے اس جبری اختلاط کے باعث خیالات، نقطۂ نگاہ اور تہذیب و تمدن میں بھی اختلاط پیدا ہوا، حالانکہ یہاں اب بھی مختلف بولیاں بولی جاتی ہیں۔ جنگی اور اقتصادی لحاظ سے بھی اس سارے خطے کا مستقبل ایک ہی ہے۔ اس سے یاد رہے۔ چونکہ یہ دریائے سندھ کے طاس اور اس کے معاونوں کے درمیان واقع ہے اس لیے اس کی آئندہ اقتصادی ترقی کے لیے ضروری ہے کہ اسے ایک سالم خطہ قرار دیا جائے تاکہ بہتر سے بہتر نتائج حاصل ہو سکیں۔ ان سب باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ مغربی پاکستان کو ایک وحدت میں سمو دینا لازمی ہے، اور تمام مصنوعی حد بندیاں کسی قسم کی مخالفت کی پروا کیے بغیر ختم کر دی جائیں۔ کیونکہ یہ حد بندیاں قدرتی نہیں بلکہ سیاست دانوں کی قائم کردہ ہیں۔ اس طرح ایک تو یہ پورا خطہ مناسب طور پر ترقی کر سکے گا، دوسرے شمال یا جنوب سے حملے کی صورت میں دفاع کی پشت پناہ ثابت ہو گا۔ لیکن اس خطے کو ایک وحدت قرار دیتے وقت لوگوں کے تعصبات، ان کے اندیشوں اور ان کی آئندہ متوازن ترقی کا بھی خیال رکھنا ہو گا۔ چنانچہ اس وحدت کو مختلف حصوں میں اس طرح تقسیم کیا جائے کہ ہر ایک حصہ علیحدہ نسلی گروہ یا گروہوں کا حامل ہو، جو مشترکہ معیشت، مواصلات اور ترقی کے مشترکہ امکانات رکھتے ہوں اور ہر حصے کو زیادہ سے زیادہ انتظامی اختیارات تحویل کر دیے جائیں۔

(ج) مغربی پاکستان میں ایک یونٹ کا قیام اسی صورت میں ممکن ہے کہ یہاں کا سب سے بڑا صوبہ سب کی بھلائی کے لیے فراخ دلی دکھانے اور ایثار کرنے پر آمادہ ہو جائے۔ مغربی پاکستان میں پنجاب سب سے بڑا اور اہم صوبہ ہے جس کی آبادی پورے مغربی پاکستان کی نصف آبادی سے بھی زیادہ ہے۔ اگر پنجاب نے اپنی آبادی کے تناسب کے مطابق نمائندگی پر اصرار کیا تو دوسرے صوبے

وزارتیں بٹ جائیں گے۔ علاوہ ازیں اگر کسی ساجھے داری میں کوئی فریق، سب حیثیت رکھتا ہو تو وہ چل نہیں سکتی۔ چنانچہ اپنی بقا، در پاکستان کی عظمت کے لیے پنجاب سے درخواست کی جائے کہ وہ اس یونٹ کی مجلس قانون ساز میں چالیس فی صدی نمائندگی منظور کرلے مگر دوسرے صوبوں کی نمائندگی اپنی اپنی آبادی کے تناسب ہی سے ہو۔ لیکن ایسا ایک یونٹ قائم کرنے سے پہلے موجودہ صوبائی اور مرکزی قانون ساز مجلسوں اور وزارتوں کو توڑ دینا ہوگا تاکہ وہ نئی تنظیم کے اس کام میں نہ تو دخل دے سکیں اور نہ روڑے اٹکا سکیں۔ مندرجہ بالا تنقیحات سے نتائج :۔

(۱) مشرقی بنگال کو ایک وحدت قرار دیا جائے، اور ملک کے انتظام میں اس کا زیادہ سے زیادہ ساجھا رکھا جائے۔

(۲) مغربی پاکستان کو تنظیم نو کے ذریعے ایک وحدت بنایا جائے اور اس کا بھی ویسا ہی ساجھا رکھا جائے۔

(۳) نئی تنظیم کی رفتار کو تیز کرنے کے لیے موجودہ وزارتیں اور مجالس قانون ساز توڑ دی جائیں۔

(۴) ہر ایک وحدت کو سہولت کے لیے تحتی وحدتوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ ہر ایک تحتی وحدت ایک یا ایک سے زیادہ ایسے نسلی گروہوں کی حامل ہو جو مشترکہ معیشت، مواصلات اور ترقی کے مشترکہ امکانات رکھتے ہوں۔ ان تحتی یونٹوں کو زیادہ سے زیادہ انتظامی اختیارات دے دیے جائیں۔

(۵) پنجاب سے کہا جائے کہ وہ وحدت مغربی پاکستان کی مجلس قانون ساز میں چالیس فی صد نمائندگی منظور کرلے تاکہ دوسروں پر حاوی ہونے کا اندیشہ دور ہو جائے۔

(۶) مشرقی اور مغربی دونوں وحدتوں کی اپنی اپنی الگ مجلس قانون ساز ہو۔

۴۔ مندرجہ بالا امور پر عمل کرنے سے نسلی فریق کے دوسروں پر غالب آنے یا تفریق پیدا کرنے کا اندیشہ نہ رہے گا۔ ہر ایک یونٹ یک جہتی کے ساتھ اندر باہر کی روک ٹوک ترقی کر سکے گا۔ صوبائی عصبیت انتہائی طور پر ختم ہو جائے گی۔ صوبائی انتظامیہ کے بہت سے بھاری بھرکم عملے ختم ہو جائیں گے۔ اس سے آدمیوں کی بھی بچت ہوگی اور اخراجات کی بھی۔ مقامی منتظمین کے کاموں میں سیاست دانوں کی ــــــ

دخل اندازی کا خدشہ دور ہو جائے گا۔ یوں اس نئی تنظیم سے ہر طرح فائدے ہی فائدے ہوں گے۔

ہر ایک یونٹ کا انتظامی ڈھانچہ:۔

۵۔ پاکستان میں دو صوبائی یونٹ قائم کر دینے کے بعد ہر ایک یونٹ کے لیے انتظامی ڈھانچہ تجویز کرنے کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ اس کا جواب دینے سے پہلے اس بات کو جتا دینا مناسب ہوگا کہ ہمارا مقصد بہر صورت پاکستان میں جمہوریت کا قیام ہونا چاہیے۔ لیکن ایسی جمہوریت جو عوام کی افتادِ طبع کے مطابق ہو۔ ہمارے عوام کی اکثریت غیر تعلیم یافتہ ہے اور ہمارے سیاست داں کچھ زیادہ محتاط واقع نہیں ہوئے ہیں۔ عوام بڑے بڑے کام کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں مگر وہ آسانی سے گمراہ بھی ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ ایسی جمہوریت جس پر کوئی روک ٹوک نہ ہو خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔ بخاص طور پر آج کل جبکہ اشتراکیت ملک کے اندر اور باہر سے جمہوریت کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھانے کی تاک میں لگی رہتی ہے۔ چنانچہ ہمیں ایک منضبط جمہوریت اور اس کے ساتھ روک ٹوک کا ایک سلسلہ قائم کرنا ہوگا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ مجلس قانون ساز کابینہ کو چنے گی، کابینہ کی کارروائیوں پر گورنر قابو رکھے گا، اور گورنر پر ملک کا سربراہ یعنی صدر قابو رکھے گا۔ بعض حالات میں گورنر کو اختیار ہوگا کہ وہ وزیروں یا وزارتوں کو برطرف کر سکے۔ اسے یہ حیثیت بھی حاصل ہوگی کہ سروسوں کے حقوق کی نگرانی کرے اور ان سے ان کے فرائض کی بجاآوری کا مطالبہ کر سکے۔

۶۔ مجالس قانون ساز کے انتخابات کے سلسلے میں حق رائے دہی کا جو قاعدہ بن چکا ہے، اس کی خامی کے باوجود اس سے روگردانی نہیں کی جا سکتی۔ البتہ اس کا علاج یہ ہے کہ اس کی بھی نگرانی کی جائے تاکہ یہ غیر ذمہ دارانہ نہ ہو جائے۔ ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ جمہوریت ایک مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے بطور خود مقصد نہیں ہے اور جمہوریت کا ایسا کوئی مستقل ڈھانچہ نہیں ہے جو بغیر ترمیم و اصلاح کے ہر ملک میں اپنا لیا جائے۔ چنانچہ یہ بات قرین مصلحت ہوگی کہ پہلے ہر تحتی یونٹ میں عوام ایک انتخابی ادارہ قائم کریں۔ اور پھر وہ انتخابی ادارہ صوبائی اور مرکزی مجالس قانون ساز کے ممبروں کو چنے۔ انتخاب کے اس طریقے کا انتظام آسانی سے

سے ہو سکے گا، اور اس سے ذمہ داری کا احساس بڑھے گا۔

(۷) رہا یہ سوال کہ صوبائی اور مرکزی مجالس قانون ساز کے ممبروں کی تعداد کتنی ہو اور یہ مجالس کس ڈھب کی ہوں، ممکن ہے اس معاملے میں کچھ اختلاف رائے ہو، لیکن افراد اور اخراجات کی بچت کا تقاضہ ہے کہ ہر ایک صوبے کی مجلس قانون ساز کے لیے ڈیڑھ سو سے زیادہ ممبر نہ ہوں۔ مرکزی مجلس قانون ساز کے لیے بھی جس کا ذکر بعد میں آئے گا ممبروں کی اتنی ہی تعداد کافی ہوگی۔

۸۔ اب ملکی انتظام کو لیجیے۔ ہمارا قانونی نظام بڑا پیچیدہ، مہنگا، غیر موثر، سست رفتار، ظالمانہ اور ہمارے عوام کے مزاج کے سخت منافی ہے۔ ضرورت ہے کہ اس کی از سر نو تنظیم کی جائے اور اسے انسان دوست، زود حرکت اور سستا بنایا جائے۔ شاید اس کا علاج جرگے اور عدالت کا ملا جلا طریق رائج کرنے سے ہو سکے۔ گواہی اور عدالتی کارروائیوں کے طریق کی اصلاح کی جائے اور صرف ایک اپیل کا حق دیا جائے۔ ہر ایک تحتی یونٹ میں اعلیٰ ترین عدالت قائم کی جائے جس میں آئینی مقدموں کو چھوڑ کر دوسرے مقدمے پیش کیے جائیں۔ فیڈرل یا صوبائی کورٹ صرف آئینی نوعیت کے مقدموں کا فیصلہ کریں۔

مندرجہ بالا تنقیحات سے نتائج:

(۱) ہر صوبے میں ایک مجلس قانون ساز ہو جس کے تقریباً ڈیڑھ سو ممبر ہوں ہر ایک صوبے کا ایک گورنر ہو جس کا تقرر صدر کرے۔ گورنر کو کابینہ اور پروسوں کی نگرانی کا اختیار حاصل ہو۔

(۲) ہمہ گیر حق رائے دہی کے طریقے سے انتخابی ادارے چنے جائیں۔ پھر یہ ادارے صوبائی مجلس قانون ساز اور مرکزی مجلس قانون ساز کے ممبروں کا انتخاب کریں، نیز یہ ادارے صدر کا انتخاب بھی کریں جس کا ذکر آگے آئے گا۔

(۳) قانونی نظام کو آسان بنایا جائے اور اس کے اختیارات ابتدائی یونٹوں کو تفویض کر دیے جائیں۔ جرگے اور عدالت کے ملے جلے طریق کی آزمائش کی جائے۔

(۴) سرکاری ملازموں کی شرائط ملازمت میں ایسی ترمیم کی جائے کہ ان کے انعام یا سزا کے معاملوں کا فیصلہ فوری طور پر کیا جا سکے۔

مرکزی ڈھانچہ :

۹ - ملک کو دو یونٹوں میں تقسیم کر دینے کے بعد ان کا وفاق بنانا آسان کام ہو گا۔ یہ وفاق مساویانہ بنیاد پر ہونا چاہئے تاکہ ایک حصے کے دوسرے حصے پر غلبہ پانے کا اندیشہ باقی نہ رہے۔ یہ وفاق ایک مجلس قانون ساز پر مشتمل ہو جس کے ممبروں کی تعداد تقریباً ڈیڑھ سو ہو۔ اس میں نصف ممبر مشرقی پاکستان کے ہوں اور نصف مغربی پاکستان کے اور اس کی ایک کابینہ ہو جس کو مجلس قانون ساز کی تجویز کے مطابق صدر کی نگرانی میں منتظمانہ اختیارات حاصل ہوں۔ صدر بذریعۂ انتخاب چنا جائے۔ صدر ملک کا سب سے بڑا عہدہ دار ہو جس کے ہاتھ میں تمام اختیارات ہوں۔ جب کبھی صوبوں یا مرکز میں حالات قابو سے باہر ہو جائیں تو ان کو درست کرنا صدر ہی کا کام ہو۔ قوانین اس وقت تک نافذ نہ ہو سکیں جب تک صدر انہیں منظور نہ کرے۔ البتہ ایسے قوانین اس قاعدے سے مستثنیٰ رہیں جن کو مجلس قانون ساز کی تین چوتھائی اکثریت پاس کر چکی ہو۔ صدر کی منظوری کے بغیر آئین میں کسی قسم کی تبدیلی نہ کی جائے۔ اگر صدر اور مجلس قانون ساز میں سخت اختلاف پیدا ہو جائے تو کسی ایک یا دونوں کے تازہ انتخاب کرانے کی شرط رکھی جائے۔ صدر کے انتخاب اور قوانین کی منظوری کے بارے میں شاید محمد علی والے فارمولے کو منظور کر لینا مزید ہو۔

۱۰ - اوپر بیان کردہ وجوہات کی بنا پر صوبوں کو زیادہ سے زیادہ خود مختاری دی جائے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جن محکموں کے اختیارات انھیں پہلے سے حاصل ہیں ان میں مواصلات (بین صوبائی مواصلات کے علاوہ) صنعت و حرفت تجارت صحت وغیرہ کا اور اضافہ کیا جائے۔ دفاع امور خارجہ اور کرنسی مرکزی حکومت کے پاس رہے۔

۱۱ - اپنے وسائل کو جلد تر ترقی دینا اور عوام کا معیارِ زندگی بلند کرنا ایک بڑا اہم مسئلہ ہے جسے پاکستان کو حل کرنا ہے۔ یہ مؤثر طریق پر جبھی ہو سکتی ہے کہ ہم اپنے تعلیمی نظام میں مناسب اصلاح کریں تاکہ موزوں آدمی مہیا ہو سکیں۔ نیز ہمارے پاس اچھی تنظیم اور اچھے سرمائے والے ادارے بھی ہوں تاکہ وہ ترقی کے بڑے بڑے منصوبوں کو ہاتھ میں لے سکیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر ایک صوبے

میں پاکستان صنعتی ترقیاتی کارپوریشن کی طرز کے ترقیاتی ادارے قائم کئے جائیں تاکہ وہ صنعت در حرفت، اراضی، بجلی وغیرہ، بیسیوں اور کاموں کے لیے بھی بنائے جائیں۔ اس طرح مقامی انتظامیہ کو بہت سی دردسری سے چھٹکارا مل جائے گا۔ اور ملک جلد جلد ترقی کرے گا۔

۱۲۔ تاہم جب تک ہم سائنسی طریق سے زرعی اصلاحات نافذ نہ کریں کچھ زیادہ فائدہ نہ ہوگا۔ صرف چند افراد کے بڑی بڑی اراضی کے مالک ہونے کا اب کوئی جواز نہیں رہا۔ انہیں معاوضہ دے کر یہ زمینیں حاصل کی جائیں۔ اس سلسلے میں مصریوں کی مثال بہت عمدہ ہے۔ وہ زمیندار کے پاس ایک مقررہ حد تک زمین رہنے دیتے ہیں، باقی خرید کر کاشت کاروں میں تقسیم کر دیتے ہیں۔ اور کاشت کار اس زمین کی قیمت ستر (۷۰) سالانہ قسطوں میں ادا کرتے ہیں۔

۱۳۔ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ صدر کے ہاتھ میں کل اختیارات دے دینے چاہئیں۔ صدر اپنے فرائض جبھی ادا کر سکتا ہے کہ سروسیں براہ راست اس کے ماتحت ہوں۔ اس مقصد کے لیے ایک سپریم کمانڈر کی سربراہی میں جوائنٹ سٹاف کا طریقہ رائج کرنا پڑے گا۔ اس سپریم کمانڈر کا تقرر صدر کرے گا۔ سپریم کمانڈر کو علاوہ اور فرائض انجام دینے کے ڈیفنس ممبر اور از روئے عہدہ کابینہ کا ممبر بھی ہونا چاہیے۔ اس سے سروسوں میں یک جہتی پیدا ہوگی اور سروسوں کی مشترکہ ضرورتوں کا کفایت کے ساتھ بھی انتظام ہو سکے گا۔ نیز اس کی وجہ سے سیاست داں اپنے ذاتی مفاد کے لیے سروسوں کے اندرونی معاملوں میں دخل بھی نہ دے سکیں گے۔

۱۴۔ پچھلے سات سال کے تجربے سے یہ بات ظاہر ہو گئی ہے کہ مبہم اور فرسودہ نعروں کا استعمال کس قدر خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ ہر شخص کہتا ہے کہ ملک میں اسلامی جمہوریت رائج کی جائے۔ مگر یہ کوئی نہیں بتاتا کہ اس کی نوعیت کیا ہوگی اور وہ عام جمہوریت سے کن باتوں میں مختلف ہوگی۔ شاید اس کی وضاحت ممکن ہی نہ ہو۔ تو پھر کیا یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ کوئی بھی جمہوریت جس پر قرآن کی روح کے مطابق عمل کیا جائے اسلامی ہو سکتی ہے ہم اسلامی جمہوریت کا یہ تصور قبول کریں تو شاید بہتر ہو اور ہم بہت سی اونچ نیچ سے بچے رہیں۔

منصوبے کا خاکہ:۔

۱۰۔ پہلے مغربی پاکستان میں صوبائی وزارتوں اور مجالس قانون ساز کو منسوخ

مربیا بنانے اور ایک گورنر کے ماتحت مرزدی عملے کے ساتھ ایک صوبہ قائم کردیا جائے۔

۱۶ ۔ مشرقی بنگال اور مغربی پاکستان میں تحتی یونٹ قائم کئے جائیں جو کمشنر کے ڈویژن کے مساوی ہوں۔ ہر ڈویژن میں ایک یا ایک سے زیادہ مشترک نسلی گروہ شامل ہوں، جو مشترک زبان، مشترک معیشت اور مواصلات اور ترقی کے مشترک امکانات رکھتے ہوں۔ ہر ڈویژن کو انتظامی اختیارات تحویل کردیے جائیں تاکہ ڈویژن کا سربراہ نظم ونسق کا مختار اعلیٰ بن سکے۔

۱۷ ۔ قانونی نظام میں ایسی اصلاح کی جائے کہ یہ سستا اور تیز رفتار بن سکے ہر ڈویژن میں اعلیٰ ترین عدالت قائم کی جائے جو اپیلیں سننے کا اختیار رکھتی ہو۔ اس عدالت میں ان مقدموں کو چھوڑ کر جو آئینی قانون کے نکات سے تعلق رکھتے ہوں، دوسرے تمام مقدمے پیش کئے جائیں۔ آئینی نوعیت کے مقدموں کے لیے ہر صوبے میں ایک فیڈرل کورٹ یا ہائی کورٹ بنا دینا کافی ہوگا۔ جرگا اور عدالت کا ملا جلا طریق وضع کیا جائے۔ عدالتی کارروائیوں کو آسان بنایا جائے۔

۱۸ ۔ ہر صوبے میں تعلیم، پانی اور بجلی، زرعی اصلاحات اور ترقی، گھریلو صنعتوں وغیرہ کے بارے میں ترقیاتی بورڈ قائم کئے جائیں۔

۱۹ ۔ تینوں سروسوں کے لیے ایک سپریم کمانڈر کی سربراہی میں ایک جوائنٹ سٹاف قائم کیا جائے۔ سپریم کمانڈر کے دیگر فرائض کے علاوہ اسے ڈیفنس ہمراز وہ نئے عہدہ مرکزی کابینہ کا ممبر بھی بنایا جائے۔ وہ براہ راست صدر کے ماتحت ہو۔

۲۰ ۔ مرکزی حکومت ایک مجلس قانون ساز، ایک کابینہ اور صدر پر مشتمل ہو۔ مجلس قانون ساز کے ممبروں کی تعداد تقریباً ڈیڑھ سو ہو۔ اس میں نصف مشرقی پاکستان کے ہوں اور نصف مغربی پاکستان کے۔ صدر کو اختیارات کلی حاصل ہوں تاکہ جب کبھی صوبوں اور مرکز میں حالات قابو سے باہر ہوجائیں تو وہ انتظام اپنے ہاتھ میں لے سکے۔ ایک صوبے کو دوسرے صوبے پر بے جا غلبہ حاصل کرنے سے روکنے کے لیے صدر کے انتخاب اور مسودہ قوانین کی منظوری کے بارے میں محمد علی کے فارمولے پر عمل کیا جائے۔

۲۱ ۔ مشرقی پاکستان کی صوبائی حکومت ایک مجلس قانون ساز پر مشتمل ہو، جس کے تقریباً ڈیڑھ سو ممبر ہوں۔ اس کی سربراہ کابینہ ہو۔ صوبے کا ایک گورنر ہو،

جس کا تقرر صدر کرے۔ گورنر کو کابینہ اور مردموں پر کسی حد تک اختیار حاصل ہو۔
اسی قسم کا انتظام مغربی پاکستان میں بھی کیا جائے۔ مگر اس فرق کے ساتھ کہ پنجاب
کو مجلس قانون ساز میں چالیس فی صد نمائندگی دی جائے اور باقی کی نشستیں
دوسرے صوبوں میں ان کی آبادی کے تناسب سے تقسیم کر دی جائیں۔

۲۲ ۔ صوبوں کو زیادہ سے زیادہ خود مختار بنایا جائے، مرکز کے پاس صرف
دفاع، امور خارجہ، کرنسی اور صوبوں کے درمیان مواصلات کے محکمے رہیں۔

۲۳ ۔ سرکاری ملازموں کے قواعد ملازمت میں ایسی ترمیم کی جائے کہ ان کے
انعام یا سزا دینے کے معاملوں کا فوری طور پر فیصلہ کیا جا سکے۔

۲۴ ۔ انتخاب بالغ رائے دھندگان کے ذریعے ہو۔ رائے دھندگان ہر
ڈویژن میں انتخابی ادارے منتخب کریں، اور پھر یہ انتخابی ادارے صدر، مرکزی و
صوبائی مجالس قانون ساز کے ممبر چنیں۔

۲۵ ۔ آخر میں دعا کی جائے کہ اس آئین پر قرآن کی روح کے مطابق عمل
کیا جا سکے۔ اگر ایسا ہوا تو ہماری یک جہتی اور طاقت مسلّم اور ہمارا مستقبل
شاندار ہوگا۔

(۲)

جب گورنر جنرل غلام محمد نے مجھے ملک کا انتظام سنبھالنے کی پیش کش کی
تھی اور میں نے منظور نہ کیا تھا، اس کے کچھ ہی دن بعد انھوں نے مجھ سے کہا،
"اچھا تو تمہیں ایک کام ضرور کرنا چاہئے۔ تم کابینہ میں شامل ہو جاؤ۔" چنانچہ میں
کابینہ میں شامل ہو گیا۔ میں نے سب سے پہلے کام یہ کیا کہ گورنر جنرل اور اپنے کابینہ
کے رفقائے سے کہا کہ ہمیں تعمیری کام کرنا ہے۔ انھوں نے پوچھا، "کیا تعمیری کام؟"
میں نے ۱۹۵۴ء کی دستاویز پیش کر دی۔ میں نے کہا، "یہ ہے میرا پروگرام۔ ہمیں
اسی پر عمل کرنا ہے۔ ہمارا پہلا کام یہ ہے کہ مغربی پاکستان کو متحد کیا جائے۔"

میں یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ "ون یونٹ" کا خیال میرے ہی فکر کا نتیجہ تھا۔ بے شک
دوسرے لوگ بھی اس کا چرچا کرتے رہے تھے۔ البتہ اس کو بروئے کار لانے میں
میری کوششوں کو بھی دخل تھا۔ جب میں کابینہ میں شامل ہوا تو میرے سامنے دو
واضح مقصد تھے اول یہ کہ مسلح افواج کو سیاست دانوں کی دخل اندازی سے محفوظ

رکھا جائے اور دوسرا یہ کہ مغربی پاکستان کے صوبوں کو ملا کر ایک یونٹ بنا دیا جائے۔ میں نے اس مقصد کے لیے بڑی جدوجہد کی اور صوبوں کو ایک وحدت میں مدغم کرنے کی ابتدا کرا دی۔

مجھے اپنا ذاتی تجربہ بخوبی یاد ہے جس سے مغربی پاکستان کو ایک صوبے میں سمو دینے کی ضرورت کا مجھے شدت سے احساس ہوا تھا۔ ہم واہ آرڈیننس فیکٹری میں کچھ مصنوعات کی مشینیں لگانا چاہتے تھے۔ جب میں معائنے کے لیے وہاں پہنچا تو دیکھتا کیا ہوں کہ مشینیں تو سب لگ چکی ہیں مگر کام بند پڑا ہے۔ وجہ یہ تھی کہ مالاکنڈ سے چن بھی بھر کی بجلی دریائے سندھ کے اس پار نہیں آ سکتی تھی۔ یہ بڑی عجیب سی بات تھی۔ معلوم ہوا بجلی اس وجہ سے نہ آ سکتی تھی کہ شمال مغربی صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ خان عبدالقیوم خان اور پنجاب کے وزیر اعلیٰ میاں ممتاز دولتانہ کے تعلقات ایک دوسرے کے ساتھ اچھے نہ تھے۔ یہ صورت حال بڑی مضحکہ خیز تھی اور حد درجہ پریشان کن بھی۔ سارے ملک میں کسی شخص کے پاس یہ اختیار نظر نہ آتا تھا کہ وہ سب صوبوں پر قابو رکھ سکے یا ان کے کام میں تال میل پیدا کر سکے۔

ہمارے سیاسی نظام میں بنیادی کمزوری یہ تھی کہ اختیار کا مرکز کہیں تھا ہی نہیں۔ ہم نے غیر ملکی پارلیمانی نظام حکومت کو اپنا تو لیا تھا مگر نہ تو اس کے نقصوں کو سمجھ سکے تھے اور نہ ہمارے ہاں ایسے حالات تھے کہ ان میں یہ نظام پنپ سکتا۔ پاکستان کے حالات پر نظر رکھتے ہوئے پارلیمانی نظام کی کوتاہیاں صرف مجھی کو دکھائی نہ دی تھیں بلکہ اوروں نے بھی انھیں محسوس کیا تھا جن میں پروفیسر رشبروک ولیمز بھی شامل ہیں۔ جس زمانے میں قائداعظم دہلی میں ہندوستانی مجلس قانون ساز کے ممبر تھے تو ان میں اور پروفیسر رشبروک ولیمز میں بڑا ربط تھا۔ پروفیسر صاحب کا بیان ہے کہ قائداعظم اکثر ان سے کہا کرتے تھے۔

"یہ پارلیمانی نظام ہمارے لیے ٹھیک نہیں، لیکن ہمیں اس کی پیروی کرنی ہو گی تاکہ برطانیہ کو شکست دی جا سکے اور تم لوگوں کو اس ملک سے نکالا جا سکے۔ یہی دلیل ہے جو تمھاری سمجھ میں آ سکتی ہے۔ لیکن مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ نظام ہمارے ہاں ہمیشہ کام نہ دے سکے گا۔"

اس مختصر سے زمانے میں جب قائداعظم پاکستان کے گورنر جنرل تھے ہمارے

ہاں فی الحقیقت ایک طرح کی صدارتی حکومت قائم تھی۔ قائداعظم گورنر جنرل تھے اور ساتھ ہی مجلس آئین ساز کے صدر بھی۔ اس زمانے میں کابینہ کے اجلاسوں کی صدارت وزیر اعظم نہیں بلکہ گورنر جنرل کیا کرتے تھے۔ یہ تجویز خود کابینہ ہی نے پیش کی تھی۔ شروع شروع میں قائداعظم کو کچھ تامل ہوا تھا کیونکہ یہ بڑی غیر معمولی بات تھی۔ مگر پھر انھوں نے غور کرکے کہا کہ میں ان اجلاسوں میں شرکت کیا کروں گا اور کابینہ سے مشورہ بھی کروں گا۔ مگر اس کو ماننے یا نہ ماننے کا مجھے اختیار ہوگا۔

مجھے آغا خان مرحوم سے اپنی ایک دلچسپ ملاقات اب تک یاد ہے۔ جو لیاقت علی خان کے قتل کے کچھ ہی دن بعد ہوئی تھی۔ میں جب کبھی کسی کانفرنس کے سلسلے میں انگلستان جاتا تھا تو آغا خان مجھے خط لکھا کرتے تھے۔ اس موقع پر میں نیس گیا اور یاکی مور میں جو سمندر کے کنارے ایک پر فضا مقام ہے ان کے ہاں مہمان ٹھہرا۔ آغا خان کو ان دنوں دل کا مرض تھا۔ وہ ایک زبردست شخصیت کے مالک تھے۔ انھیں واقعات عالم پر بڑا عبور حاصل تھا۔ میں ان کی معلومات اور دور اندیشی سے بڑا متاثر تھا۔ مجھے ان سے بارہا گفتگو کرنے کا موقع ملا۔ میں یہاں کچھ باتیں یاد کرکے لکھتا ہوں۔

میں نے ان سے کہا: "جناب والا! اگر آپ کی عمر ذرا کم ہوتی تو آپ ہمارے لیے بڑے مفید ثابت ہوتے۔"

انھوں نے جواب دیا: "کاش ایسا ہی ہوتا۔ پاکستان میرا ایک خواب تھا اور اب جبکہ یہ خواب حقیقت بن گیا ہے تو مجھے حسرت آتی ہے کہ اس کی کچھ خدمت کرتا۔" آگے چل کر انھوں نے کہا۔

"آپ لوگوں نے بڑی قربانیوں کے بعد پاکستان حاصل کیا ہے۔ آپ ہرگز اسے گنوانا نہ چاہیں گے۔ لیکن میں کہے دیتا ہوں کہ اگر آپ نے پارلیمانی نظام اختیار کیا تو اس سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔ دراصل میں نے یہی بتانے کے لیے تمہیں یہاں بلوایا ہے اور تنہا تم ہی وہ شخص ہو جو پاکستان کو بچا سکتے ہو۔"

میں نے پوچھا: "آپ کے خیال میں میں کس طرح بچا سکتا ہوں؟"

وہ بولے: "اس نظام کو بدل دو۔ کوئی ایسا نظام سوچو جو تمہاری تاریخ تمہاری روایات اور تمہارے نظریۂ حیات سے ہم آہنگ ہو۔ اور یہ کام حقیقت میں تم

ہی کر سکتے ہو۔"

میں نے کہا: "دیکھئے آغا" ۔ میں ایک عرصے کی ملاقات کے بعد میں انھیں "آغا" کہنے لگا تھا۔ "میں جانتا ہوں کہ آپ کے دل میں پاکستان کو پھلتا پھولتا ہوا دیکھنے کی آرزو تڑپ رہی ہے، لیکن ذرا صبر کیجیئے حالات مزید سدھر جائینگے۔"

انھوں نے جواب دیا: "نہیں تم ابھی نادان ہو۔ تم ان باتوں کو نہیں سمجھتے۔ حالات یوں نہیں سدھرا کرتے۔"

اس کے بعد ایک دن آغا خاں نے قائداعظم سے اپنے مراسم کا ذکر شروع کیا۔ انھوں نے کہا: "ان میں اور مجھ میں ہمیشہ اختلاف رائے رہتا تھا، لیکن میں فی الحقیقت انھیں ایک عظیم انسان سمجھتا تھا۔ میں یہ اس لیے کہتا ہوں کہ انسان کو زندگی میں دو ایک ہی بار ایسے موقعے ملتے ہیں جب اسے کوئی بڑا فیصلہ کرنا پڑتا ہے۔ قائداعظم کو یہ فیصلہ کرنا تھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو پاکستان حاصل کرنا چاہیئے یا نہیں اور قائداعظم نے کہا: "انھیں پاکستان کے سوا اور کچھ نہیں چاہیئے۔" انھوں نے ٹھیک وقت پر ٹھیک فیصلہ کیا۔ تم قائداعظم کی وسعت نظر دیکھ سکتے ہو۔ وہ سچ مچ ایک عظیم انسان تھے۔ زبردست عزم اور ارادے کے انسان! وہ جب کبھی کوئی بات دل میں ٹھان لیتے تو دنیا اِدھر کی اُدھر ہو جائے وہ اسے کر گزرتے۔ کاش وہ زندہ رہتے!"

میری دلی تمنا بھی یہی تھی۔ اگر قدرت قائداعظم کو زندہ رکھتی تو وہ اپنی شخصیت اور اپنے اقتدار کی بدولت کوئی قابل عمل آئین بنا لیتے۔ عوام ان کی ہر بات کو بسر و چشم قبول کر لیتے۔ وہ ان کے مانے ہوئے رہنما تھے، اور عوام اب بھی ان کے پرستار ہیں۔ اگر وہ ملک کے لیے کوئی آئین بنا جاتے تو معاملات شاید مناسب موقع پر سلجھ جاتے اور ملک میں وہ تفرقے جو بعد میں بڑے شاید قوم ان سے محفوظ رہتی۔

(۳)

۱۹۵۸ء میں جب میں نے ملک کا انتظام اپنے ہاتھ میں لیا تو لوگوں کی کیفیت مزاج بدل چکی تھی۔ شروع شروع میں ان کے دل میں جو ولولہ اور جوش تھا، اس کی جگہ کاہلی اور بے ہمتی نے لے لی تھی۔ ابتدائی دنوں کی تنومند آرزوئیں خواب و خیال معلوم ہونے لگی تھیں۔ بہت سے چھپے ہوئے تنازعات اور اختلافات

ابھر آئے تھے۔ ذہنی یکانگت کے شجر کو صوبائی عصبیت اور تنگ نظری کا گھن لگ چکا تھا علاقائی تعصب اور تفرقے زوروں پر تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ساری قوم اپنے آپ سے برسرِ پیکار ہو۔

ہم پاکستانی نسل اور ذہن کے اعتبار سے ایک مخلوط قوم ہیں۔ شہری زندگی میں ہم الگ الگ نقطۂ نگاہ رکھتے ہیں۔ اس لیے ہم میں آسانی سے یک جہتی پیدا نہیں ہوتی۔ لیکن جب فوجی ضبط و نظم کے تحت ہماری تربیت ہوتی ہے تو ہم اعلیٰ درجے کے سپاہی بن جاتے ہیں۔ اس صورت حال سے فائدہ اٹھا کر ہر نوخیز لیڈر کو اپنی الگ تھلگ جماعت بنانے کی سوجھتی ہے۔ ہم آسانی سے جذباتی بن جاتے ہیں اور حالات کو ہمیشہ حقیقت پسندانہ نظر سے نہیں دیکھتے چنانچہ کوئی بھی لیڈر جو مچھے دار تقریر کر سکتا ہے۔ ہمارے جذبات سے کھیلنے اور ہمیں گمراہ کرنے کی ترغیب سے خود کو بچا نہیں سکتا۔ ہم اپنے سوا ہر ایک پر نکتہ چینی کرتے ہیں اور چونکہ قابل اور تجربہ کار لوگوں کی سخت کمی ہے اس لیے عہدوں کے لیے آپا دھاپی مچی رہتی ہے۔ یہ انہی حالات کا نتیجہ تھا کہ آزادی کے ابتدائی چند ہی برس کے بعد ملک نے خود کو خیبتوں اور پریشانیوں میں گھرا ہوا پایا۔ تاہم مجھے یقین تھا کہ ہمارے عوام دل و جان سے ملک کی ترقی کے خواہاں ہیں۔ وہ محنتی اور جفاکش ہیں اور ہنسی خوشی مصیبتوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ وہ ضرورت پڑنے پر بڑی سے بڑی قربانی سے دریغ نہیں کرتے مصیبت کے وقت ہمت نہیں ہارتے۔ انہیں ایک ایسا دین عطا ہوا ہے جو اتحاد اور اخوت کا سبق پڑھاتا ہے اور ان کے دلوں میں انصاف اور نوعِ بشری کی بھلائی کے جذبے کو ابھارتا رہتا ہے۔

میں نے ضرورت محسوس کی کہ ایسی راہیں پیدا کی جائیں جو پاکستان کے عوام کو اپنے مادی، اخلاقی و ذہنی وسائل اور صلاحیتوں کو زیادہ سے زیادہ ترقی دینے کے قابل بنا سکیں۔ اس مقصد کے حصول کے لیے پہلی ضروری بات یہ تھی کہ قومی مسائل کی جانچ پڑتال حقیقت پسندانہ انداز سے کی جائے۔ مجھے اطمینان نہیں تھا کہ ہم حقیقی معنوں میں ایک قوم بن گئے ہیں کیونکہ جدھر دیکھو تنافر و انتشار ہی نظر آتا۔ ہم دو نصف نصف حصوں میں بٹے ہوئے تھے۔ ہر نصف حصے کا لسانی اور تہذیبی خاکہ جداگانہ تھا۔ ان دونوں کے درمیان جغرافیائی فاصلہ بجائے خود

تفریق کا باعث بنا ہوا تھا جس سے فائدہ اٹھا کر لوگوں کے دلوں میں طرح طرح کے شکوک و شبہات پیدا کیے جا سکتے تھے۔ ہمیں ایک گہرا افتراق اور بھی ورثے میں ملا تھا جو دیہاتی اور شہری طبقوں کے درمیان پایا جاتا تھا۔ ہر چند ملک کی کل آبادی میں شہر کے بسنے والوں کی تعداد بڑی تھوڑی تھی۔ مگر یہ اقلیت بڑی مؤثر آواز رکھتی تھی اور دیہات کے لوگوں میں یہ احساس پایا جاتا کہ مہذب شہری لوگ ان پر چھائے ہوئے ہیں اور ان سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔

علاوہ ازیں علاقائی امتیازات تھے جو اکثر قومیت کے جذبے پر غالب رہتے تھے۔ مختلف علاقے قومی وسائل پر نت نئے حق جتاتے اور چونکہ ملک میں سرمائے کی کمی تھی اس لیے کوئی علاقہ بھی منہ مانگی مراد نہ پا سکتا تھا۔

مگر جس چیز نے سب سے زیادہ لوگوں میں تفرقہ پیدا کر رکھا تھا وہ ایک طرف سائنس اور استدلال اور دوسری طرف کٹر عقائد پرستی اور رجعت پسندی کی قوتوں کی باہمی آویزش تھی۔ حکومت اور مذہب کے درمیان ایک گہری خلیج حائل کر دی گئی اور تمام پرانے تنازعات یعنی دینی بمقابلہ دنیا اور مذہب بمقابل لادینی از سرِ نو اٹھ کھڑے ہوئے۔ صحیح معنوں میں کشمکش علما اور تعلیم یافتہ طبقے کے درمیان تھی۔ ہر مادی، دنیاوی اور غیر مذہبی چیز کا ناتا تعلیم یافتہ طبقے سے جوڑا جاتا تھا اور ہر وہ چیز جو دینی اور روحانی تھی علما کی میراث بن گئی تھی۔ تعلیم یافتہ طبقوں کے بارے میں سمجھا جاتا تھا کہ انھیں مغربی خیالات اور مغربی اثرات نے گمراہ کر دیا ہے۔ علما جن میں سے بعض عربی سے بہرہ مند ہوتے تھے اور جنہوں نے مذہبی مسائل کا مطالعہ بطور خاص کیا تھا، اسلام کے محافظ سمجھے جاتے تھے۔ ان علما میں بہت سے ایسے بھی تھے جو اپنے اس اثر کو جو وہ عوام کے دلوں پر رکھتے تھے، سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کرنے سے نہ چوکتے تھے۔ انہوں نے رفتہ رفتہ معاشرے کے مغربی تعلیم یافتہ گروہوں کے خلاف ایک زبردست سیاسی محاذ قائم کر لیا تھا۔ ان دونوں طبقوں کی یہ کشمکش بہت پرانی ہے جس کا مختصر طور پر ذکر میں آگے چل کر کروں گا۔ مجھے جس بات سے تعجب ہوا وہ یہ تھی کہ جب ان دونوں طبقوں میں اصولی طور پر پورا پورا اتفاق پایا جاتا ہے تو پھر اس شدید اختلاف کی کیا وجہ ہے۔ دونوں گروہ اسلام کے دلدادہ ہیں اور دونوں پاکستان کو ایک مضبوط اور

پُر شکوہ قوم بنانے کے آرزو مند ہیں' اس کے باوجود وہ مثبت اور متفقہ انداز میں قومی مسائل کا حل نہ ڈھونڈ سکے۔ اس کے برخلاف تعلیم یافتہ طبقہ علما کو آثارِ قدیمہ تصور کرتا رہا' اور علما تعلیم یافتہ طبقے کو بے دین اور حقیر گردانتے رہے۔

مسئلہ یہ تھا کہ یہ اختلافات کیونکر مٹائے جا سکتے ہیں۔ اسلام زندگی کو ایک وحدت تصور کرتا ہے اور اسلامی ضابطہ ایک مکمل تہذیبی نظام ہے۔ زندگی مذہب اور مادیت کے جدا جدا خانوں میں کیونکر تقسیم کی جا سکتی ہے' جن میں سے ہر خانہ ایک جداگانہ قانون کا تابع ہو؟ اسلام میں تمام انسانی اعمال ایک ہی اصول کے تابع ہیں۔ زندگی ایک ہے اور وہ قوانین بھی ایک ہی ہیں جن کی زندگی پر عملداری ہے۔ انسان گھر پر ہو یا باہر کام دھندے میں مصروف ہو یا عبادت میں مشغول' اس کا رہبر ایک ہی ضابطۂ اخلاق ہے۔ جو اصول ہم اپنے خاندانی معاملات میں برتتے ہیں' انہی پر ہم دوسروں کے ساتھ اپنے معاملات میں کاربند ہوتے ہیں۔ روحانی ضوابط روزمرہ زندگی کے ضوابط سے مختلف نہیں۔ انسان کی حیثیت سے جانچا جاتا ہے اور اس کے اعمال کا محاسبہ اخلاقی نقطۂ نگاہ سے کیا جاتا ہے۔

یہ سب سچ تھا مگر مجھے اپنے معاشرے کی جو تصویر نظر آئی وہ اس سے کہیں مختلف تھی۔ عملی طور پر ہماری زندگی دو مخصوص دائروں میں بٹی ہوئی تھی' اور ہر ایک دائرے میں ہم مختلف اصول و قواعد کی پابندی کر رہے تھے۔ ہم اس دلدل سے کیونکر نکلیں اور زندگی کی بابت ایک جامع نظریہ کو کیونکر اپنائیں' یہی ہمارا مسئلہ تھا۔ اگر ہم اس کوشش میں ناکام رہتے تو ہماری ترقی رک جاتی' ہم پس ماندہ رہ جاتے' اور پس ماندگی کا مطلب تھا غلامی۔ یہ ہماری آزمائی ہوئی بات تھی۔ دوسروں نے ترقی کی جستجو میں مذہب کو خیرباد کہہ دیا تھا۔ ہم خوش قسمت ہیں کہ ہم نے ایک ایسے دین کا دامن تھام رکھا تھا جو ہماری ترقی کا وسیلہ بن سکتا تھا۔ لیکن توہم اور کورانہ رسم پرستی نے ہمیں تقدیر پرست بنا دیا تھا۔ یہ بات اسلامی تعلیمات کے سراسر منافی تھی۔ مسلم معاشرہ اس وقت تک قدم آگے نہیں بڑھا سکتا تھا جب تک کہ اسلام کو ان تمام مانعِ ترقی اور بیگانہ اثرات سے پاک نہ کر دیا جائے جنہوں نے اس کی اصل صورت کو مسخ کر رکھا تھا۔

مجھے اس امر کی بڑی تشویش تھی اور مندرجہ ذیل نوٹ میں نے اسی کے بارے

میں ۱۲ اپریل ۱۹۵۹ء کو کہا تھا:۔

جب سے میں نے ملک کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لی ہے مجھے سب سے زیادہ فکر اس بات کی ہے کہ لوگوں کو کس طرح متحد کیا جائے اور ملک کے اندرونی و بیرونی مسائل کیونکر حل کیے جائیں۔ آج ہم جن مسائل سے دوچار ہیں وہ بڑے زبردست ہیں۔ لیکن خدا کے فضل و کرم سے ہم انھیں اگر کلی طور پر نہیں تو جزوی طور پر حل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ البتہ لوگوں کو متحد کرنے کا مسئلہ ایمانی و روحانی دائرے سے تعلق رکھتا ہے جس کا میں ابھی تک کوئی حل تلاش نہیں کر سکا۔ لیکن اس کا جلد سے جلد کوئی حل تلاش کرنا از حد ضروری ہے۔ ورنہ اندیشہ ہے کہ کہیں دوسری طاقتیں ہم پر غلبہ نہ پالیں اور ایک آزاد قوم کی حیثیت سے ہمارا وجود باقی نہ رہے۔ بلکہ اس امر کا بھی امکان ہے کہ ہم پاکستان ہی کو گنوا بیٹھیں گے۔ یہ صورت کسی حالت میں بھی پیدا نہ ہونے دینی چاہیئے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں ایک جامع اور واضح حل تلاش کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ ایک ایسا حل جو قابل فہم، مخصوص اور واضح ہو۔ جو لوگوں کے دلوں میں خودبخود ایک پائیدار ولولہ پیدا کر دے، اور جو نئی زندگی کے تقاضوں کو بھی پورا کر سکے۔ میرے احساسات یہ ہیں۔

انسان بہ حیثیت حیوان بقائے حیات اور افزائش نسل کی بنیادی جبلتوں کے تابع ہے۔ لیکن چونکہ اسے سوچنے اور سمجھنے کی قوت عطا ہوئی ہے اس لیے اس کو اپنی جبلتوں پر قابو بھی حاصل ہے۔ اس کی بڑی سے بڑی خواہش یہ ہے کہ اس کا کوئی نظریۂ حیات ہو، جس کے لیے وہ اپنی جان قربان کر ڈالے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس قدر ارفع و اعلیٰ نظریۂ حیات ہو گا، افراد اور معاشرے کا کردار بھی اتنا ہی بلند ہو گا۔ لوگوں کی زندگی زیادہ بھرپور اور زیادہ تخلیقی ہو گی اور ان میں یکجہتی اور مدافعت کی زبردست قوت ہو گی۔ ایسا معاشرہ مڑ تو سکتا ہے مگر ٹوٹ نہیں سکتا۔

ہمیں ایک ایسا ہی نظریۂ حیات حاصل ہے اور وہ اسلام ہے۔ اسی بنیاد پر ہم نے پاکستان کے لیے جدوجہد کی، اور اسے حاصل کیا۔ لیکن پاکستان کے حصول کے بعد ہم اپنی زندگیوں کو اس کے مطابق ڈھال نہیں سکے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ہم اپنے اس نظریۂ حیات کو سادہ اور قابل فہم شکل میں پیش نہ کر سکے۔ اس

کے ساتھ ہی ہم اپنی لاعلمی کے باعث اسلامی نظریۂ حیات کو تعصب اور لا نیت کے ہم معنی تصور کرنے لگے اور ہمیں در پردہ اس سے حجاب آنے لگا۔ لیکن اب وقت آگیا ہے کہ اس کیفیت سے نجات حاصل کریں جرات اور صفائی کے ساتھ مسئلے سے دوچار ہوا جائے۔ سادہ اور زمانۂ حال کے لیے قابل فہم اصطلاحات میں اس نظریۂ حیات کی صراحت کی جائے اور اسے لوگوں کے سامنے پیش کیا جائے تاکہ وہ اس سے ایک ضابطۂ حیات کے طور پر ہدایت حاصل کر سکیں۔

اسلام کے نظریۂ حیات کی وضاحت کے لیے نیز زمانۂ حال کے کوائف بالخصوص پاکستان کے کوائف پر اس کا اطلاق کرنے کے لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ذیل کے مختصر نکات کو وضاحت کے ساتھ پیش کیا جائے۔

(الف) توحید الہٰی: انسان میں فکر و عمل کے ذریعے خدائی محبت کے اظہار کا جذبہ۔

(ب) سب انسان خدا کی نظر میں برابر ہیں، لہذا انسان کی اس بنیادی مساوات کو بلا امتیاز رنگ و نسل و ملک تسلیم کرنا ضروری ہے۔

(ج) یہ صحیح ہے کہ ایسے معاشرے میں علاقائی وطنیت کی کوئی جگہ نہیں، ہم ایک خاص علاقے کے رہنے والے اس کی حفاظت، سلامتی اور ترقی کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ چنانچہ جس ملک میں ہم رہتے ہیں اور جہاں سے ہم روزی حاصل کرتے ہیں اس سے وابستگی لازمی ہے۔

(د) اگر مذہب کے لازمی اجزا یہی ہیں تو مذہب کو دنیوی اور دینی دونوں معاملوں میں دخل ہوگا۔ تشریح کی جائے کہ کس طرح۔

(ھ) یہ دنیا اس لیے بنائی گئی ہے کہ ہم اس میں تعمیری طور پر اور سود مندی کے ساتھ زندگی گزاریں، اس لیے نہیں کہ اس سے حذر کیا جائے۔ لہذا اپنی تخلیقی قوتوں کی نشو و نما کے لیے علوم جدیدہ کی تعلیم ہماری لازمی ضرورت ہے۔

(و) ریاست اور فرد کے فرائض کی وضاحت کی جائے۔ مومن کی تعریف بیان کی جائے۔

(ز) فرد کے بنیادی حقوق بیان کیے جائیں، جو فرد اور ریاست دونوں کے

لیے فائدہ مند ہیں ۔

(ح) موجودہ اور آئندہ نسلوں کو اس فلسفے سے روشناس کرانے کے لیے کیا طریقہ اختیار کرنا چاہیے ؟

(ط) اس امر کے پیش نظر کہ پاکستان کے لوگ بہت سی نسلوں کا مجموعہ ہیں، جن کا پس منظر ایک دوسرے سے مختلف ہے انھیں ایک وحدت میں کس طرح سمویا جائے کہ یہ ایک جی ہو جائیں اور ان کا علاقائی انفرادیت، ان کی تہذیب اور ان کی روایات برقرار رہیں ؟

ضرورت اس بات کی ہے کہ مندرجہ بالا امور کی تشریح ایسی زبان میں کی جائے جسے زیادہ سے زیادہ لوگ سمجھ سکیں اور ان پر عمل کر سکیں ۔

اس کام کا ذمہ کون لیتا ؟ مجھے تو اس کی ہمت نہ پڑ سکتی تھی، کیونکہ مجھے اپنی کوتاہیوں کا احساس تھا۔ میں تو صرف معاشرے میں یک جہتی اور توازن کی ضرورت ہی پر زور دے سکتا تھا۔ ہمارے لیے لازمی تھا کہ تقاضائے ایمان اور تقاضائے وقت کے درمیان ہم آہنگی پیدا کریں۔ کوئی قوم محض اپنی عظمت رفتہ کے سہارے زندہ نہ رہ سکتی ۔

ہر شخص متفق تھا کہ ملک کا آئین جمہوری ہونا چاہیئے ۔ ایک ایسا آئین جس کی مدد سے قوم اسلام کے لازمی اصول و ضوابط کے مطابق اپنی تنظیم کر سکے اور وقت کے ساتھ ساتھ نشوونما پا سکے۔ سوال یہ تھا کہ آئین کے جمہوری لوازم کا فیصلہ اور اسلام کے ضروری اصول و ضوابط کی تشریح کس کو کرنی چاہیئے۔ اس کے دو طریقے ہو سکتے تھے۔ ایک تو یہ کہ ہم علما کی مدد سے یا اس کے بغیر ہی ان اصول و ضوابط کا تعین کر دیتے اور پھر اسے حکماً نافذ کر دیتے۔ دوسرا یہ کہ قوم کو مخصوص اداروں کی مدد سے جو مشاورتی حیثیت رکھتے ہوں ان اصول و ضوابط کا فیصلہ خود کرنے دیا جائے۔

میں نے دوسرا طریقہ پسند کیا۔ بعد ازاں آئینی کمیشن نے سفارش کی کہ ہمیں ایک بین الاقوامی اسلامی کمیشن مقرر کرنا چاہیئے، جو مشورہ دے کہ ہمارے قوانین کو کس طرح کتاب و سنت کے احکام کے مطابق بنایا جا سکتا ہے۔ مجھے اس قسم کے کمیشن کی افادیت کے بارے میں کچھ شبہ تھا۔ میں نے اس زمانے میں

بعض اسلامی ملکوں کے سربراہوں سے اس کا ذکر کیا، مگر انھوں نے کسی گرم جوشی کا اظہار نہ کیا۔ ظاہر تھا کہ ہمیں اپنے معاملات سے خود ہی نبٹنا اور اپنے مسائل کو خود ہی حل کرنا ہوگا۔ غور و فکر کی ذمہ داری خود قوم پر ہونی ضروری تھی۔

ملک کے آئین کو اسلامی حیثیت دینے کے بارے میں میں نے جو لازمی فیصلہ کیا وہ یہ تھا کہ ان اصول و ضوابط کے تعین کی ذمہ داری، جن کے تحت قومی معاملات کو منظم کرنا اور سرانجام دینا ہوگا، قوم ہی کو سونپ دینی چاہیئے۔ آئین ایک ایسا ڈھانچہ مہیا کرے، جس کی بنیاد اسلامی تاریخ اور تجربے پر ہو اور جو قوم کے خیالات، مزاج اور روایات سے مطابقت رکھتا ہو۔ لیکن اس ڈھانچے کی حدود میں رہ کر قوم کو پوری آزادی ہو کہ وہ اپنے لیے کتاب و سنت سے اصول اور ضابطے اخذ کر سکے، اور موجودہ حالات میں ان اصول و ضوابط کو برتنے کے طریقے خود سوچے۔ اصول جمہوریت اور اصول اسلام میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی یہی ایک صورت تھی۔

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوا کہ قوم اسلام کے اصول و ضوابط کی تفہیم و تشریح کیونکر کرے۔ اس کا کوئی گھڑا گھڑایا جواب موجود نہ تھا۔ اسلامی آئین کی کوئی نظیر موجود نہ تھی۔ قرآن حکیم میں رشد و ہدایت کے احکامات تو ہیں مگر کوئی مفصل آئین نہیں، جس کے مطابق ملک کا انتظام چلایا جا سکے۔ آنحضرت صلعم کے اسلامی ریاست بنانے کی مثال البتہ موجود ہے۔ آنحضرت صلعم کے بعد خلفائے راشدین نے اپنے اپنے خیال کے مطابق اسلامی اصول و ضوابط کو کام میں لا کر حکومت کا کاروبار چلایا۔ ان میں سے ہر ایک خلیفہ نے اپنے اپنے حالات اور وقت کے مطابق اسلام کے اصول اور آنحضرت صلعم کی تعلیمات کا اطلاق کیا لیکن حکومت کا کوئی خاص سانچا یہاں تک کہ حکومت کے سربراہ کے انتخاب تک کا کوئی قاعدہ مقرر نہ ہو سکا۔ اس سے لازمی طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اسلام نے انتظام حکومت کا کوئی معین خاکہ وضع نہیں کیا، بلکہ یہ کام ملت پر چھوڑ دیا کہ وہ اپنے حالات کے مطابق خود حکومت کا خاکہ بنائے بشرطیکہ کتاب و سنت کے اصول و ضوابط پیش نظر رکھے جائیں۔

زمانۂ حال میں متعدد اسلامی ملکوں نے اپنی اپنی ضرورت کے مطابق آئین

وضع کئے۔ لیکن یہ دعویٰ نہیں کیا کہ یہ آئین اسلامی ہیں جنہیں تمام اسلامی ملک اپنا سکتے ہیں۔ مجھ پر یہ بات واضح تھی کہ پاکستان کو اسلام کے اصول و ضوابط کا اپنے حالات کے مطابق کرنا ہی ہوگا۔ نیز یہ بات بھی کہ یہ کام مسلمہ جمہوری اصول کی حدود میں ہونا چاہئے، جن میں سے ایک نہایت اہم اصول ملکی معاملات میں عوام کی شرکت ہے۔ ملک کے کاروبار کے چلانے میں مجموعی حیثیت سے عوام کے حق کو نہ تو نظرانداز کیا جا سکتا ہے اور نہ اس میں تخفیف ہو سکتی ہے۔ کسی شخص یا گروہ کو خواہ وہ کتنا ہی عالم فاضل کیوں نہ ہو، یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ پوری قوم کی مرضی کے خلاف کوئی فتویٰ دے جس کا اظہار قوم نے اپنے منتخب نمائندوں کے ذریعے کیا ہو۔ اس سے مقننہ کی برتری مسلم ہو جاتی ہے جو قوم کی جانب سے اور قوم کے لیے عمل پیرا ہو۔ اور یہ امر بھی مسلم ہو جاتا ہے کہ قوم کو اپنی مرضی کے مطابق اپنے نمائندوں اور ارکان حکومت کو چننے کی آزادی ہونی چاہیے۔ اس بات کے اطمینان کے لیے کہ عاملہ اور منتظمہ اپنے اپنے فرائض آئین کے اصول کے مطابق انجام دے رہی ہیں، ایک آزاد عدلیہ کا وجود لازم آتا ہے۔ ظاہر ہے کہ انتظامات کے اس تمام منصوبے میں علمائے دین کی کسی جماعت اعلیٰ کے لیے کوئی گنجائش نہ تھی جو مقننہ اور عدلیہ پر ویٹو کی طاقت استعمال کرے۔

ان امور میں میں نے "اجماع" کے مسئلے سے استفادہ کیا ہے جو اسلام کا خاص اصول ہے۔ ایک مدرسۂ فکر کے قول کے مطابق اجماع کا مطلب "ایسے معاملوں میں جن میں رائے زنی یا فیصلے کی ضرورت ہو، مجتہدین کا اتفاق رائے ہے۔ مجتہدین وہ اشخاص ہیں جنہیں اپنے اسلامی علم کے باعث صاحب الرائے ہونے کا حق پہنچتا ہے۔ دوسرا مدرسۂ فکر اجماع سے تمام مسلمانوں کی کثرت رائے مراد لیتا ہے۔ ایک اور نظریہ یہ ہے کہ زمانۂ جدید میں اجماع کا مطلب مقننہ کی رائے سے ہے کیونکہ اس جماعت میں قوم کے انتخاب کردہ نمائندے شامل ہوتے ہیں۔ نیز یہ کہ ایسے معاملات میں جو قوم کی زندگی پر اثرانداز ہوں آزاد فیصلے کا حق مقننہ کو پہنچتا ہے۔ عالموں کی کسی جماعت کو نہیں۔ میں اس مسئلے پر قبل از وقت کوئی حکم لگانا نہیں چاہتا تھا، چنانچہ میں نے جو آئینی انتظامات کئے ان میں یہ بات قوم کے نمائندوں ہی پر چھوڑ دی گئی کہ وہ کتاب و سنت سے تعلق رکھنے والے معاملات میں اپنی رائے کس طرح قائم کریں گے۔ میں نے ضروری سمجھا کہ مقننہ کے مشورے

کے لیے ایک اسلامی مشاورتی کونسل بنائی جائے جس کی پشت پر تحقیقات اسلامی کا ادارہ ہو' جو مقننہ کو اسلامی نظریوں کی بنیاد پر قوانین وضع کرنے میں مدد دے سکے۔ اس کونسل میں صرف عالمان دین ہی کو شامل نہیں کیا گیا' بلکہ ایسے اشخاص کو بھی جو ملک کے اقتصادی' سیاسی' قانونی اور انتظامی مسائل کی سوجھ بوجھ رکھتے ہوں' تاکہ اسلام کے مطالبوں اور وقت اور حالات کے تقاضوں میں مطابقت پیدا کی جا سکے۔

میں جانتا تھا کہ علما اس انتظام سے مطمئن نہ ہوں گے' وہ اسلامی امور کی تشریح کرنے اور فیصلے دینے کا حق بلا شرکت غیرے خود رکھنا چاہتے تھے۔ وہ اس حق کے دعویدار تو تھے لیکن وہ کوئی تفصیلی آئینی دستاویز مرتب کرنے سے گریز کرتے تھے' کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اگر اس قسم کی کوئی کوشش کی گئی تو ان کے اندرونی اختلافات منظر عام پر آجائیں گے۔ ان کا مطالبہ یہ تھا کہ حکومت کو بس اسلامی آئین اختیار کرنے پر رضامند ہو جانا چاہیئے کہ کوئی قاعدہ قانون اسلامی سے کوئی نہیں۔ میں یہاں مختصر طور پر یہ بیان کر دینا چاہتا ہوں کہ پاکستان کی سیاسی زندگی میں علما کا کردار کیا رہا ہے۔

برصغیر ہند و پاکستان میں علما کا ماجرا یہ رہا ہے کہ وہ تعلیم یافتہ طبقوں سے برابر الجھتے رہے ہیں۔ یہ تنازعہ حصول پاکستان کی جدوجہد کے زمانے میں فیصلہ کن مرحلے پر پہنچ گیا۔ یہ بات کسی سے چھپی ہوئی نہیں ہے کہ متعدد علما کھلے بندوں قائداعظم کی مخالفت اور نظریۂ پاکستان کی تحقیر کرتے تھے۔ میرا مطلب یہ نہیں کہ جو علما قیام پاکستان کے مخالف تھے وہ سب کے سب ضمیر فروش تھے۔ ان میں جو ہر قابل بھی تھے اور صاحب یقین بھی۔ مگر ان میں ایسے لوگ بھی شامل ہیں جو سمجھتے تھے کہ اگر پاکستان وجود میں آگیا تو انھیں اقتدار سے ہاتھ دھونے پڑیں گے۔ ان میں جو بہترین لوگ تھے وہ یہ دلیل پیش کرتے تھے کہ اگر ہندوؤں اور مسلمانوں میں اتحاد عمل پیدا نہ ہوا تو آزادی ہند کی تحریک کمزور پڑ جائے گی۔ ان میں سے کچھ کا یہ خیال تھا کہ پاکستان محض ایک علاقائی تصور ہے اور عالمی اخوت اسلامی کے فلسفے کے خلاف ہے۔ یہ دونوں دلیلیں الجھی ہوئی فکر کا نتیجہ تھیں اور اس افسوس ناک حقیقت کو ظاہر کرتی تھیں کہ برصغیر کے مسلمانوں کو جن حقیقی مسائل کا سامنا ہے' علما ان سے کس قدر بے خبر ہیں۔ آزادی ملنے ہی والی تھی' یہ رک نہیں سکتی تھی۔ مسلمانوں کو

اس بات کی تشویش نہ تھی کہ آزادی کتنی جلد ملے گی۔ انھیں فکر تھی یہ کہ جب انھیں آزادی ملے گی تو وہ اپنی زندگی کو اپنے نظریات کے مطابق ڈھال سکیں۔ انھیں ڈر تھا کہ کہیں انگریزوں کے تسلط کا اختتام ہندوؤں کے تسلط کا آغاز نہ بن جائے وہ قانون کی تبدیلی کے خواہش مند نہ تھے۔ پچھلے تجربات کی بنا پر وہ جانتے تھے کہ ہندو ایک ہی سیاسی ڈھانچے میں مسلمانوں کے ساتھ مساویانہ حیثیت میں زندگی گزارنے پر آمادہ نہ ہوں گے۔ وہ علما جو انڈین نیشنل کانگریس کے ممبر تھے اس سادہ سی بات کی اہمیت کو نہ سمجھ سکے اور بالآخر مسلمانوں کی تحریک آزادی سے بالکل کٹ کر رہ گئے۔

وہ پاکستان کی تحریک کو علاقائی قومیت منصور کر کے اس کی جو مخالفت کر رہے تھے وہ بھی وقتی حالات سے ان کی لاعلمی کا نتیجہ تھی۔ بھلا دس کروڑ مسلمانوں کے مطالبۂ وطن سے عالمگیر اخوت اسلامی کے نظریے کی تکذیب کیونکر ہو سکتی تھی؟ وطن شناخت کے لیے ہوتا ہے۔ اس انفرادیت سے برصغیر کے مسلمانوں کی محرومی یقیناً عالمی اخوت کو کوئی نفع نہ پہنچا سکتی تھی۔ ہاں اگر وہ ہندوؤں کے سیاسی غلبے کو ماننے پر مجبور ہو جاتے تو ان کو یہ انفرادیت کبھی نصیب نہ ہوتی۔ علما کی نظریں ایک دھندلائی ہوئی دور کی روشنی کی طرح اسلام کی عظمت رفتہ پر تھیں اور مستقبل میں اخوت اسلامی کے [illegible] مبہم تصور کی طرف۔ مسلم قومیت کی نشو و نما کو سب سے زیادہ نقصان اسی امر سے پہنچا اور برصغیر کے مسلمانوں کی ترقی رک گئی۔ ایک مضبوط اساس کے بغیر برصغیر کے مسلمانوں کی حیثیت خدائی فوجداروں کی ایک جماعت سے زیادہ نہ تھی، جو عالمگیر اخوت اسلامی کے نام پر دوسروں کے معاملوں میں دخل اندازی کریں۔ وہ دوسرے اسلامی ملکوں کے کیا کام آسکتے تھے جبکہ ان کے پاس اپنا وطن تک نہ تھا۔ وہ علما جو قومیت کے نظریے کو عالمگیر اخوت کے تصور کے منافی سمجھتے تھے ان کا درحقیقت مدعا یہ تھا کہ برصغیر کے مسلمانوں کو اپنا الگ وطن بنانے کی کوشش نہ کرنی چاہیے کیونکہ دنیا کے دوسرے حصوں میں مسلمانوں کے بہت سے وطن موجود ہیں۔ آپ کو اپنا گھر بنانے کی کیا ضرورت ہے جبکہ مشرق وسطیٰ میں اتنے بہت سے اسلامی گھر موجود ہیں؟ اسی قسم کے دلائل تھے جنھوں نے تحریک خلافت کو جو بڑے ارفع و اعلیٰ مقاصد سے کر اٹھی تھی ایک بھول بھلیاں میں پہنچا دیا تھا۔ ہندوستان

کے بعض قابل ترین علما کہا کرتے تھے کہ مغربی طاقتیں خصوصاً انگریز سلطنت عثمانی کو تباہ کر رہے ہیں۔ لیکن ان کو یہ خیال نہ آیا کہ عرب اور ترک خود اپنی اپنی انفرادیت کے قیام کے لیے سرتوڑ جدوجہد میں لگے ہوئے ہیں۔ ترکوں نے ترک قومیت کی تحریک شروع کر رکھی تھی اور اس نظریے کا شدت سے پرچار کرتے تھے کہ "ترکی ترکوں کے لیے ہے۔" ادھر عربوں کا قومی جذبہ یہ مطالبہ کرتا تھا کہ ترکوں سے آزادی حاصل کر کے اپنی انفرادیت قائم کی جائے۔ انگریزوں نے ان کے قومی احساسات سے فائدہ اٹھایا۔ ہمارے علما کو جنہوں نے ترکی میں دوبارہ خلافت کے قیام کی تحریک شروع کر رکھی تھی کبھی یہ خیال نہ آیا کہ ترک تو خود ہی خلافت کے خیال کو ترک کر چکے ہیں۔ ان کے دلوں کو اسلامی اخوت کا تصور ایسا بھا گیا تھا کہ انھوں نے ایک طویل جدوجہد پر کمر باندھ لی۔ وہ سمجھتے تھے کہ اگر خلافت دوبارہ قائم ہو گئی تو مشرق وسطیٰ کی ساری اسلامی دنیا ترکوں کے جھنڈے تلے جمع ہو جائے گی اور پھر ایک دن وہ اس قدر طاقت پکڑ لے گی کہ ہندوستان آ کر انگریزوں کو نکال باہر کرے۔

لیکن اکثر علما جو پاکستان کی مخالفت کرتے تھے اس کی وجہ محض ان کی پریشان دماغی یا اسلامی مسائل سے بے خبری نہ تھی اس کے پیچھے اپنے اقتدار کا شعور بھی کار فرما تھا۔

میں یہاں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میرا روئے سخن علما کے اس طبقے کی طرف ہے جو کھلے بندوں سیاسیات میں حصہ لے رہا تھا۔ ان نیک بندوں کی طرف نہیں جو بے غرضانہ اور مخلصانہ طریق پر قرآن حکیم کی تعلیم کی اشاعت اور اسلام کے پیغام کی تبلیغ کر رہے تھے۔ میں ان سیاسی علما کا ذکر کر رہا ہوں جو مسلم نیشنلسٹوں کے مقابلے میں خود کو انڈین نیشنلسٹ مسلم کہتے تھے۔ وہ انڈین نیشنل کانگرس یا ایسے اداروں کے ممبر تھے جنہوں نے کانگرس سے اشتراک عمل کر رکھا تھا۔ وہ کانگرس سے تعلق رکھنے کے باعث بڑی طاقت رکھتے تھے کیونکہ کانگرس برصغیر کی سب سے بڑی جماعت تھی۔ ہر چند قائد اعظم نے دنیا پر واضح کر دیا تھا کہ برصغیر کے مسلمانوں کی واحد سیاسی جماعت آل انڈیا مسلم لیگ ہے اور کسی اور جماعت کو برصغیر کے مسلمانوں کی نمائندگی کا حق نہیں پہنچتا، مگر حکومت برطانیہ ملک میں جو سیاسی انتظام بھی تجویز کرتی، کانگرس اپنے مسلمان ممبروں کو اس میں

قائم کرنے پر اصرار کرتی۔ کانگرسی مسلمانوں کا خیال تھا کہ غیر منقسم ہندوستان میں حکمراں پارٹی یعنی کانگرس کے تحت مسلمانوں کی قیادت ہمارے ہی ہاتھ میں رہے گی۔ علما جانتے تھے کہ برصغیر کے مسلمانوں کی رہنمائی رفتہ رفتہ جدید تعلیم یافتہ طبقوں کو حاصل ہوتی جارہی ہے۔ ان لوگوں کو قائداعظم کی ذات میں ایک پیشوا بیان اور طاقتور لیڈر مل گیا تھا۔ قائداعظم انگریزوں اور ہندوؤں سے جس اٹل ارادے کے ساتھ مصروف جنگ تھے اس سے ان علما کا اقتدار سخت خطرے میں پڑ گیا تھا۔ قائداعظم کی خدمت ملی' ان کی کامل بے لوثی اور اخلاق وایثار نے لوگوں کے ایک ہجوم کو جو ڈانواں ڈول پھر رہا تھا' ایک طاقتور اور حقیقی قوم بنا دیا تھا۔ یہی وہ ملی قیادت تھی جس سے علما خائف تھے اور اسی کی مخالفت میں انھوں نے انڈین نیشنل کانگرس سے ناتا جوڑ لیا تھا۔

تعلیم یافتہ مسلمانوں اور علما کا اختلاف کوئی نیا اختلاف نہ تھا۔ انگریزی راج کے ابتدائی برسوں ہی سے اس کی بنا پڑ گئی تھی اور یہ پاکستان کی جدوجہد کے دوران اپنی انتہا کو پہنچ گیا تھا۔ ہندوستان میں انگریزی اقتدار کے قدم جما لینے کے بعد برسوں تک علما نے مسلمانوں کو مغربی تعلیم سے الگ رکھا۔ مسلمانوں کا یہ تعصب اور علم سے دانستہ محرومی کا یہ سلسلہ انیسویں صدی کے وسط تک جاری رہا۔ مسلمانوں میں احیائے علوم کا آغاز شاہ ولی اللہ کے زمانے سے ہوا' جنہوں نے ایک طرف مسلمانوں کے ماضی کو کھنگالا اور دوسری طرف ان کے مستقبل کی فکر کرنی شروع کی۔ ان کے بعد سرسید احمد خاں اپنا یہ پیغام لے کر اٹھے کہ مسلمان مغربی علوم اور جدید فنون حاصل کیے بغیر ترقی نہیں کر سکتے۔ ان کا قول تھا اور یہ ایک سادہ سی حقیقت ہے کہ علم پر کسی قوم کی اجارہ داری نہیں' یہ تمام بنی نوع انسان کی ملکیت ہے۔ پھر کیا تھا' علما کا ایک طبقہ پکار اٹھا کہ یہ شخص کافر ہے۔ مگر اس سارے لعن طعن کے باوجود سرسید ہار ماننے والے آدمی نہ تھے۔ وہ جرأت کے ساتھ قدم جمائے رہے بڑی کوشش سے قوم کی ذہنی قوتوں کو ابھارا۔ جوں جوں مسلمان مغربی علوم سے بہرہ مند ہوتے گئے مسلم قوم پر علما کا تسلط کمزور پڑتا گیا۔

پاکستان کا قیام علما کی زبردست شکست تھا۔ لیکن علما کا طبقہ بڑا سخت جان واقع ہوا ہے اور طاقت ایک ایسا نشہ ہے جس کی ترغیب سے بچنا محال ہے۔

جیسے ہی پاکستان وجود میں آیا اس طرح کے علما نے از سر نو اپنی قوتوں کو منظم کرنا شروع کر دیا۔ ان لوگوں کا کہنا تھا کہ اب جبکہ پاکستان وجود میں آ ہی گیا ہے تو ہمارے سوا اس بات کا فیصلہ کون کر سکتا ہے کہ اس نئی اسلامی مملکت کا انتظام کس طرح چلایا جائے۔ بعض نیشنلسٹ علما نے ہندوستان ہی میں ٹھہرنے کا فیصلہ کیا۔ مگر بعض دیگر حضرات جلدی سے پاکستان کی مدد کے لیے دوڑ آئے کہ مسلمانوں کو تو پاکستان سے نہ بچا سکے تھے، اب پاکستان کو مسلمانوں کے ہاتھ سے بچا لیں۔ آنے والوں میں جماعت اسلامی کے امیر مولانا ابوالاعلیٰ مودودی بھی تھے۔ جو پاکستان کے زبردست مخالف رہ چکے تھے۔ موصوف نے آخر دم میں آکر پناہ لی اور پھر جلد ہی پاکستان کے بدنصیب عوام کو "مسلمان بنانے" کی مہم شروع کر دی۔ ان بزرگ نے پاکستان میں جو کچھ دیکھا بڑا روح فرسا تھا۔ غیر اسلامی ملک، غیر اسلامی حکومت اور غیر اسلامی لوگ! بھلا کوئی سچا مسلمان ایسی حکومت سے کیونکر تعاون کر سکتا تھا۔ چنانچہ انھوں نے لوگوں کو ان کی خامیوں، کوتاہیوں اور ان کی عام پستی کا احساس دلانے کی مہم شروع کر دی۔

یہ محض دکھاوا تھا، اصل مقصد تھا علما کی برتری کو از سر نو بحال کرنا اور اپنے لئے قوم کی رہنمائی کا حق منوانا۔ چونکہ تحریک پاکستان کی قیادت تعلیم یافتہ طبقے نے ایک ایسے شخص کی سرکردگی میں کی تھی، جو مغربی تعلیم کا نمونہ تھا، اس سے علما کے وقار کو سخت ٹھیس لگی تھی۔ اس کی تلافی ضروری تھی۔ بس یا سی علما کے سامنے دو راستے تھے۔ ایک تو یہ کہ وہ اپنی حالت کا از سر نو جائزہ لیں اور اپنے طرز نظر کو بدلیں، تاکہ لوگ دینی و دنیوی معاملات میں ان کے علم سے فائدہ اٹھا سکیں۔ دوسرا یہ کہ خدا ترس مگر ناخواندہ عوام کی نظروں میں تعلیم یافتہ طبقوں کے وقار کو گرا دیں۔ انھوں نے لازماً دوسرا راستہ اختیار کیا۔ ظاہر ہے کہ ایک معاشرہ جو ایک صدی کی غلامی کے بعد تازہ تازہ آزاد ہوا تھا اور جس کو ملکی تعمیر کے سلسلے میں بیسیوں مسائل سے دوچار ہونا پڑ رہا تھا، اس میں بہت سی خامیاں اور کمزوریاں ہوں گی۔ علما نے اپنی توجہ ان ہی پر مرکوز رکھی۔ وہ ملک بھر میں پھیل کر لوگوں کو سمجھانے لگے کہ تمہاری زندگی کتنی معصیت زدہ ہے اور تمہاری حکومت کیسی گمراہ ہے۔ انھوں نے ایک امید پرست اور جوش عمل سے سرشار قوم کو ایک تلخ مزاج اور حرماں زدہ قوم بنا دیا۔ علما نے

دعویٰ کیا کہ ہم ہر مرض کی دوا اور ہر درد کا علاج جانتے ہیں۔ ہمارے لیے ملکی مسائل کو حل کرنا کچھ مشکل نہیں۔ لیکن بے بس ہیں کہ ملک پر جدید تعلیم یافتہ طبقوں کا قبضہ ہے جو اسلام کو خیرباد کہہ چکے ہیں اور مغرب زدہ ہو کر رہ گئے ہیں۔ چونکہ کوئی قیادت بھی پلک جھپکتے میں قوم کی ساری مصیبتیں دور نہ کر سکتی تھی، اس لیے ان علما کی خوب بن آئی اور انھوں نے بہت لوگوں کو اپنا پیرو بنا لیا۔

یہی حالات تھے جن کے سبب علما نے انتہائی شدومد کے ساتھ ایک اسلامی آئین کا مطالبہ کیا۔ چونکہ کسی عالم نے اسلامی آئین کے بنیادی عناصر کی صراحت نہیں کی تھی، اس لیے کوئی آئین بھی اس وقت تک اسلامی کہلانے کا مستحق نہ ہو سکتا تھا، جب تک کہ تمام علما اس پر اپنی اپنی مہر ثبت نہ کر دیں۔ اسلامی آئین بنانے کا بس ایک ہی طریقہ تھا کہ ملک کو علما کے حوالے کر دیا جاتا اور ان سے استدعا کی جاتی کہ "بسم اللہ! ہمیں نورِ ہدایت بخشیں۔" علما بعینہٖ یہی بات چاہتے تھے۔ آئین اس وقت تک اسلامی نہیں کہلا سکتا تھا جب تک کہ علما کے ہاتھوں سے نہ بنے اور ان کو حکم لگانے اور حکم چلانے کا اختیار نہ سونپے۔ اس صورتِ حال کو نہ تو عوام ماننے کے لیے تیار تھے اور نہ میں، کیونکہ یہ اس بنیادی جمہوری اصول کی نفی کرتی تھی کہ اقتدار عوام ہی کے ہاتھ میں ہونا چاہیے۔

رفتہ رفتہ آئین کے خاکے ابھرنے شروع ہوئے۔ تمام حاکمیت اللہ ہی کو حاصل ہے لیکن اس کے فضل و کرم سے ایک اسلامی ریاست کے عوام کو یہ توفیق حاصل ہے کہ وہ کتاب و سنت کے مطابق اپنے معاملات کا انتظام و انصرام کر سکیں۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں ہدایت اور عقل کے سرچشموں تک رسائی بخشی تھی اور یہ فہم بھی کہ ان کے مقاصد و مطالب کو سمجھ سکیں اور بیان کر سکیں، الخ۔ ان صلاحیتوں سے کام لے کر اصول ہدایت متعین کرنے چاہئیں اور ضرورت ہو تو ماہرین سے بھی مدد لینی چاہیے۔ یہ اصول متعین کر لینے کے بعد وہ ایسے طریقے سوچیں جن سے انھیں اپنے مسائل کو حل کرنے میں مدد مل سکے۔ ان کو اس قابل ہونا چاہیے کہ وہ اپنے نمائندوں کے ذریعے منظم طریق پر رفاہِ عامہ کے لیے قوانین وضع کر سکیں اور ان کے پاس مناسب منتظمہ ہونی چاہیے۔ جو ان قوانین کو نافذ کرا سکے اور قوم کی جانب سے انتظامی فرائض کی انجام دہی پر مامور ہو نیز

ایک آزاد عدلیہ جو حکم لگا سکے کہ مقننہ اور منتظمہ اپنے اپنے فرائض آئین کے مندرجات کے مطابق انجام دے رہے ہیں یا نہیں۔

جب ان بنیادی باتوں کا فیصلہ ہو گیا تو میں نے حکومت کا ایک ایسا طریقہ متعین کرنے کی کوشش کی جو عوام کے مزاج کے موافق ہو اور اسلامی تعلیمات اور تاریخ اسلام سے بھی مطابقت رکھتا ہو۔ تاریخ اسلام اور مختلف اسلامی ممالک کے آئین کا بغور مطالعہ کیا گیا۔ اس سے دو باتیں ظاہر ہوئیں۔ اول یہ کہ اسلام میں بادشاہت کی کوئی گنجائش نہیں اور جانشینی میراث کی بنیاد پر متعین نہیں کی جا سکتی۔ دوسرے یہ کہ عوام کو من حیث القوم اپنا سربراہ خود چننے اور خود اسے برطرف کرنے کا حق حاصل ہونا چاہیئے۔ تاریخ اسلام کی روح سے ایک اور تسلیم شدہ امر یہ ہے کہ جب قوم اپنا سردار چن لے تو اسے معقول اختیار حاصل ہو کہ وہ حکومت کے کاروبار میں ہم آہنگی پیدا کر سکے، اس کی نگرانی کر سکے اور اس پر قابو رکھ سکے۔ اختیارات کی منتقلی کی اجازت ہو مگر مرکزی اقتدار منتخب شدہ سربراہ ہی کے ہاتھ میں رہنا چاہیئے تاکہ یک جہتی کے ساتھ ملک اور اس کے نظم و نسق کی نگرانی کی جا سکے۔ ہمارے سماجی اور سیاسی حالات میں ایسا مرکزی اقتدار اور بھی ضروری معلوم ہوتا تھا۔ ایک مضبوط مرکزی اقتدار کے بغیر ملک کو قائم اور متحد رکھنا دشوار تھا۔ برصغیر میں مغل شہنشاہ اورنگ زیب کے بعد جب مسلمانوں کی حکومت میں زوال آیا تو اس کی وجہ یہی تھی کہ مرکزی اقتدار کمزور پڑ گیا تھا۔ یہی بات دوسرے اسلامی ادوار پر بھی صادق آتی تھی۔

پاکستان کے اہل دانش کا طبقہ ایک قسم کی پارلیمانی جمہوریت کا عادی ہو چکا تھا۔ لیکن تجربے سے یہ بات ثابت ہو گئی تھی کہ یہ نظام حکومت عوام کے لیے مفید ہونے کی بجائے تفرقے کا باعث ہوا اور ملک کو تباہی کے قریب لے آیا تھا۔ ہم اس کی بدولت ماضی میں خاصا نقصان اٹھا چکے تھے اور دوبارہ وہی غلطی نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اس کی بجائے دوسرا نظام، جو ہماری ضرورتوں کے مطابق معلوم ہوتا تھا، صدارتی نظام تھا۔

ضرورت تھی ایک منتخب شدہ صدر کی جو اپنی کابینہ آپ چننے کا اختیار رکھتا ہو اور ایک مقننہ ۔۔۔ مگر اس کی تعداد موزوں

آدمیوں کی قلت کو دیکھتے ہوئے زیادہ نہیں ہو سکتی تھی۔ صدر اور مقننہ کے روابط اس طرح متعین کئے جائیں کہ صدر کو ملک کا استحکام برقرار رکھنے اور گڑبڑ کی گھڑی کے تعطل کو دور کرنے کا پورا اختیار حاصل رہے۔ یا یوں کہئے کہ منتظمہ اور مقننہ حتی الوسع اس انداز کی بنائی جائیں جیسی خلفائے راشدین کے زمانے میں ہوا کرتی تھیں۔ محاسبے اور توازن کا بھی معقول انتظام ضروری تھا۔ تاکہ صدر اور مقننہ دونوں مناسب، معقول اور ذمہ دارانہ طور پر اپنے اپنے فرائض انجام دیں اور اگر دونوں میں سے کوئی ایک اپنے فرائض کی انجام دہی میں ناکام رہے تو ایک یا دونوں کو برطرف کیا جا سکے۔

صوبائی گورنروں کو صدر نامزد کرے تاکہ صوبوں میں اسی کا اقتدار قائم رہے، ورنہ ساری تعمیر کے ڈھے جانے کا خطرہ ہوگا۔ صوبوں کو بہت سے امور سونپے جائیں تاکہ انہیں معقول حد تک ذمہ داری، خود مختاری اور آزادی عمل حاصل رہے۔

میری رائے میں یہ اس آئین کی جو میں نے ملک کے لیے سوچا تھا کم سے کم بنیادی ضرورتیں تھیں۔ مگر جو لوگ پارلیمانی نظام کے عادی ہو چکے تھے اور جانتے تھے کہ اس سے کیونکر فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے، ان کو میری رائے سے اتفاق کرنے میں بڑی دقت محسوس ہو۔ ایک دفعہ ہم نے مشرقی پاکستان میں چند آدمیوں کو ملاقات کے لیے بلوایا۔ ان میں مولوی تمیز الدین خان مرحوم اور مسٹر نورالامین بھی شامل تھے۔ ہم نے ان سے آئینی مسائل کے تمام پہلوؤں پر تبادلۂ خیال کیا۔

مولوی تمیز الدین نے کہا "میں صدارتی نظام حکومت کے سخت خلاف ہوں۔" میں نے پوچھا "آپ کو کیا اعتراض ہے؟" بولے "مجھے یہ اعتراض ہے کہ تاریخ اسلام میں اکثر و بیشتر شخصی حکومت نظر آتی ہے اور ہمارا اپنا سیاسی تجربہ بھی اسی قسم کا ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ ہم آزادی اور جمہوریت سے بادِ تو دیکھا اسی طرف لوٹ جائیں گے۔" میں نے کہا "اگر یہ بات مسلمانوں کے خون میں رچی ہوئی ہو تو آپ اسے کیسے نکال سکتے ہیں؟ بہر صورت کیا آپ ایک مطلق العنان حکمران اور ایک منتخب شدہ صدر میں فرق محسوس نہیں کرتے؟ کیا ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں صدر نہیں ہوتا اور کیا امریکہ میں جمہوری حکومت نہیں ہے؟ پھر اس ملک میں جہاں دس یا پندرہ سیاسی پارٹیاں موجود ہیں، جن میں مسلم لیگ کو چھوڑ کر نہ کسی کا کوئی قومی نقطۂ نگاہ ہے اور نہ کوئی قومی منصوبہ۔ آپ پارلیمانی نظام جمہوریت کو کیسے

قائم رکھ سکتے ہیں۔

ان کی رائے تھی کہ ہمیں ایسا قانون بنا دینا چاہیئے کہ ملک میں دو سے زیادہ پارٹیاں نہ بننے پائیں۔ میں نے جواب دیا "تمیز الدین صاحب! اگر آپ قانون کے ذریعے لوگوں کے ضمیر پر قابو پا سکتے ہیں۔ تو مسلمانوں کو ایک ہی فرقے کا پیرو کیوں نہیں بنا سکتے؟ اسلام میں بہتر (۷۲) فرقے ہیں۔ اور ان میں سے ہر ایک قرآن ہی کو اپنا سرچشمۂ فکر و عمل سمجھتا ہے۔ یاد رکھیئے کہ آپ قانونی تدابیر سے لوگوں کے ضمیر کو قابو میں نہیں کر سکتے۔"

وہ بولے "میں پھر بھی پارلیمانی نظام ہی کو پسند کروں گا۔" مایوس ہو کر اور زچ آ کر میں نے ان کو ذرا آڑے ہاتھوں لیا۔ بڑے میاں نے بُرا نہ مانا۔

مسٹر نور الامین خاموش رہے۔ میرا خیال ہے وہ اس مباحثے سے الگ رہنا چاہتے تھے۔ لیکن مولوی تمیز الدین بڑے یقین کے ساتھ بولتے رہے اور یہ ان کا سچا خیال تھا، گو غیر حقیقت پسندانہ ہی سہی۔ میں ان کی جرأت کا ہمیشہ معترف رہا ہوں۔

اسی طرح ایک زبردست بحث چھڑ گئی کہ پارلیمانی نظام حکومت اور صدارتی نظام حکومت میں سے کون بہتر ہے۔ مولوی تمیز الدین خاں کی طرح بعض کا کہنا تھا کہ پارلیمانی نظام کو ناحق مہلت دیئے بغیر رد کر دیا گیا ہے غالباً ان کا مطلب یہ تھا کہ اس نظام کی رسی اتنی دراز نہ ہونے پائی کہ اچھی طرح ملک کا گلا گھونٹ دیتی۔ سچ یہ ہے کہ اگر ہم پانچ دس برس اور اس رستے پر چلتے رہتے تو ہمارا خدا ہی حافظ تھا۔

بات یہ ہے کہ پارلیمانی نظام اسی وقت پنپ سکتا ہے جب ملک میں بڑی منظم جماعتیں ہوں اور ان کی تعداد تھوڑی ہو۔ اور ان میں سے ہر ایک کوئی واضح سماجی و اقتصادی منصوبہ رکھتی ہو۔ بعض لوگ کہتے ہیں، "اگر ملک میں پانچ یا دس پارٹیاں ہوں تو حرج ہی کیا ہے، ہم ملی جلی حکومت تو بنا ہی سکتے ہیں۔" لیکن کیا یہی ملک کی بہترین خدمت ہے؟ کیا ملی جلی حکومتیں ایک ترقی پذیر ملک میں مضبوطی کے ساتھ بڑے بڑے فیصلے کر سکتی ہیں اور کیا یہ فیصلے کسی صورت میں ملکی روایات اور رسم و رواج کے خلاف بھی ہو سکتے ہیں؟ ایک ذمہ دار حکومت

رائے عامہ کی تلون مزاجی کی جکڑ بند میں نہیں رہ سکتی۔ آپ کو رائے عامہ سے آگے بڑھ کر سوچنا پڑتا ہے اور لوگوں کو اپنی راہ پر لانا پڑتا ہے۔ میرے سامنے دو مقصد تھے قوم کو متحد کرنا اور ملک کو ترقی دینا۔ ان مقصد کے حصول کے لیے ایک مضبوط، نمائندہ اور دیرپا حکومت اور ملکی ترقی کے منظم منصوبوں کی ضرورت تھی۔ قوم کو عزم راسخ کے ساتھ سائنس اور فنی مہارت کے عہد میں داخل ہونا تھا اور اپنے عقیدے اور نظریۂ حیات کے لازمی ارکان پر بھی مضبوطی کے ساتھ جمے رہنا تھا۔

یہ کہہ دینا آسان ہے کہ ہمیں ماضی کے مانع ترقی کے اثرات کو دور کر دینا چاہیئے، لیکن عملی زندگی میں ان اثرات سے بچنا دشوار امر ہے۔ پارلیمانی جمہوریت کیسے پنپ سکتی ہے جب ملک میں بڑے بڑے زمیندار موجود ہوں جو ہزاروں رائے دھندگان پر اثر ڈال سکتے ہوں؟ پارلیمانی جمہوریت کیسے پنپ سکتی ہے جب یہاں پیروں فقیروں کی بہتات ہو جو لوگوں کو ورغلا سکتے ہیں؟ پارلیمانی جمہوریت کیسے پنپ سکتی ہے، پائیدار حکومت کیونکر بن سکتی ہے جب یہاں دس یا پندرہ یا اس سے زیادہ سیاسی جماعتیں ہوں جن میں سے کسی کا بھی کوئی ٹوس منصوبہ نہ ہو؟ پارلیمانی جمہوریت کیسے پنپ سکتی ہے، جب یہاں ابتدائی تعلیم عام نہ ہونے پائی ہو؟

ایک نیا نظام قائم کرنے کے سلسلے میں یہ بڑی آسان بات ہے کہ کوئی انگریزی، امریکی یا روسی کتاب اٹھائی جائے اور کہا جائے کہ دیکھو ان لوگوں نے یوں کیا تھا، ہم بھی کیوں نہ ایسا ہی کریں! سوال یہ ہے کہ کیا یہ کوشش کامیاب ہوگی؟ کیا اس سے لوگوں کی دل جمعی ہو سکے گی؟ کیا وہ اسے اپنا کہہ سکیں گے؟ اگر نہیں تو پھر یہ ساری کوشش بے کار ثابت ہوگی۔

ایک دفعہ مجھ سے پوچھا گیا: "اس آئین کی بنیادی باتیں آپ کو کس کتاب سے حاصل ہوئیں؟" میں نے کہا: "پاکستان کی کتاب سے۔ اس کی بنیاد وہ علم ہے جو میں پاکستان کے عوام اور پاکستان کی خاک پاک کے بارے میں رکھتا ہوں۔"

میں نے مقامی حکومتوں کا جو نظام سوچا تھا میں نہیں کہہ سکتا کہ "بنیادی جمہوریتوں" کی اصطلاح سے اس کا مفہوم ٹھیک یا پورے طور پر ادا ہو جاتا ہے۔ یہ بنیادی ان معنوں میں ہے کہ سارے ڈھانچے کی تعمیر نیچے سے شروع ہوتی ہے

اور جمہوری ان معنوں میں کہ ایک آئینی ڈھانچے کے تحت ملکی معاملات عوام ہی کو سونپے گئے ہیں۔ میرے سامنے دو عمومی مقصد تھے۔ پہلا یہ کہ لوگوں کو اپنے اپنے علاقوں کے مسائل خود حل کرنے کے لیے منظم کیا جائے اور ان میں اپنی مدد آپ کرنے کا جذبہ پیدا کیا جائے اور دوسرا یہ کہ صدر اور اسمبلیوں کے ارکان کو چننے کا کوئی معقول طریقہ دریافت کیا جائے۔

سیاست دانوں نے جمہوری طریق کار کو اس طرح برتا تھا کہ اس کی صورت ہی مسخ ہو گئی تھی۔ ۱۹۵۶ء میں جو آئین بنایا گیا تھا' اس کی حیثیت ناقابل عمل سمجھوتوں کے ایک پلندے سے زیادہ نہ تھی۔ ۱۹۵۸ء سے لے کر اب تک میری کوشش یہ رہی کہ ملک کے مختلف شعبوں میں اصلاحات جاری کر کے قوم کی نئے سرے سے تنظیم کی جائے۔ ان تمام اصلاحات کا مقصد یہ تھا کہ قوم کو مختصر سے مختصر وقت میں ایک نمائندہ حکومت کے لیے تیار کر لیا جائے۔ ان پر اوپر سے کوئی خاص نظام مسلط کرنا ہرگز مقصود نہ تھا' بلکہ ایک ایسے نظام کو تعمیر کرنا جو سماجی' معاشی' تعلیمی اور اخلاقی حقائق کا لحاظ رکھتے ہوئے بنیاد سے ابھرنا شروع ہو۔ تمام تبدیلیاں اور اصلاحیں نافذ کرنے کا ایک ہی مقصد تھا' وہ یہ کہ ایک ایسی کرسی اٹھائی جائے جس پر ایک ٹھوس سیاسی نظام کا مینار کھڑا کیا جاسکے۔

پچھلے تجربے نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ مغربی قسم کی پارلیمانی جمہوریت پاکستان کے عوام پر نہیں تھوپی جاسکتی۔ مغربی نظام کے پنپنے کے لیے کئی بنیادی باتوں کا ہونا ضروری تھا' جو یہاں نہیں تھیں۔ اعلیٰ پیمانے پر سماجی اور سیاسی شعور' ہمہ گیر تعلیم اور عوامی رابطے کا ایک ترقی یافتہ نظام' جس سے انفرادی اور اجتماعی دلچسپی کے مختلف موضوعات کے بارے میں جلد سے جلد اور صحیح طور پر اطلاعات پھیلائی جاسکیں' یہ وہ لوازمات ہیں جن کے بغیر یہ نظام پروان ہی نہیں چڑھ سکتا۔ ہمارے ہاں ان ابتدائی شرطوں کے نہ ہونے کی صورت میں بھلا عوام سے یہ کیسے توقع رکھی جاسکتی تھی کہ وہ وسیع قومی پالیسیوں کو نظر میں رکھتے ہوئے اپنا ووٹ صحیح طور پر استعمال کر سکیں گے۔ وہ آدمی جو بیماری' اَن پڑھ اور نانِ شبینہ کی فکر میں مبتلا ہو' قومی پالیسیوں کے بارے میں کیا سمجھ سکتا ہے۔

ہم اس انتظار میں بھی نہیں رہ سکتے تھے کہ پہلے قوم کو یہ لوازمات میسر آجائیں پھر جمہوریت قائم کی جائے۔ ہمیں تو کوئی نہ کوئی نظام جاری کرنا ہی تھا جسے لوگ

ان کوتاہیوں کے باوجود سمجھ سکیں اور اس پر عمل کر سکیں۔ اس کے معنی تھے قوم کے سوادِ اعظم تک پہنچنا۔ ہماری آبادی کی بہت بڑی اکثریت دیہات میں رہتی ہے، ان میں زیادہ تر لوگ اَن پڑھ ہیں، لیکن وہ اپنے مسائل کی سوجھ بوجھ رکھتے ہیں۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ ان کے مسائل کو ان کے سامنے سیدھے سادھے طریقے سے پیش کیا جائے تاکہ وہ اس کے متعلق کوئی فیصلہ کر سکیں۔ نیز جب ان سے کہا جائے کہ تم اپنا نمائندہ چنو تو وہ جن لوگوں میں سے انتخاب کریں انھیں ذاتی طور پر یا شہرت کی بنا پر جانتے ہوں۔

اگر ملک میں منظم سیاسی جماعتیں ہوں جن کے پاس مواصلات کے ترقی یافتہ ذریعے ہوں تاکہ وہ اپنے مقاصد کی تشریح کر سکیں تو عوام کے لیے اپنے مسائل کو سمجھنا اور افراد کو جانچنا آسان ہو سکتا ہے۔ لیکن بدقسمتی سے ہمارے ہاں قابلِ ذکر سیاسی جماعتیں موجود نہ تھیں اور جو تھیں ان کے پاس کوئی قومی منصوبہ نہ تھا۔ لوگوں کو ملک گیر پیمانے پر ووٹ دینے کی رسم میں شامل ہونے کی ترغیب دینا اور ایسے لوگوں کو ووٹ دلوانا جن کو نہ تو انھوں نے کبھی دیکھا ہو اور نہ ان کے بارے میں کوئی واقفیت رکھتے ہوں، ایسا ہی ہے جیسے بہلا پھسلا کر یا ڈرا دھمکا کر ان سے ان کے ووٹ کا حق چھین لیا جائے۔ یہ صورتِ حالات تو بس پیچ دار تقریریں کرنے والے گندم نما جو فروش لیڈروں ہی کے لیے سازگار تھی۔ چونکہ ان کے پاس کوئی ٹھوس پروگرام پیش کرنے کے لیے نہیں ہوتا اس لیے وہ عوام کے دلوں میں طرح طرح کے ولولے پیدا کرنے اور ان کے جذبات سے کھیلنے میں ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ عوام جو معاشی اور سماجی مسائل میں گھرے ہوئے تھے ان کے فریب میں آجاتے تھے۔ انھیں سبز باغ دکھائے جاتے اور وہ تھوڑی دیر کے لیے پسیج جاتے اور چکر میں آجاتے۔ اکثر اوقات لیڈروں کی اپیل منفی اور تخریبی رنگ لیے ہوتی تھی۔ ان باتوں سے صرف ہیجان پیدا ہوتا، شک و شبہے ابھرتے اور ملک میں تفرقے پیدا ہوتے۔ سچ پوچھیے تو اس نظام کے تحت عوام کو عوام ہی کے خلاف استعمال کیا جاتا رہا تھا۔

مجھے بخوبی علم تھا کہ اگر میں نے اس نظام میں کوئی بھی تبدیلی کی تو میری کتنی مخالفت ہوگی۔ اول اہلِ دانش کی طرف سے۔ یہ بہت چھوٹی اقلیت ہے، مگر

مؤثر آواز رکھتی ہے اور مغربی خیالات پر پلی ہے۔ یہ لوگ تعلیم یافتہ ہونے کی بدولت زعما میں شمار ہوتے ہیں اور اپنے کو رائے عامہ کا علم بردار سمجھتے ہیں۔ ان کو عوام کی فکر رہتی ہے اور اکثر خاصے خلوص کے ساتھ۔ لیکن ان میں سے کم ہی کسی کو صحیح معنوں میں عوام سے سابقہ پڑتا ہے اور ایسے تو اور بھی کم ہیں جنہوں نے عوام کے مسائل پر کبھی سنجیدگی سے دھیان دیا ہو۔ وہ تو بس اتنا ہی کہنا جانتے ہیں کہ تمام قوت کے مالک عوام ہیں۔ ان کو یہ فکر نہیں کہ اس قوت کو کس طرح یا کس صورت سے کام میں لایا جائے۔ وہ جہالت، غربت، اور دکھ درد کے خلاف جہاد کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں، مگر یہ جہاد تدبیر سے نہیں تقریر سے کیا جاتا ہے۔ ان کے دل میں جہالت کے خلاف بڑا درد اٹھتا ہے مگر وہ جہلا کی کوئی امداد کرنے کو تیار نہیں۔ وہ غربت کی مذمت کرتے ہیں، مگر غریب سے ہمدردی نہیں کرتے۔ وہ بھوک کو الزام دیتے ہیں، مگر بھوکے کو سہارا نہیں دیتے۔

دوسرے درجے پر مخالفت کرنے والے وہ ہوں گے جو ذاتی مفاد رکھتے ہیں یعنی سیاست دان اور زمیندار۔ وہ اپنے علاقے کے لوگوں کی حمایت اور وفاداری کے عادی ہو چکے ہیں۔ ان کو بھلا یہ کیونکر گوارا ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص اپنی قوتِ فیصلہ استعمال کرے، اور ان کے اقتدار کو جھٹلائے اور آخر میں میرے مخالف قدامت پرست اور تنگ خیال طبقے ہوں گے جو مذہب کی آڑ لے کر ہر قسم کی ترقی کی کوششوں کو ناکام بنا دینا چاہتے ہیں۔

یہ تمام لوگ انتخابی نظام میں ہر اس تبدیلی کے خلاف جنگ کریں گے جو عام آدمی کو اپنی مرضی کا مالک بنانا چاہے۔ لیکن نتائج کچھ بھی ہوں ملک کی بھلائی کے لیے صحیح قدم اٹھانا ہی چاہیئے۔

میں نے دیہاتی علاقوں میں ایک ایک گاؤں اور شہروں میں ایک ایک محلے کو لیا۔ یہی وہ سطح ہے جہاں لوگ براہِ راست ایک دوسرے سے واقف ہو سکتے ہیں اور یہی وہ مقام ہے جہاں حقیقی مسائل پائے جاتے ہیں۔ میں نے اندازہ کر لیا کہ دیہات کے لوگ خواہ ناخواندہ سہی، اپنے انفرادی اور اجتماعی مفادات اور ان کے فوری حل کی ضرورت کا شعور رکھتے ہیں۔ اسی سطح پر لوگ یہ جان سکتے ہیں کہ وہ اپنی مدد اور رہبری اور خدمت کے لیے کن کن اشخاص پر بھروسہ کر سکتے ہیں۔ جس نظام

حکومت کی جڑیں اس حد تک مضبوطی سے زمین میں پیوستہ تھا۔

میں نے بنیادی جمہوریتوں کے آئندہ منصب کے لیے ذیل کے اصول وضع کیے:

اول یہ کہ وہ انتہائی براہ راست طریقے پر اپنے اپنے علاقے کے چنے ہوئے نمائندوں پر مشتمل ہوں۔ دوسرے یہ کہ وہ اپنے اپنے علاقے میں قلب کی حیثیت حاصل کریں جہاں ترقی اور شہری ذمہ داری کے تمام مقامی مسائل کا گہرا مطالعہ کیا جائے ان کے حل تلاش کیے جائیں اور ان پر پورا پورا عمل کیا جائے۔ تیسرے یہ کہ وہ رفتہ رفتہ سرکاری کارکن اداروں کو اپنے اندر جذب کر لیں اور عوامی جماعتوں کی حیثیت سے کام کرنا شروع کر دیں۔ اور آخری بات یہ کہ وہ لوگوں میں توانائی اور ولولہ پیدا کریں اور ان اخلاقی اور ذہنی قوتوں کو بیدار کریں جو ملک میں باعمل اور پُرخلوص رہنمائی کی روایات کو پروان چڑھانے کے لیے لازمی ہیں۔

مارشل لا جاری کرنے کے دو دن بعد ۱۰ اکتوبر ۱۹۵۸ء کو میں نے ایک اخباری کانفرنس میں کہا تھا کہ اقتدار عوام کو لوٹا دیا جائے گا۔ اس کے تین مہینے کے بعد میرا ایک اور بیان بھی موجود ہے کہ جیسے ہی ضروری اصلاحات زیر عمل آ جائیں گی ملک کو ایک ایسا آئین دے دیا جائے گا جو لوگوں کی خواہشات پر مبنی ہو اور ان کے مفاد کو پورا کر سکے۔ میں نے یہ بات واضح کر دی تھی کہ پاکستان کسی اور ملک کے آئین کی نقالی نہیں کرے گا' بلکہ ملک کے سماجی اور اقتصادی حالات کو دیکھتے ہوئے اپنا آئین آپ بنائے گا۔

بنیادی جمہوریتوں کا قیام اس مقصد کے حصول کی طرف پہلا قدم تھا' اور جیسا کہ بعد کے تجربے نے پوری طرح ثابت کر دیا ہے' ہم نے بنیادی جمہوریتوں کے نظام کے ذریعے عوام میں اتنی بیداری اور تنظیم پیدا کر دی ہے کہ وہ اپنے اجتماعی معاملات میں پورا پورا حصہ لے رہے ہیں اور یہ احساس رکھتے ہیں کہ اپنی مدد آپ کی بجائے اور اپنا انتظام خود سنبھالنے جا رہے ہیں۔ سرکاری عہدہ داروں اور عوام کا درمیانی فاصلہ کم رہ گیا ہے۔

بنیادی جمہوریتوں کے قیام کا فیصلہ گورنروں کی اس کانفرنس میں کیا گیا تھا جو تیس اپریل سے یکم مئی ۱۹۵۹ء تک کراچی میں منعقد ہوئی تھی۔ اسی سال بارہ سے تیرہ جون تک نتھیا گلی میں پھر گورنروں کی کانفرنس ہوئی تھی جس میں

اس نئے نظام کے بارے میں زیادہ تفصیلی فیصلے کئے گئے۔ بنیادی جمہوریتوں کے قیام کا باضابطہ حکم ۲۶ اکتوبر کو جاری کیا گیا جس میں مقامی کونسلوں سے لے کر صوبائی ترقیاتی مشاورتی کونسلوں تک کے ادارے قائم کرنے کا فیصلہ مندرج تھا۔

بنیادی جمہوریتوں کے یونٹوں کے انتخابات جنوری ۱۹۶۰ء کے اوائل تک مکمل ہو چکے تھے۔ مارشل لاء کے ضابطے کے تحت سیاسی اجلاس کی تنظیم کرنے، اجلاس بلانے یا اجلاس میں شرکت کرنے پر جو پابندی عائد تھی وہ آنے والے انتخابات کی بنا پر کھول دی گئی تھی۔ تقریباً ایک ہزار ووٹروں (بالغ مردوں اور عورتوں) کے ایک حلقے کو اپنا ایک نمائندہ چننا تھا۔ ان واحد ممبر والے یونٹوں کو، جن کی تعداد کوئی اسی (۸۰) ہزار تھی (ہر صوبے میں تقریباً چالیس ہزار) بعد ازاں ایک دوسرے سے ملا کر مقامی نظم و نسق کے حلقوں کا نظام قائم کیا گیا۔ ہر ایک صوبے میں ابتدائی درجے کے حلقوں کی تعداد چار ہزار تھی۔ ان کو دیہات میں یونین کونسل اور شہروں میں ٹاؤن یا یونین کمیٹی کا نام دیا گیا۔

اس مرحلے پر میں نے محسوس کیا کہ مجھے اپنا کام جاری رکھنے کے لیے لوگوں سے باقاعدہ اختیار حاصل کر لینا چاہیے۔ چنانچہ بنیادی جمہوریتوں کے انتخابی نتائج کے اعلان سے پہلے فیصلہ کیا گیا کہ میں اسی ہزار بنیادی جمہوریتوں کے ممبروں سے اعتماد کا ووٹ حاصل کروں تاکہ عوام کے تفویض کردہ اختیارات کے تحت ملک کے لیے آئین بنا سکوں۔ اعتماد کے ووٹ کے نتائج کا اعلان الیکشن کمیشن نے ۱۰ فروری ۱۹۶۰ء کو کیا۔ نتائج یہ تھے: پچھتر ہزار دو سو اسی اثباتی ووٹ میرے حق میں جو تقریباً اسی ہزار جملہ ووٹروں میں ۹۵٫۶ فیصد کا تناسب رکھتے تھے۔ میں نے ۱۷ فروری ۱۹۶۰ء کو پاکستان کے پہلے منتخب شدہ صدر کی حیثیت سے حلف اٹھایا۔ اس کے بعد فوراً ہی میں نے ایک آئینی کمیشن بنایا جس کے سربراہ سپریم کورٹ کے مسٹر جسٹس شہاب الدین تھے۔ ان کے علاوہ ہر صوبے سے پانچ پانچ ممبر لیے گئے۔ اس کمیشن کے ذمے حسب ذیل فرائض کیے گئے۔

ا۔ پاکستان میں پارلیمانی حکومت کی تدریجی ناکامی کا جائزہ لینا جو ۱۹۵۶ء کے آئین کی تنسیخ کا موجب ہوئی اور ایسی تدابیر تجویز کرنا کہ یہ اسباب دوبارہ پیدا نہ ہونے پائیں۔

۲۔ لوگوں کے مزاج، اہل ملک کے عام تعلیمی معیار اور سیاسی شعور قومیت کی موجودہ صورت، لگاتار ترقی کی ضرورت، اور پچھلے چند ماہ کی آئینی اور انتظامی تبدیلیوں کو مدنظر رکھ کر آئین کے لیے تجاویز پیش کرنا۔

۳۔ تجاویز میں ایسی سفارشات شامل ہوں جن میں بتایا گیا ہو کہ مندرجہ ذیل مقاصد کس طرح بطریق احسن حاصل کئے جا سکتے ہیں۔

(الف) ایک جمہوریت جو خود کو بدلے ہوئے حالات کے مطابق ڈھال سکے اور جو اسلامی اصول انصاف، مساوات اور رواداری پر مبنی ہو۔

(ب) قومی یگانگت کا استحکام اور

(ج) ایک مضبوط اور پائیدار نظام حکومت۔

اس زمانے میں بہت سے لوگوں کو خیال ہوا کہ میں جلد بازی سے کام لے رہا ہوں، نیز یہ کہ مجھے اصلاحات کی جڑیں مضبوط ہو جانے کے لیے کافی وقت دینا چاہیے ہم نے ان اصلاحات کے نفاذ اور ان کے معقول نتائج کی بنا پر دنیا کی نظروں میں خاصا احترام اور وقار حاصل کر لیا ہے۔ اگر ہم جلد ہی آئینی حکومت کی طرف لوٹ پڑے تو اس ساری ترقی کو خطرہ لاحق ہو جائے گا۔ ایک انگریز دوست نے مجھ سے پوچھا: "تم آئین رائج کرنے میں اتنی جلدی کیوں کر رہے ہو؟" میں نے کہا: "میں سمجھتا تھا کہ تم لوگ ایک جمہوریت پسند قوم ہو۔" اس نے جواب دیا: "ہاں، مگر موجودہ نظام کے تحت ملک کا انتظام بہت اچھی طرح چلایا جا رہا ہے اور ٹھوس ترقی کر رہے ہو۔ اگر تم نے احتیاط نہ کی تو پھر مشکلات میں پڑ جاؤ گے۔"

اپنے ملک میں بھی بعض لوگوں کو جن میں میری کابینہ کے کچھ ممبر بھی شامل تھے یقین تھا کہ ہماری اصلاحات سے زمینداروں، ریاست والوں اور اسی قسم کے دوسرے گروہوں کے ذاتی مفادات کو سخت نقصان پہنچا تھا۔ یہ لوگ مجھے ہٹانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیں گے، اور پچھلے چند برس میں جو کچھ حاصل ہوا ہے اس کو سب مل کر خاک میں ملا دیں گے۔

میں عام آدمیوں کے احساسات سے بھی بخوبی واقف تھا۔ بعض نے کہا کہ میں انھیں دوبارہ انسان نما بھیڑیوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دینا چاہتا ہوں اور یہ کہ لوگوں کے دلوں سے قانون کا احترام پھر اٹھ جائے گا۔ بدعنوانی اور حصول

اقتدار کی دوڑ پھر شروع ہو جائے گی اور ماضی میں سیاست دان باؤلے ہو کر نکل پڑیں گے اور میرے سب کئے دھرے کو ملیا میٹ کر دیں گے۔ اخبارات بھی ساتھ ہو جائیں گے کیونکہ جو اخبارات غیر ذمہ داری کی تلقین کرتے ہیں اور گورنمنٹ کے مخالفوں کی پیٹھ ٹھونکتے ہیں ان کی اشاعت خوب بڑھتی ہے۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ جن لوگوں نے اصلاحات سے فائدے اٹھائے ہیں وہ نہ اتنے طاقتور ہیں نہ اتنے منظم کہ اپنی نئی حیثیتوں پر جمے رہیں۔ چنانچہ دباؤ ڈالنے والے گروہوں اور اہل غرض کی دستبرد سے ان کی اور نئے قوانین کی حفاظت میرا ہی کام ہوگا۔

تاہم میں اس نتیجے پر پہنچا کہ ہر چند ابھی ہماری تمام اصلاحات کی جڑیں مضبوط نہیں ہوئیں، بہتر ہے کہ ایک آزمائش کر لی جائے، اور اس سے آگے لوگوں کو اپنا کام خود جاری رکھنے کا موقع دیا جائے۔ یہ لوگ اپنی اپنی صلاحیت کے مطابق اصلاحات کو اپنائیں اور آگے بڑھائیں۔ اس فیصلے پر پہنچنے میں مجھ پر کوئی اندرونی یا بیرونی دباؤ نہیں پڑا، لیکن مجھے اس اہم ذمہ داری کا زیادہ احساس تھا جو میں نے ملک کو صحیح قسم کا آئین دینے کے لیے لے رکھی تھی۔ میں سمجھتا تھا کہ میرے پاس مسئلے کا حل موجود ہے اور میں اسے بروئے کار لانا چاہتا تھا۔

میں نے اکتوبر ۱۹۵۸ء میں اعلان کیا تھا کہ میں ۱۹۵۶ء کے آئین سے "ضروری حد تک قریب رہ کر" عمل کرنا چاہتا ہوں۔ اگرچہ مارشل لا ۱۹۵۶ء کے آئین کے تحت جاری کیا گیا تھا مگر اس کے مؤثر ہونے کی وجہ یہ تھی کہ مارشل لا نے اقتدار کا ایک مرکز پیدا کر دیا تھا جو خود ۱۹۵۶ء کے آئین میں موجود نہ تھا۔ میں نے "آئندہ آئین کے لیے کئی قطعی تجاویز سوچ رکھی تھیں، لیکن میں نے کہا کہ "میں کمیشن کی سفارشات کو پورے طور پر ماننے کے لیے تیار ہوں خواہ وہ میرے خیالات سے مختلف ہی کیوں نہ ہوں۔ ہاں ان کا میری تجاویز سے بہتر اور ملک کے لیے مفید ہونا شرط ہے۔ علاوہ ازیں کمیشن کو پوری آزادی اور پورے اختیارات حاصل ہیں کہ وہ ایسی سفارشات کرے جنہیں وہ ملک کے لیے موزوں تصور کرتا ہو۔ اس کام میں سوائے اس کے اپنے ضمیر اور پاکستان سے اپنی محبت کے اور کوئی عنصر اس پر اثر نہ ڈال سکے گا۔"

کمیشن کے قیام کے بعد اس کی رپورٹ کا انتظار کیا گیا۔ یہ رپورٹ مجھے ۶ مئی

۱۹۶۱ء کو پیش کی گئی۔ کمیشن نے پاکستان میں پارلیمانی نظام حکومت کی ناکامی کی بڑی وجہ قرار دی تھی: "رہنمائی کا فقدان جس کی بنا پر منظم اور باضابطہ پارٹیاں نہ بن سکیں، اس کے علاوہ سیاست دانوں میں بلند سیرتی کی کمی' اور حکومت کے نظم ونسق میں ان کی بے جا دخل اندازی۔" ان حالات کے تحت کمیشن نے سفارش کی تھی کہ پاکستان میں "حکومت کی کوئی ایسی شکل ہونی چاہیئے جس میں ایک شخص پوری طرح بااختیار ہو اور ایک آزاد مقننہ ہو جو مؤثر طور پر اس کی نگرانی کرے۔ مقننہ کے ممبر ایسی پوزیشن نہ رکھتے ہوں کہ وہ اپنے ذاتی فائدے کے لیے سیاسی دباؤ کر نظم ونسق میں مداخلت کر سکیں۔" کمیشن نے ایک نیم وفاقی ڈھانچے کے ماتحت ایک مضبوط مرکز کی بھی پرزور سفارش کی۔

کمتر افراد کے اس خیال کے پیش نظر کہ مرکز کو صرف تین محکمے دیئے جائیں، یعنی دفاع' معاملات خارجہ اور کرنسی' آئینی کمیشن نے لکھا:

یہ خیال جن وجوہات کی بنا پر ظاہر کیا گیا تھا' ان میں سے ایک یہ تھی کہ چونکہ ۱۹۴۰ء کی قرارداد لاہور میں آزاد ریاستوں کا ذکر کیا گیا ہے، اس لیے تمام صوبے خودمختار ہونے چاہئیں، لیکن قرارداد لاہور میں مشرقی پاکستان کو ایک ایسا صوبہ متصور کیا گیا تھا جس میں پورا بنگال اور آسام شامل تھے۔ اس صوبے میں صنعتیں بھی تھیں اور لمبے وسیع اقتصادی ذرائع بھی حاصل ہوتے' اس لیے اسے خودمختار صوبہ بنایا جا سکتا تھا۔ اس وقت یہ گمان نہ ہو سکتا تھا کہ سابق بنگال اور پنجاب کے صوبوں کو تقسیم کر دیا جائے گا' اور پاکستان کو بنگال کا جو نصف مشرقی حصہ ملے گا وہ صنعت وحرفت سے عاری ہو گا۔ ان صوبوں کی تقسیم بعد کو ظہور میں آئی' جو غیر منقسم ہندوستان کی اکثریت والی قوم کی اس بالکل آخری کوشش کا نتیجہ تھی کہ برصغیر کی تقسیم رک جائے۔ اگر قرارداد لاہور کے وقت یہ پتہ چل جاتا کہ ان صوبوں کو تقسیم کیا جائے گا' نیز یہ کہ پاکستان مشرق میں صرف موجودہ مشرقی پاکستان پر مشتمل ہو گا تو مسلم لیگ اسے کبھی خودمختار صوبہ تصور نہ کرتی' کیونکہ صنعتی ترقی کی عدم موجودگی میں ممکن ہی نہ تھا کہ مشرقی پاکستان ایک خودمختار یونٹ کی حیثیت سے اپنے پاؤں پر کھڑا ہو سکے۔ جس وقت قرارداد لاہور منظور کی گئی تھی اس وقت برصغیر کو دو خودمختار ملکوں میں تقسیم کرنے کا خیال عملی طور پر

محال سمجھا جاتا تھا۔ ہماری رائے میں متذکرہ بالا قرارداد کی لفظی پابندی پر اصرار کرنا اور اس امر کو نظر انداز کرنا کہ پاکستان کے موجودہ بازو بغیر ایک مضبوط مرکز کے ترقی بھی کر سکتے ہیں اور اپنے معاملات کو سنبھال سکتے ہیں یا نہیں، نہایت غیر دانشمندانہ اور غیر حقیقت پسندانہ بات ہو گی۔

کمیشن نے ایک دو ایوانی مقننہ، ایک نائب صدر، محدود بالغ رائے دہندگی کی بنیاد پر براہ راست انتخاب، اور جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کی سفارش کی۔

کمیشن نے صدارتی نظام حکومت، وفاقی ڈھانچے اور مضبوط مرکز کے قیام کی جو تجاویز پیش کی تھیں ان کو تو میں نے منظور کر لیا، لیکن میں دو ایوانی مقننہ اور نائب صدر کے عہدے کی سفارش کو منظور نہ کر سکا۔ حق رائے دہی کا مسئلہ مقننہ کی مرضی پر چھوڑ دیا گیا، جس نے اپریل ۱۹۶۲ء میں فیصلہ کیا کہ بنیادی جمہوریتیں قومی اور صوبائی اسمبلیوں اور صدر کے عہدے کے انتخابات کے لیے انتخابی ادارے کے طور کام کریں گی۔

میں آئینی کمیشن کے کام سے یقیناً بڑا متاثر ہوا۔ اس نے ایک ایسی دستاویز تیار کی تھی جو پوری توجہ کی مستحق تھی اور مجھے یاد ہے کہ میں نے کیبنٹ کمیٹی کی راہنمائی کے لیے جو اس رپورٹ کا جائزہ لے رہی تھی اس پر تفصیلی تبصرہ کیا تھا۔

میں نے بذاتِ خود جو تجربہ کیا اس سے میں اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ پاکستان کو ایک مضبوط حکومت کی ضرورت ہے جو ایسے فیصلے کرنے پر قادر ہو جنہیں شاید عام طور پر پسند نہ کیا جائے، لیکن جن کی ملک کی سلامتی، سالمیت اور بالخصوص ترقی کے لیے اشد ضرورت ہے۔ ہم اس تعیش میں کہاں پڑ سکتے ہیں کہ کوئی ایسا نظام بنائیں جو حکومت کے وجود کو دباؤ ڈالنے والے گروہوں کی من مانی کارروائیوں کا تابع کر دے۔ اس بات پر میں کوئی سمجھوتہ کرنے کو تیار نہ تھا۔

ہندوستان اور پاکستان کے سیاسی حالات کا مقابلہ کر کے اکثر کہا جاتا ہے ہندوستان والے تو پارلیمانی جمہوریت کو چلا سکیں اور ہم اس میں ناکام رہیں۔ اول تو قومی شعور ہندوؤں میں برصغیر کے مسلمانوں سے بہت عرصہ پہلے پیدا ہو گیا تھا۔ انڈین نیشنل کانگرس بہت عرصے پہلے قائم ہو چکی تھی۔ ہندوؤں میں وہ اختلافات نہ تھے جو مسلمانوں میں پائے جاتے تھے۔ ہندوؤں کی کئی جماعتیں تھیں مگر وہ سب بنیادی باتوں پر متفق تھیں۔ مسلمان آپس میں بٹے ہوئے تھے۔ بعض مسلمان ہندوؤں کے ساتھ

نبھانے کی کوشش کرنا چاہتے تھے گویا کہ غیر ہندو قومیت کے حلقے میں کوئی مقام مل سکتا تھا، مگر مسلمانوں کی اکثریت جانتی تھی کہ انگریزوں کے چلے جانے کے بعد ہندو اکثریت ان پر غلبہ پا لے گی۔ ہندوؤں میں بھی کچھ لوگ ایسے ہوں گے جو یہ خیال کرتے ہوں گے کہ مسلمانوں کو گوارا کر لیا جائے لیکن ان کی اکثریت یا تو مسلمانوں کو ملک بدر کر دینا چاہتی تھی یا ان کو غلام بنا کر رکھنا چاہتی تھی۔ رہی یہ بات کہ ہندو اب تک پارلیمانی نظام کے تحت جمہوری حکومت کو قائم رکھے ہوئے ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ نظام ہندوستان میں ہمیشہ قائم رہے گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہاں تبدیلیاں آئیں گی۔ تحریک آزادی نے وہاں کے لوگوں میں جو ولولہ اور اتحاد پیدا کر رکھا تھا وہ زائل ہوتا جا رہا ہے۔ ذاتی مناقشات، علاقائی تنازعات اور لسانی اختلافات اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ کانگرس پارٹی کا ٹوٹنا لازمی ہے۔ جس وقت ایسا ہوگا تو ہندوستان کو بھی تدریجاً ویسی ہی صورت حال درپیش ہوگی جو ہمیں اس سے پہلے درپیش ہوئی۔

اب پھر آئینی کمیشن کی رپورٹ کی طرف آئیے۔ حق رائے دہی اور ووٹنگ کے طریق کے سوال پر میں نے کمیشن کے خیالات سے اختلاف کیا تھا۔ کمیشن نے محدود رائے دہی کی بنیاد پر براہ راست انتخابات کے طریق کی سفارش کی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ حق رائے دہی کی توسیع اور تعین کی صورت میں یہ دو پہلو ہونی چاہئیں اور ہمارے موجودہ حالات کے تحت حق رائے دہی کو پاکستان کے صرف ان شہریوں تک محدود کر دینا چاہئے جو یا تو اتنے پڑھے لکھے ہوں کہ وہ سیاسی مباحث کو سمجھ سکیں، یا کافی جائیداد رکھتے ہوں کہ ملک کے ساتھ ان کا مفاد وابستہ ہو۔ کمیشن نے سفارش کی کہ حق رائے دہی کی ایک کمیٹی قائم کی جانے جو ایک سال کے اندر اندر اپنی رپورٹ پیش کرے۔ اس رپورٹ میں مطلوبہ معیار کا تعین کیا جائے۔ تاکہ اگلی معیاد کے براہ راست انتخابات کے لیے وقت پر انتخابی فہرست تیار کی جا سکیں۔

میں یہ بات نہ سمجھ سکا کہ بنیادی جمہوریتوں کے ممبروں کو انتخابی ادارہ کیوں قرار نہ دیا جائے۔ ہمارے پاس بالغ رائے دہی کی بنیاد پر منتخب شدہ قوم کے اسی ہزار نمائندے موجود تھے، جو فی الحقیقت پاکستان کی مجلس عظمیٰ کا درجہ رکھتے تھے یہی لوگ صدر اور مقننہ کے اراکین کا انتخاب کیوں نہ کرتے؟ ان کو اس بنا پر خارج کرنا کہ ان میں سے کچھ لوگ غیر تعلیم یافتہ تھے، اپنی علمیت کا بے جا زعم ہی کہا جا سکتا

تھا۔ یہ اسّی ہزار ممبر سابقہ اسمبلیوں کے ان سی ممبروں سے یقینی طور پر بہتر تھے جو پارلیمانی حکومتوں کے زمانے میں حکومتوں کو بناتے اور بگاڑتے رہتے تھے۔ بنیادی جمہوریتوں کے ممبروں کو انتخابی حلقہ قرار دینے کے خلاف یہ بھی کہا جاتا ہے کہ چونکہ ان کی تعداد محدود ہے اس لیے ان پر آسانی رشوت اور دوسرے ناجائز ذریعے سے اثر ڈالا جا سکتا ہے۔ بے شک یہ درست ہے کہ بعض انتخابی حلقوں میں خصوصاً بڑے بڑے شہروں اور قصبوں میں جہاں مالدار لوگوں کی کثرت ہے ان ممبروں کو روپے سے ورغلایا جا سکتا ہے۔ مگر اس کے قصوروار فقط بنیادی جمہوریت کے ممبر ہی نہیں ہیں، بلکہ وہ صاحب ثروت امیدوار ہیں جو ان کو غیر دیانت دار بناتے ہیں اور رشوت دینے میں ایک دوسرے سے سبقت لے جاتے ہیں۔ مجھے کراچی کے حالیہ ایک ضمنی انتخاب کا حال معلوم ہوا ہے جس میں ایک امیدوار کے مخالفین نے اسے شکست دینے کے لیے ایک سیدھا سادا مگر نہایت موثر نسخہ استعمال کیا۔ یہ لوگ ووٹروں کے حلقے میں پھرتے اور ان سے کہتے کہ فی ووٹ اتنا روپیہ طلب کرو۔ بعض لوگ اس قسم کی ترغیب سے بچ نہیں سکتے۔ اگر انتخابات براہ راست بالغ رائے دہی کی بنیاد پر کرائے جاتے تب بھی یہی صورت پیش آتی۔ اس وقت انتخاب لڑنا اور بھی مہنگا سودا بن جاتا، اور صرف کروڑپتی ہی اس کی جرأت کر سکتے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ انتخابات میں جو غیر دیانتداری برتی جاتی ہے اس کو مٹانے کی کوشش نہ کی جائے۔ مشکل یہ ہے کہ جب تک لوگ سیاسی شعور نہ رکھتے ہوں اور حق رائے دہی کو کسی اصول پر استعمال کرنے کی ذمہ داری کو محسوس نہ کریں، آپ کتنی ہی قانونی پابندیاں لگا دیں غیر دیانت داری باقی رہے گی۔

میرے ذہن میں یہ بات بالکل واضح تھی کہ جب تک ہمارا تعلیمی و اقتصادی معیار اور سیاسی ذمہ داری کی سطح خاصی حد تک بلند نہ ہو جائے بنیادی جمہوریتوں کے ذریعے بالواسطہ انتخابات کا طریقہ ہی زیادہ مفید ثابت ہوگا۔ علاوہ ازیں اگر بنیادی جمہوریتوں کے ممبروں کی اہمیت کو کسی صورت سے بھی کم کیا گیا تو ملک میں سخت ابتری اور گڑبڑ پھیل جائے گی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ قوم کے نمائندوں نے نظم و نسق کی مختلف سطحوں پر سرکاری افسروں کے مساوی درجہ اور حکومت کا کاروبار چلانے میں براہ راست دخل حاصل کیا تھا۔ اگر نمائندہ حکومت کی بالائی سطح کی تشکیل میں ان

ممبروں کو نظر انداز کیا گیا تو اس کی سخت مخالفت ہوگی۔ یہ نظام ملک میں بڑی تیزی
سے جڑ پکڑ رہا تھا اور سرکاری اداروں اور قوم کے نمائندوں میں اشتراکِ عمل پیدا
ہو رہا تھا۔

میں کمیشن کی اس سفارش سے بھی متفق نہ ہو سکا کہ نائب صدر کا عہدہ رکھا
جائے جسے صدر اپنے کچھ فرائض تفویض کرے۔ کمیشن کا خیال تھا کہ نائب صدر
ملک کے ایک بازو کی اور صدر دوسرے بازو کی نمائندگی کرے۔ یہ خیال کہ مشکل
فرائض کی ادائیگی میں نائب صدر اس کا ہاتھ بٹا سکے گا درست نہ تھا۔ اس
کے سامنے صورتِ حال کا پورا نقشہ نہ آ سکتا تھا۔ بڑے بڑے مسائل صدر ہی کے پاس
جاتے اور نائب صدر کی ذمہ داری کو دفتر کی دستوری کارروائیوں تک محدود رکھنا مناسب
نہ تھا۔ یہ خیال کہ نائب صدر کی حیثیت انتخابی ساتھی کی ہو خود بھی دراصل کچھ معنی نہ
رکھتا تھا۔ سب سے اہم ضرورت بہرحال یہ ہوتی ہے کہ صدر کے عہدے کے لیے قابل
ترین آدمی تلاش کیا جائے کیونکہ اسی پر بہت سی باتوں کا دار و مدار ہوتا۔ اگر اسے
کسی دوسرے درجے کے آدمی کے ساتھ نتھی کر دیا جاتا تو وہ نقش جو انتخابی فیصلے کا
سرچشمہ تھا دھندلا جاتا۔

اسی طرح یہ دلیل بھی کچھ جان نہ رکھتی تھی کہ انتخابی ساتھی اپنے صوبے میں صدر
کے لیے ووٹ حاصل کرے گا۔ صدارت کے امیدوار کو ایک قومی شخصیت ہونا چاہیئے
جسے ملک کے تمام علاقوں کے لوگوں کا اعتماد حاصل ہو۔ اگر وہ ملک کے ایک حصے میں
سیاسی حمایت حاصل کرنے کے لیے نائب صدر کا محتاج ہوگا تو وہ کبھی اعلیٰ درجے
کا صدر نہ بن سکے گا۔ علاوہ ازیں ملک کے ایک بازو کی نائب صدر کے ذریعے
نمائندگی لازمی طور پر مشرقی و مغربی صوبوں میں تنازعات پیدا کر دیتی اور خود
صدارتی کابینہ میں پھوٹ پڑ جاتی۔ البتہ ضرورت ایک ایسے قائم مقام کی تھی جو
صدر کی وفات یا ملک سے اس کی غیر حاضری کی صورت میں ملک کا انتظام سنبھال
سکتا۔ یہ مقصد اس قسم کی رسم قائم کرنے سے حاصل ہو سکتا تھا کہ اگر صدر ایک بازو
سے تعلق رکھتا ہو تو قومی اسمبلی کا اسپیکر دوسرے بازو سے' اور وہ صدر کی غیر
موجودگی میں اس کی قائم مقامی کرے۔

آئینی کمیشن نے میزانیہ اور مطالبات زر کے سلسلے میں صدر اور مقننہ میں

اختلاف پیدا ہو جانے کی صورت میں ایک بڑے الجھے ہوئے طریق کار کی سفارش کی تھی۔ میں نے کمیشن کے اس خیال سے تو اتفاق کیا کہ صدر کو ویٹو کا حق جزوی طور پر حاصل ہونا چاہیئے، مگر دوسری سفارشات کو منظور نہ کیا، جن میں کہا گیا تھا کہ اگر صدر اور مقننہ کے اراکین کا اختلاف مٹ نہ سکے تو ان کا از سرِ نو انتخاب کرایا جائے۔ میں نے محسوس کیا کہ اگر ہم اس طریق پر کار بند ہوئے تو حکومت کو استحکام حاصل نہیں ہو سکے گا۔ کمیشن کا کہنا تھا کہ مقننہ کے ممبر تازہ انتخابی مقابلے کے ڈر سے غیر ذمہ دارانہ طور پر صدر سے اختلاف نہ کر سکیں گے لیکن اگر ہم بنیادی جمہوریتوں کے ممبروں کو انتخابی ادارہ قرار دیں، جیسا کہ ہونا چاہیئے، تو مقننہ کے ایک عام رکن کے لیے دوبارہ انتخاب لڑنا کوئی بڑی بات نہ ہو گی۔ اس کے برعکس صدر کے سر پہ یہ زبردست مہم آ پڑے گی کہ وہ ملک بھر میں انتخابی دورے کرتا پھرے کیونکہ اس کا حلقۂ انتخاب اسّی ہزار ووٹروں کی پوری جمعیت پر مشتمل ہو گا۔

اس کا علاج یہ تھا کہ صدر اور مقننہ کے درمیان اختلافات کی وجوہ کو کم سے کم کر دیا جائے۔ میزانیہ کے دو حصے ہوں ایک حصے میں نظم و نسق اور ترقیاتی منصوبوں کے مسلسل اخراجات جو پچھلے سال سے چلے آ رہے ہوں شامل ہوں، اور دوسرا حصہ اخراجات کی نئی مدّوں پر مشتمل ہو۔ پہلے حصے کے اخراجات میں کمی کر لینے کے لیے صدر کی منظوری ضروری ہو اور دوسرا حصہ مقننہ کے اراکین کی رائے پر موقوف ہو۔

(۵)

آئینی کمیشن کی تجاویز کا جائزہ راولپنڈی میں چوبیس سے لے کر اکتیس اکتوبر ۱۹۶۰ء تک گورنروں کی کانفرنس میں لیا گیا۔ میں نے یکم مارچ ۱۹۶۲ء کو ریڈیو پر قوم سے خطاب کرتے ہوئے اس آئین کا اعلان کیا۔ میں نے کہا: "نیا آئین جمہوریت اور نظم و ضبط کی آمیزش ہے اور یہ دونوں ایک آزاد معاشرے کو چلانے کے لیے جو مستحکم حکومت اور ٹھوس نظم و نسق رکھتا ہو دو قابلِ عمل شرطیں ہیں۔"

نئے آئین کو عام طور پر بحسن و خوبی قبول کر لیا گیا۔ اگرچہ بعض اخبارات نے اس پر بڑی نکتہ چینیاں بھی کیں۔ بعض پرانے سیاست دانوں نے سوچا کہ اگر یہ

نیا آئین منصوبہ رواج پا گیا تو ہماری کوئی اہمیت باقی نہیں رہے گی۔ چودھری محمد علی جو ۱۹۵۶ء کے آئین کے خالق تھے شدید ترین نکتہ چینی کرنے والوں میں سے تھے۔ ان کو محسوس ہوا کہ ان کی ابدی شہرت چھینی جا رہی ہے۔ آئین کے جاری ہونے پر ملک کا رویہ ایک ایسے گھوڑے کا سا تھا جو قابو میں آ گیا ہو مگر سدھایا نہ گیا ہو۔ جب آپ اسے چمکاریں یا دانہ دیں وہ کاٹنے کو دوڑے گا اور دولتیاں چلائے گا۔ اول اول یہی صورت حالات رہی اور کوئی سال بھر قائم رہی۔ اس کے بعد حالات پرسکون ہو گئے اور استحکام کی خوبی کو تسلیم کیا جانے لگا۔

ابتدائی دو ایک سال کے دوران میں قومی اسمبلی کے اندر اور باہر، اخبارات کے ذریعے سابق سیاست دانوں یا ایبڈو زدہ سیاست دانوں کی زبانی مجھ پر جو نکتہ چینیاں کی گئیں ان کا مقصد محض یہ تھا کہ میرے عزم کو توڑا جائے۔ وہ سمجھتے تھے کہ اگر وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے تو میرے لیے ان کا تابع فرمان بن جانے کے سوا اور کوئی چارہ نہ رہے گا۔ وہ اپنے اقتدار کو از سر نو استوار کرنا چاہتے تھے اور اگر بادشاہ نہیں تو بادشاہ گر تو ضرور ہی بن جانا چاہتے تھے۔ وہ ملک میں ایسی صورت حال پیدا کرنا چاہتے تھے جس سے نہ صرف میری پوزیشن (جو چنداں اہم بات نہ تھی) بلکہ ملک کی بقا بھی ان کی خوشنودی پر منحصر رہ جائے۔ وہ مجھ کو یہ جتانا چاہتے تھے کہ میں ان کے بغیر ملک کے انتظام کو نہ چلا سکوں گا۔ بس یہی ان کی چال تھی۔

جس زمانے میں آئین کے خلاف تحریک زوروں پر تھی، مجھے ایک سیاستدان کے خیالات کا علم ہوا جن کا لبِّ لباب یہ تھا:

"یہ صدر بڑا عجیب آدمی ہے۔ اسے معلوم نہیں ہے کہ سب کے سب لوگ اس کے خلاف ہیں، وہ یہ بھی جانتا ہے کہ میں ہی تنہا وہ شخص ہوں جو اس شور شرابے کو روک سکتا ہوں اور سمجھوتا کرا سکتا ہوں، مگر دیکھو، اس کو ولایت سے آئے ہوئے دو ہفتے ہو چکے ہیں اور اس نے مجھ سے کوئی پیغام سلام نہیں کیا۔ اس کے دماغ میں ضرور کچھ خلل ہے۔"

ان کا خیال یہ تھا کہ میں گھٹنے ٹیک دوں گا اور کہوں گا کہ اچھا بھئی آپ جیتے اور میں ہارا۔

عجیب بات یہ تھی کہ ان کو بھی اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ ملک کا انتظام میرے بغیر نہیں چلا سکتے۔ وہ مجھے اس وقت تک شہ نشیں پر بٹھائے رکھنا چاہتے تھے جب تک کہ میں انہیں من مانی کرنے کی آزادی دوں۔ وہ اپنے بقول ذاتی طور پر میرے مخالف نہ تھے لیکن وہ میرا زور توڑنا چاہتے تھے۔ وہ مجھے ایسی پوزیشن میں رکھنا چاہتے تھے کہ میں انہیں ملک کو تباہ کرنے سے روک نہ سکوں۔ وہ چٹپٹے دار تقریروں اور کھوکھلی نعرہ بازیوں کے ذریعے قوم تک رسائی چاہتے اور اسے خودغرضانہ مقاصد کے لیے استعمال کرنے کے درپے تھے۔ ادھر میں ہر قیمت پر ان کو روکنے کا تہیہ کر چکا تھا۔ مجھے خداوندکریم اور اپنی قوم پر بھروسہ تھا جس نے مجھے اپنے عزم پر قائم رکھا۔ میں جانتا تھا کہ ہمارے لوگ نیک دل ہیں، مگر بھولے بھی ہیں اور آسانی سے بہکائے جا سکتے ہیں۔ یہ میرا عقیدہ تھا جس نے میری ڈھارس بندھائے رکھی۔ لیکن بڑی آزمائش کے موقع بھی آئے میں اپنے دل میں کہتا، "نیا آئین جاری کرنے پر اس قسم کا غیر ذمہ دارانہ ہیجان قدرتی بات ہے۔ مارشل لا کی بندشیں اٹھ گئی ہیں لوگوں کو اپنے دل کا بخار نکال لینے دیا جائے۔ لیکن اس کا دارومدار اس بات پر تھا کہ میں اپنے ارادے پر قائم رہتا ہوں یا نہیں۔ اس آئین کا آخری امتحان ۱۹۶۵ء کا صدارتی انتخاب ہوگا۔ ملک کی تمام بالغ آبادی پہلی مرتبہ اپنے منتخب کردہ نمائندوں کے ذریعے ملک کے سربراہ کا انتخاب کرے گی۔ اس انتخاب کے نتائج سے پتہ چل سکے گا کہ قوم اس آئین کی حامی ہے یا نہیں۔ اس وقت تک لوگوں کو اپنا ہم خیال بنانے اور ان کی ذہنی تربیت کا کام جاری رہنا چاہئے۔

لوگوں کو سمجھوتے کا اصول سیکھنا چاہیئے کہ کچھ لو اور کچھ دو۔ اس کے بغیر کوئی جمہوری نظام کامیاب نہیں ہو سکتا۔ انسان اپنی ساری باتیں نہیں منوا سکتا۔ اقلیت کو اکثریت کا فیصلہ قبول کرنا چاہیئے۔ نکتہ چینی کا حق ضرور دیا جانا چاہئے لیکن تخریب کا نہیں۔

میرے مخالف بعض اوقات کہا کرتے ہیں، "یہ شخص ڈکٹیٹر بن گیا ہے۔ اس نے ساری طاقت اپنے ہاتھ میں رکھ لی ہے۔" کس طرح؟ یہ میں نہیں سمجھ سکا۔ بہرحال ہر نظام کے تحت پارلیمانی ہو یا صدارتی، شہنشاہی ہو یا ڈکٹیٹری، کوئی نہ کوئی شخص تو ایسا ہوگا ہی جسے بااختیار ٹھہرایا جائے۔ حکومت کا انتظام چلانے میں کئی لوگوں کی امداد شامل ہوتی ہے لیکن آخری فیصلہ تو ایک ہی شخص کو کرنا پڑتا ہے۔ تمام تاریخ میں ویسا ہی ہوا ہے اور آج کل بھی دنیا میں ایسا ہی ہے۔ اگر کسی شخص کو قوم نے چنا ہے

اور وہ اچھا آدمی ہے تو اس پر بھروسا اور اس سے پورا پورا تعاون کرنا ہی پڑتا ہے
جہاں تک مجھے علم ہے اس ملک میں آئینی آزادی کبھی نہ تھی جتنی آج ہے۔ متعدد بار مجھ پر الزامات لگائے گئے، برا بھلا کہا گیا، بدنام کیا گیا اور میرے متعلق طرح طرح کی افواہیں پھیلائی گئیں، بالکل جھوٹ اور بلا وجہ اور یہ ایسے لوگوں کی طرف سے ہوا جن میں بعض ملک بھر کے چھٹے ہوئے بدباطن لوگ تھے، اور میں نے سب برداشت کیا، محض اس وجہ سے کہ میں اس نظام کو پروان چڑھانا اور اس کی حفاظت کرنا چاہتا تھا اور نہیں چاہتا تھا کہ یہ برباد ہو کر رہ جائے۔

میرا خیال ہے کہ اگر لوگ اپنے سربراہ کی عزت کرتے ہوں تو اس کو ڈکٹیٹر بننے کی ضرورت نہیں۔ لوگ اپنا بھلا اسی میں دیکھتے ہیں کہ اس کی پیروی کریں، کیونکہ انسان کی فطرت کا تقاضا ہے اور اس کے بغیر زندگی محال ہے کہ ان کا کوئی رہنما بھی ہو۔ کوئی اپنے لیڈر کو پسند کرتا ہو یا ناپسند فطرت اسے اس کی حمایت پر مجبور کر دیتی ہے، کیونکہ انسان غیر شعوری طور پر جانتا ہے کہ اس کی سلامتی اور مستقبل کا انحصار اسی پر ہے۔ لیکن قوم کے اعتماد کو قائم رکھنے کے لیے رہنما کے لیے بھی ضروری ہے کہ وہ پرخلوص ہو، بے لوث ہو اور دل میں خدا کا خوف رکھتا ہو۔

سابقہ تجربے کو نظر میں رکھتے ہوئے میں نے آئین میں کچھ احتیاطی دفعات رکھ لی تھیں کہ منتظمہ اندرونی دباؤ کی روک تھام کر سکے اور مقننہ کے کام میں کسی قسم کی رکاوٹ بھی نہ پڑے۔ حزب اختلاف یہ بات مزے سے بھول گئی کہ خود قوم نے مجھے منتخب کیا تھا۔ وہ برابر کہے جاتی ہے کہ یہ آئین اس کے سر تھوپا گیا ہے۔ وہ قوم کے نمائندوں سے کہہ سکتے ہیں کہ اس آئین کو بدل دیا جائے۔ آئین میں اس کی امر کی واضح گنجائش موجود ہے کہ اگر کوئی بات لوگوں کی خواہشات کے خلاف ہو تو مقننہ کے ممبر اس میں ترمیم کر سکتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ صدر سے باضابطہ مواخذہ کرنے کی طاقت بھی رکھتے ہیں۔ لیکن اس خیال سے کہ ان گنجائشوں کا فضول استعمال نہ کیا جائے، ان کو عمل میں لانے کے لیے کچھ پابندیاں رکھی گئی ہیں۔

آئینی کمیشن نے صدر، گورنروں، وزیروں، چیف جسٹس اور سپریم کورٹ کے ججوں سے باضابطہ مواخذہ کرنے کی بھی گنجائش رکھی تھی۔ اگر صدر سنگین بد عمالی یا آئین کی دانستہ خلاف ورزی کا مرتکب ہو تو مقننہ کے منتخب شدہ ممبروں کی ایک چوتھائی کی

تحریک پر صدر سے مواخذہ کیا جا سکتا تھا۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ اس قسم کی قرارداد کی تحریک پر قومی اسمبلی کے کل ممبروں کی ایک تہائی کے دستخط ہونے ضروری ہیں۔ کمیشن نے سفارش کی تھی کہ اگر مقننہ کے ممبروں کی دو تہائی تعداد صدر کو قصور وار پاتی ہے تو صدر کو اپنے عہدے سے دست بردار ہونا پڑے گا۔ ہم نے اس میں یہ ترمیم کی کہ تین چوتھائی تعداد ایسی کرنے کی مجاز ہوگی۔ صدر کو غیر ذمہ دارانہ اور انتقامی الزامات سے محفوظ رکھنے کے لیے یہ دفعہ رکھی گئی ہے کہ اگر قومی اسمبلی کے ممبروں کی کل تعداد کا نصف صدر کی برطرفی کی قرارداد کی حمایت نہ کرے تو مواخذے کی قرارداد پیش کرنے والے تمام ممبر اسمبلی کی رکنیت سے محروم ہو جائیں گے۔

میری رائے تھی کہ مواخذہ کئے جانے والے عہدوں کی فہرست سے گورنروں اور وزیروں کو نکال دیا جائے' کیونکہ ان کا تقرر صدر کے ہاتھوں ہوتا ہے اور یہ قدرتی بات ہے کہ اگر صدر مقننہ میں گورنروں اور وزیروں کی مخالفت دیکھے گا تو خود ہی ان کو برطرف کر دے گا "تاکہ اسے مقننہ کا اعتماد حاصل رہے۔ صدر کے نامزدگان کی حیثیت سے ان کو مقننہ کے فیصلے پر چھوڑنے کی ضرورت نہ تھی۔

آئینی کمیشن نے آئین میں ترمیم کرنا بڑا آسان بنا دیا تھا۔ اس نے سفارش کی تھی کہ ہر ایک ترمیم کے لیے صدر کی منظوری اسی طرح ضروری ہو گی جس طرح مقننہ کے اور فیصلوں کے لیے۔ فرق صرف یہ تھا کہ ترمیم کے حق میں دو تہائی اکثریت کی حمایت ضروری ہوتی۔ اگر صدر منظوری نہ دیتا اور بل کو مقننہ میں واپس بھیج دیتا تو اس کے ویٹو کے اثر کو زائل کرنے کے لیے تین چوتھائی اکثریت کی ضرورت ہوتی۔ اس پر ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ ترمیمی بل کو صدر کے پاس منظوری کے لیے بھیجنے سے پہلے اس کو دو تہائی اکثریت کی حمایت حاصل ہونی چاہیئے' لیکن اگر صدر اس بل کو مقننہ میں واپس بھیج دے تو اس کو منظور کرانے کے لیے تین چوتھائی اکثریت کی حمایت ضروری ہو گی تاہم جب بل دوبارہ صدر کی منظوری کے لیے آئے تو صدر اسے ایک بار پھر مقننہ میں بھیجنے کا مجاز ہوگا۔ اور اگر مقننہ کو اب بھی اس بل پر اصرار ہو تو صدر اسے پورے انتخابی ادارے کے پاس استصواب رائے کے لیے بھیج سکتا ہے کہ اس بل کو منظور کیا جائے یا نہیں۔

قومی اسمبلی آئین کے بارے میں کسی ایسے ترمیمی بل کو جس سے کسی صوبے کی حدود بدل جاتی ہوں اس وقت تک پاس نہیں کر سکتی جب تک کہ متعلقہ صوبے کی اسمبلی

سے کل ممبروں کی دو تہائی تعداد ایک قرارداد کے ذریعے اسے منظور نہ کر چکی ہو۔
آئین کی عمارت متعدد ستونوں پر کھڑی کی گئی ہے جو یہ ہیں، صدارتی نظام صوبوں کو زیادہ سے زیادہ اختیارات کی تفویض، صدر کے ذریعے صوبائی گورنروں کا تقرر، بنیادی جمہوریتوں کا انتخابی ادارے کی حیثیت سے قیام۔ وضع قوانین میں مشاورت کے لیے مشاورتی کونسل برائے اسلامی نظریہ حیات اور آخر میں منتظمہ اور مقننہ اور منتظمہ اور عدلیہ کے باہمی روابط۔ ان میں سے اگر کوئی ستون بھی تبدیل کر دیا جائے یا اپنی جگہ سے ہٹا دیا جائے تو ساری عمارت کمزور ہو جائے گی۔ آئین کا ڈھانچا اگر قائم رہے گا تو تمام و کمال قائم رہے گا۔ انتخابی ادارے کے قیام سے بس اتنا ہوا ہے کہ عوام اور صوبائی و مرکزی اسمبلیوں اور صدر کے درمیان ایک اور وسیع اسمبلی قائم کر دی گئی ہے۔
بات یہ ہے کہ نئے خیالات کو مقبولیت حاصل کرنے میں وقت لگتا ہے۔ جب ان خیالات سے فائدے حاصل ہونے شروع ہوتے ہیں تبھی ان کے حامی پیدا ہوتے ہیں یہ حامی پھر ان خیالات کے مبلغ اور محافظ بن جاتے ہیں۔ انسانی معاملات میں یہی ہوتا ہے کہ نئے تصورات نئے مفادات کو جنم دیتے ہیں اور اپنا ایک حلقہ پیدا کر لیتے ہیں۔
میں نے جو اصلاحات نافذ کیں وہ زبردست مفادات پیدا کرنے کا موجب ہوئی ہیں۔ ہر چند ان کو منظم نہیں کیا گیا۔ ملک میں کروڑوں زن و مرد کھیتی باڑی کرتے ہیں اور زرعی اصلاحات کے ذریعے معقول فائدے اٹھاتے ہیں۔ ان کے بعد تجارتی، کاروباری اور تعلیم یافتہ طبقوں کا نمبر آتا ہے جن کو تعلیم اور ملازمت کے زیادہ سے زیادہ مواقع حاصل ہوتے ہیں۔ آج سرکاری ملازمتوں کے لیے موزوں نوجوانوں کا ملنا ایک مسئلہ بن گیا ہے حالانکہ چند سال پہلے سرکاری ملازمت حاصل کرنا زندگی کی سب سے بڑی تمنا سمجھا جاتا تھا۔ اب زندگی کی نئی نئی راہیں کھل رہی ہیں نئی نئی باتیں ہو رہی ہیں نئے نئے مقاصد پیدا ہوئے ہیں اور ایک وسیع تر نیا متوسط طبقہ ابھر رہا ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جو آگے چل کر اس آئین کے قائم کردہ نئے نظام کی دیکھ بھال کریں گے۔ بہرحال اس کے لیے ایک مدت درکار ہوگی۔
میری کوشش یہ رہی ہے کہ اس نئے فلسفے کی نشاندہی کروں جو ہمارے لوگوں کو ایک زیادہ کامل اور زیادہ ترقی پسندانہ زندگی کی طرف لے جائے۔ یہ فلسفہ ایسا ہونا چاہیے جس پر لوگوں کو یقین ہو اور جس کی حمایت و حفاظت پر وہ دل و جان

سے آمادہ ہوں۔ لوگوں کو ایک ایسے نظام سے ہٹانا جو مدت سے چلا آ رہا ہو اور جس سے لوگوں کو وابستگی ہو چاہے وہ نظام زندگی کے لیے ناکامی ہی کیوں نہ ہو، بڑا مشکل کام ہوتا ہے لوگ نئی آزمائشوں کا خطرہ مول لینے کی بجائے سہل انگاری کی وجہ سے پرانے طور طریقوں کو گلے سے لگائے رہتے ہیں۔ اس کی سب سے نمایاں مثال پارلیمانی نظام حکومت ہے جیسے ہی میں نے ایک نیا اور زیادہ عملی نظام پیش کیا بعض لوگوں نے یہ ہنگامہ شروع کر دیا کہ میں دائمی اقتدار کے لیے کوشش کر رہا ہوں۔ حالانکہ یہ بات میرے وہم و خیال سے بہت بعید ہے۔ البتہ میں جس بات کو دوام دینا چاہتا ہوں وہ ہے ترقی اور نشو و نما کی نئی روایات مجھے امید ہے کہ میں کچھ لوگوں کو اپنے اس طریق فکر اور طریق حیات کا ہم خیال بنا رہا ہوں۔ میں یہ بھی محسوس کرتا ہوں کہ اس طریق حیات کو دراصل نئی پود ہی سر بلند کر سکتی ہے۔ ضرورت ہے کہ نئی اور جواں سال قیادت پرانی رہنمائی کی جگہ لے لے۔ میں ایسے حالات پیدا کر رہا ہوں کہ بجائے نوجوان اس ذمہ داری کا بوجھ اٹھا سکیں کیونکہ تنہا وہی اس روایت کو آگے بڑھائیں گے اور اس کی اصلاح کریں گے۔

میرا بس ایک ہی ذاتی مفاد ہے، اور وہ ہے اس نظام کی حمایت اور حفاظت کرنا جس کے لیے میں نے اپنا خون پسینہ ایک کیا ہے مجھے اس سلسلے میں بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا ہے، اور میں یہ گوارا نہ کروں گا کہ اسے محض ایک کھیل سمجھ لیا جائے آپ اس میں ترمیم کر سکتے ہیں، اس کو بدل سکتے ہیں، لیکن تجربے کی روشنی میں عقیدہ و یقین کے جذبے کے ساتھ، اور عوام کی بھلائی کے لیے مگر کسی اور سبب سے نہیں۔ صدارتی نظام میں اگر صدر کا عہدہ کسی ایسے شخص کو ملتا ہے جو ہر قسم کے دباؤ کا مقابلہ کر سکتا ہو تو اس بات کا پورا امکان ہے کہ پانچ یا دس برس کے اندر نئے ادارے اچھی طرح جڑ پکڑ لیں گے، تعلیم اور زیادہ پھیل جائے اور ایک وسیع تر متوسط طبقہ وجود میں آ سکے۔ اس وقت تک ان نئے اداروں کی حفاظت کے لیے خاصے لوگ پیدا ہو جائیں گے۔ آج پاکستان کو بس یہی مسئلہ درپیش ہے۔

پچھلے پارلیمانی نظام اور موجودہ نظام میں ایک بہت بڑا فرق یہ ہے کہ ہر چند موجودہ قومی اسمبلی قوانین وضع کرنے میں خود مختار ہے، مگر وہ حکومت کو بدل نہیں سکتی۔ یہ سچ ہے کہ حزب مخالف کا جوڑ توڑ رہیں گے۔ بنا اور کیچڑ اچھالنا پہلے کی طرح آج بھی جاری ہے، مگر یہ لازمی بات ہے خصوصاً اس لیے بھی کہ ہماری نئی پارلیمنٹ کے

ممبر ناتجربہ کار ہیں۔ ضروری امر یہ ہے کہ انھیں تقریر اور اظہار خیال کی پوری آزادی
حاصل ہے۔

میں یہاں کے بارے میں اپنے ایک غلط اندازے کا اعتراف کرنا ضروری سمجھتا ہوں
نام نہاد سیاسی پارٹیوں کے ارکان کی غداری کے نقصانات دیکھنے کے بعد مجھے امید تھی
کہ ہم پارٹی بازی کے بغیر اپنی سیاست کو قائم رکھ سکیں گے۔ چنانچہ اس آئین کا ڈھانچا
ایسا بنایا گیا تھا کہ نظریاتی طور پر وہ سیاسی پارٹیوں کے ساتھ بھی کام کر سکے اور ان کے
بغیر بھی۔ لیکن آئین رائج کرنے کے بعد جلد ہی مجھے احساس ہوگیا کہ سیاسی پارٹیوں کے بغیر
کام نہیں چل سکتا۔ مقننہ کے اندر اراکین کو صرف پارٹی کے نظم و ضبط کے تحت ہی منظم
کیا جا سکتا ہے۔ مقننہ کے باہر بھی ایک ایسے ادارے کا ہونا ضروری تھا جو لوگوں کے ساتھ
رابطہ قائم رکھ سکے۔ علاوہ ازیں اس امر کی بھی ضرورت تھی کہ دیہات کے لوگوں پر حکومت
کی پالیسیوں کی وضاحت کی جائے۔ یہ کام ایک سیاسی پارٹی ہی کر سکتی تھی۔ چنانچہ میں
اس نتیجے پر پہنچا کہ موجودہ حالات میں ہم سیاسی پارٹیوں کے بغیر اس نظام کو نہیں چلا سکتے۔
اور میرے خیال میں آئین کے اطلاق کے بعد پہلے سال اس لیے ابتری پھیلی رہی کہ مسلم لیگ
پارٹی کو از سر نو منظم کرنے میں وقت لگا، خصوصاً مرکزی اور صوبائی مقننہ میں۔ یہ کوئی
تعجب کی بات نہ تھی کیونکہ مقننہ کے ممبر شخصی اوصاف کی بنا پر چنے گئے تھے اور میں
ان میں سے بہت کم کو جانتا تھا۔ میں نے انتخابات سے پہلے صوبائی گورنروں اور سرکاری
عہدے داروں سے کہا تھا کہ یہ انتخابات ہر قسم کے اثرات اور دخل اندازیوں سے پورے
طور پر آزاد رہنے چاہئیں۔ میں نے ان کو تنبیہ کی تھی کہ اگر مجھے معلوم ہوا کہ کسی شخص نے
کسی طریق سے بھی ان انتخابات میں دخل دیا ہے تو مجھے سخت شکایت ہوگی۔ اگر ہم
انتخابات سے پہلے سیاسی پارٹیوں کو بحال کرنے کا فیصلہ کر لیتے تو مجھے یقین ہے کہ
حکومت کو مقننہ میں بڑی پرزور حمایت حاصل ہو جاتی۔ مجھے پارٹیوں کو بحال کرنے
کا مشورہ تو دیا گیا تھا مگر تامل کے ساتھ اور دبے دبے لفظوں میں۔ انسانی فطرت کا
خاصا ہے کہ جس بات سے اسے ضرر پہنچا ہو اس سے حذر کرے اور ہم نے پارلیمانی سسٹم
کے ہاتھوں بڑی تکلیفیں اٹھائی تھیں۔

جب میں پاکستان مسلم لیگ میں شامل ہوا تو اس پر ملک میں بڑے تعجب کا اظہار
کیا گیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ میری طرح اور بھی لوگوں کا یہ خیال تھا کہ ہم آئین کو

سیاسی پارٹیوں کے بغیر ہی چلا سکتے ہیں. لیکن میرے ایک سیاسی پارٹی میں شامل ہونے کے فیصلے پر سیاست دانوں کو بھی خاصی پریشانی ہوئی، کیونکہ یہ لوگ مجھ کو الگ تھلگ اور بے آسرا ہی رکھنا چاہتے تھے. سوال یہ تھا کہ جب پارٹیوں کو قانونی طور پر قائم ہونے کی اجازت مل گئی تو کیا میں پارٹی سسٹم سے الگ رہ سکتا تھا؟

بعض لوگ مجھ سے کہتے ہیں کہ آپ ایک حزب اختلاف کے قیام میں مدد دیں. یہ درحقیقت بڑا غیر معمولی مطالبہ ہے. میں بھلا یہ کیونکر کر سکتا ہوں جبکہ ہماری بیشتر مخالف پارٹیوں کا نصب العین شدید صوبائیت، مذہب سے ناجائز فائدہ اندوزی اور غیر ملکی وفاداری پر مبنی ہو؟ ہاں اگر کوئی مخالف پارٹی پاکستان میں مسلم قومیت اور ایک مضبوط مرکز کے لیے کام کرے تو اس کو میری حمایت حاصل ہوگی.

بدقسمتی سے خود مقننہ تک کے اندر حزب مخالف نے ایسا رویہ اختیار کر رکھا ہے جس سے میں تمام تر اپنی ہی پارٹی پر بھروسہ کرنے پر مجبور ہوں. حالانکہ اسکی ضرورت نہ ہونی چاہیئے. صدر کو اپنی کابینہ کے لیے مقننہ کے اندر یا باہر سے لوگوں کو چننے کی پوری آزادی ہونی چاہیئے، اور یہ انتخاب ذاتی جوہر اور مقننہ کے اندر یا باہر حمایت کی بنا پر ہونا چاہیئے، جماعتی روابط کی بنا پر نہیں. صدر کی کابینہ کا ہمارے حالات کے تحت یک جماعتی کابینہ ہونا ضروری نہیں، بلکہ غلط ہے.

(۶)

آئین پر یہ بحث ختم کرنے سے پہلے میں ایک غیر معمولی صورت حال کا ذکر اور کردوں جو دونوں صوبوں میں خاصی کشیدگی اور غلط فہمی کا باعث ہوئی. یہ "عدم مساوات" کا نعرہ ہے، جس نے بڑی سماجی اہمیت حاصل کرلی ہے اور جس سے عام طور پر یہ مراد لی جاتی ہے کہ دونوں صوبوں میں مساوات قائم نہیں لفظ کا استعمال بڑا غلط کیا جاتا ہے اور اس میں ہر قسم کی شکایتیں اور گلے شکوے آجاتے ہیں جو اکثر ذاتی قسم کے ہوتے ہیں. اگر کسی ملازمت کے امیدوار میں مطلوبہ صفات نہیں ہوتیں اور اس بنا پر اسے منتخب نہیں کیا جاتا تو وہ اس کا الزام "عدم مساوات" پر رکھتا ہے. اسی طرح اگر کوئی بیوپاری پٹ سن کا کارخانہ کھولنے کے لیے کافی سرمایہ اکٹھا نہیں کر سکتا تو اس کا باعث بھی "عدم مساوات" ہی ہوتا ہے. پٹ سن

کے کارخانے کا مالک بھی اپنے کاروبار میں نقلی مصنوعات اور ادویہ سازی کا اضافہ نہیں کر سکتا تو وہ خود کو بھی "عدم مساوات" کا مارا ہوا قرار دیتا۔ بے بس سیاست والوں نے اس عام بے صبری کو اپنی غرض کے لیے استعمال کیا اور اسے ایک مقبول سیاسی نعرے میں تبدیل کر دیا۔ وہ مرکزی حکومت اور مغربی پاکستان کے خلاف اپنی ساری مہم کی بنیاد عدم مساوات پر رکھتے ہیں۔

عدم مساوات کو سب تسلیم کرتے ہیں اور اس کے مٹانے کی ضرورت کو بھی۔ لیکن جس بات کو نظر انداز کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ "عدم مساوات" ترقی کے راستے کی ایک منزل ہے۔ آزادی کے وقت پاکستان کے تمام حصے یکساں طور پر ترقی یافتہ یا پسماندہ نہ تھے۔ مغربی پاکستان کے بعض حصے صنعتی ترقی میں نسبتاً آگے تھے۔ اس کے برعکس مشرقی پاکستان میں جدید صنعت نہ ہونے کے برابر تھی۔ جب برصغیر کے وسطی اور مشرقی علاقوں میں انگریزی حکومت نے اپنے قدم جمائے تو تمام تجارتی اور صنعتی سرگرمیوں کے مرکز کلکتہ میں فورٹ ولیم کے ارد گرد ہی تک رہے۔ جب ہندوستان براہ راست برطانوی قلمرو میں آ گیا، تب بھی صورت حال میں کوئی خاص فرق نہ پڑا۔ مشرقی پاکستان کی حیثیت کلکتہ کے عقبی علاقے ہی کی رہی۔ ہر چند یہ علاقہ دنیا بھر کے پٹ سن کا پچھتر فی صد حصہ پیدا کرتا تھا، مگر وہاں پٹ سن کا ایک بھی کارخانہ نہ تھا۔ ساری پیداوار خام گانٹھوں کی صورت میں کلکتہ بھیج دی جاتی، جہاں اسے صاف کر کے بیرونی ملکوں کو بھیجا جاتا۔ نقل و حمل اور مواصلات کی سہولتیں بڑی ابتدائی شکل میں تھیں اور کوئلہ، گیس، تیل، بجلی اور پانی وغیرہ قدرتی ذرائع سے فائدہ اٹھانے کی بھی کوئی کوشش نہ کی گئی تھی۔

جب مشرقی پاکستان کی نئی پود کو یہ باتیں یاد دلائی جاتی ہیں تو وہ سمجھتی ہے کہ اس کی موجودہ مشکلات کا جواز پیش کرنے کے لیے گزشتہ تاریخ یاد دلائی جا رہی ہے۔ ان لوگوں کو ایسے مطالبات پر اکسایا جاتا ہے کہ ملک کے دوسرے حصوں میں ساری ترقی روک دی جائے، تا وقتیکہ یہ صوبہ ان کے برابر نہ آ جائے۔ وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ ترقی کا جو جذبہ ان کے اندر ہے وہ اسی شدت کے ساتھ ملک کے دوسرے لوگوں میں بھی موجود ہے۔

یہ بات گمان میں نہیں آ سکتی کہ کوئی حکومت ایک علاقے کے لوگوں کو اس وقت تک

اپنی استعداد سے کم کام کرنے پر مجبور رکھے، جب تک دوسرے علاقے کے لوگ بھی اپنے اندر کام کرنے کی اتنی ہی استعداد پیدا نہ کرلیں۔ ایک فلاحی ریاست کا یہ مقصد ہونا چاہئیے کہ وہ فاصلوں کو کم کرے اور اونچ نیچ کو مٹائے، لیکن اس طرح کہ جو علاقے پیچھے رہ گئے ہوں انہیں ترقی کے زیادہ مواقع بہم پہنچائے جائیں، نہ یہ کہ جو علاقے نسبتاً ترقی یافتہ ہوں، انھیں ترقی کے مواقع سے محروم کردیا جائے یہ ایک نغول اور بے نتیجہ پالیسی ہوگی کہ ملک میں یکسانیت پیدا کرنے کے لیے ہر طرف ترقی کی سطح کو نیچا کردیا جائے۔

مغربی پاکستان میں علاقائی عدم مساوات کا مسئلہ بڑی حد تک اس طرح حل ہو گیا کہ سابق صوبوں کو ایک وحدت میں سمو دیا گیا۔ اب وہاں تمام ذرائع کو سماجی ترقی کے کاموں میں استعمال کیا جارہا ہے، جس سے سابق صوبائی حدود کا لحاظ کیے بغیر سارے مغربی پاکستان کو یکساں فائدہ پہنچ رہا ہے۔

مشرقی پاکستان کی اقتصادی ترقی سے مجھے خاص لگاؤ رہا ہے۔ میں نے ۱۹۵۴ء والی دستاویز میں لکھا تھا کہ مشرقی پاکستان کو ایک برابر کے ساجھی کی حیثیت میں لے آنا چاہیئے۔ اس صورت میں یہ صوبہ قومی معاملات میں پوری طرح دوسروں کے ساتھ چل سکے گا۔ ہر چند مسٹر سہروردی نے ۱۹۵۷ء میں جب وہ وزیر اعظم تھے، اعلان کیا تھا کہ مشرقی پاکستان نے مغربی پاکستان کے ساتھ بقدر ۹۸ فی صد مساوات حاصل کرلی ہے، میں نے یہ امر ضروری سمجھا کہ بین العلاقائی یا علاقائی مساوات دور کرنے کے لیے خود آئین کے اندر گنجائش رکھ دی جائے۔ آئین میں قانون سازی کا یہ اصول بنایا گیا ہے کہ کوئی ایسا قانون نافذ ہی نہ کیا جائے جس سے کسی خاص زبان، رسم الخط یا تہذیب و تمدن کی ترقی میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہو۔ آئین سوچے سمجھے اصول کے طور پر حکومت کو ہدایت کرتا ہے کہ پس ماندہ طبقوں اور پس ماندہ علاقوں میں عوام کی تعلیمی و اقتصادی مفادات کو بطور خاص ترقی دینے کا پورا خیال رکھا جائے۔

آئین میں یہ شرط بھی موجود ہے کہ لوگوں کو پاکستان کی ملازمت میں داخل کرتے وقت اس امر کا خاص لحاظ رکھا جائے کہ ایک علاقے سے نسبت رکھنے والے کام اسی علاقے کے لوگ انجام دے سکیں۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ مرکزی حکومت میں پاکستان کے تمام حصوں کے لوگوں کو سرکاری ملازمت مہیا ہوسکے۔

صدر انڈونیشیا ڈاکٹر سوئیکارنو کے ساتھ راولپنڈی میں
۱۹ ستمبر سنہ ۱۹۶۴ء

اس عام پاس و لحاظ کے علاوہ آئین میں اس امر کو بھی ملحوظ رکھا گیا ہے کہ مرکزی حکومت کے تمام شعبوں میں مشرقی و مغربی صوبوں کے درمیان امکانی حد تک مساوات قائم رکھی جائے۔ اسی طرح آئین کا یہ بھی تقاضہ ہے کہ پاکستان کے تمام حصوں کے لوگ پاکستان کی دفاعی سروسوں میں خدمات انجام دے سکیں۔

کم ترقی یافتہ علاقوں کی مخصوص اقتصادی ضرورتوں کا لحاظ کرتے ہوئے آئین کی دفعہ ۱۴۵ کے تحت قومی اقتصادی کونسل کے ذمے یہ بات ڈالی گئی ہے کہ وہ ایسے منصوبے تیار کرے کہ صوبوں کے درمیان اور صوبوں کے مختلف علاقوں کے درمیان فی کس آمدنی غیر مساوی نہ رہے۔ کونسل اس بات کی بھی ذمہ دار ہے کہ پاکستان کے وسائل جن میں غیر ملکی زرمبادلہ کے وسائل شامل ہیں، اس طریق سے استعمال اور تقسیم کئے جائیں کہ مختصر سے مختصر وقت میں صوبائی اور علاقائی عدم مساوات ختم ہو سکے۔ قومی اقتصادی کونسل کا یہ فرض ہے کہ وہ ہر سال قومی اسمبلی میں اپنی رپورٹ پیش کرے اور بتلائے کہ عدم مساوات دور کرنے کے سلسلے میں کیا نتائج نکلے اور کیا ترقی ہوئی۔

ہیں نے آئین میں ان شرائط کو رکھنے کا اس لیے فیصلہ کیا کہ عدم مساوات دور کرنے کے مسئلے کو ذاتی یا تنگ نظری کی سطح سے بلند رکھا جا سکے۔ سیاسی طور پر مشرقی پاکستان کو قومی اسمبلی اور صدر کی وزارتی کونسل میں مغربی پاکستان کے مساوی نمائندگی دی گئی ہے۔ لیکن جہاں تک اقتصادی رفتار ترقی کا تعلق ہے اس میں مساوات پیدا کرنے کے لیے صرف آئینی دفعات کافی نہیں ہو سکتیں۔ حکومت مساوات کے اصول کو مانتی ہے مگر ضرورت ہے کہ عوام بھی اپنی ذمہ داری کو محسوس کریں۔ وسائل میں مساوات اور مواقع میں مساوات کے مطالبات کرنا ہی کافی نہیں ہے، بلکہ سعی و کوشش میں بھی مساوات ہو لہٰذا عام مساوات کے نعرے کو ذاتی کوتاہیوں اور خامیوں کی آڑ نہیں بنانا چاہیئے۔

میں سمجھتا ہوں کہ مشرقی پاکستان کی اقتصادی استعداد کی تعمیر و ترقی میں اور اسے مغربی پاکستان کے نسبتاً زیادہ ترقی یافتہ علاقوں کے ہم پلہ بنانے میں ہمیں اچھی خاصی کامیابی ہوئی ہے۔ ۵۸-۱۹۵۷ء تک مشرقی پاکستان کو اس مجموعی رقم میں سے جو مرکزی حکومت صوبوں کی اعانت کے لیے مختص کرتی تھی، چالیس فیصد سے زیادہ حصہ نہیں ملتا تھا۔ تازہ ترین اعداد و شمار کے مطابق ۶۷-۱۹۶۶ء کے دوران میں مشرقی پاکستان کو مرکزی حکومت سے ایک ارب ۴۷ کروڑ ۶۲ لاکھ ۱۰ ہزار روپیہ ملے گا۔ اس کے مقابلے میں مغربی پاکستان کے حصے میں ایک ارب ۲۰ کروڑ ۷ لاکھ کی رقم آئے گی۔ اس بیان میں کوئی صداقت نہیں کہ مشرقی پاکستان کی زرمبادلہ کی آمدنی کو مغربی پاکستان پر خرچ کیا جاتا ہے۔ ۶۴-۱۹۶۳ء میں حالت یہ تھی کہ مشرقی پاکستان کو غیر ملکی تجارت کے توازن میں ۲۴ کروڑ ۴۴ لاکھ روپے کا اور بین الصوبائی تجارت کے توازن میں ۲۸ کروڑ ۱۹ لاکھ روپے کا خسارہ تھا۔ ۶۵-۱۹۶۴ء میں مشرقی پاکستان کے غیر ملکی تجارت کے توازن میں ۴۴ کروڑ ۵۴ لاکھ روپے کی اور بین الصوبائی تجارت کے توازن میں ۳۸ کروڑ ۲۱ لاکھ روپے کی کمی تھی۔ یہ اعداد و شمار اس بات کا روشن ثبوت ہیں کہ مشرقی پاکستان کا سرمایہ مغربی پاکستان کو منتقل نہیں ہوتا، اور نہ مشرقی پاکستان کی غیر ملکی زرمبادلہ کی آمدنی مغربی پاکستان پر خرچ کی جاتی ہے۔

ضرورت ہے کہ سارا ملک قومی ترقی کی جدوجہد میں پورا پورا حصہ لے محض مساوات کے مطالبے ہی نہ کئے جائیں بلکہ سعی و کوشش میں بھی مساوی حصہ

لیا جا سکے۔

(۷)

ہر صورت میں عوام کو ساتھ لے کر چلنا ضروری ہوتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ آپ کے پاس کوئی اعلیٰ درجے کا خیال ہو، لیکن وہ اسی صورت میں کارآمد اور مؤثر ہو سکتا ہے کہ اس کو عمل میں لایا جائے اور خیال کو صرف عوام ہی عمل میں لا سکتے ہیں۔ جب تک لوگ کسی خیال کی خوبی پر یقین نہ رکھتے ہوں اور اس پر عمل کے لیے تیار نہ ہوں، سارا مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ میرا نقطۂ نظر اور میرا طریق عمل ہمیشہ یہ رہا ہے کہ میں ایک پاکستانی ہوں، میرے دل میں اپنے عوام کا اور اپنے ملک کا درد ہے۔ مجھے چند باتیں سوجھی ہیں جن کے لیے میرے دل میں لگن ہے۔ آپ ان باتوں کو آزما دیکھیے کہ شاید ان میں آپ کی بہتری ہو۔ میں نے کبھی کوئی ایسی بات جس سے عوام کو نقصان پہنچتا ہو، ان سے زبردستی منوانے کی کوشش نہیں کی۔

جو آئین میں نے تیار کیا ہے وہ کوئی باہر سے لائی ہوئی جڑی بوٹی نہیں، بلکہ گھر کا پروان چڑھا ہوا پودا ہے۔ یہ ملکی حالات، ملکی تقاضوں اور عوام کے مزاج سے مطابقت رکھتا ہے۔ اس میں جمہوریت کے تمام عناصر موجود ہیں۔ یہ قابل عمل ہے اور ملک کو استحکام بخشے گا۔ مجھے موجودہ نظام کی معقولیت پر پورا یقین ہے۔ لیکن اس کو منصفانہ طریق پر آزمانا عوام کا کام ہے، اور انھیں کو اس کی سلامتی کی حفاظت کرنی ہوگی۔ دنیا میں کوئی ادارہ یا نظام ایسا نہیں جس کو بگاڑا یا بدنام نہ کیا جا سکتا ہو۔ لیکن اس کے ذمہ دار وہ لوگ ہوتے ہیں جو قوم کے وسیع تر مفادات کو نظر انداز کرتے ہوئے اسے اپنے چھوٹے موٹے ذاتی مقاصد کیلئے استعمال کرتے ہیں۔

تاریخ ہمیں بار بار موقع نہ دے گی۔ ہمیں جو مواقع حاصل ہیں انھی سے پورا فائدہ اٹھانا ہوگا۔ اگر ہم اپنے موجودہ نظام کو ترقی دینے میں ناکام رہے تو ہمارے لیے سوائے ایک تاریک اور درہم برہم مستقبل کے اور کیا رکھا ہے!

کراچی میں شاہکار

کراچی میں شاہکار پیپر بیک کتابوں کے حقوق تقسیم و فروخت رہبر نیوز ایجنسی کو حاصل ہیں۔ نئی شاہکار کتب ہر بک سٹال پر دستیاب ہوتی ہیں۔ لیکن تمام نئی و پرانی مجلد شاہکار کتب مندرجہ ذیل اسٹاکسٹ حضرات سے ہر وقت مل سکتی ہے :۔

لانڈھی :۔ ہاشمی کتاب گھر۔ قائد آباد۔
ملیر :۔ ہلال نیوز پیپر ایجنسی ملیر سٹی۔ احتشام نیوز ایجنسی نزد شمع سینما۔
ڈرگ کالونی :۔ اسلامک نیوز سنٹر۔
بہادر آباد :۔ اسلم نیوز پیپر سٹال۔
طارق روڈ :۔ انٹرنیشنل بک سٹال
نرسری :۔ ماڈل بک سٹال
صدر :۔ کیپٹل نیوز کارنر کیپٹل سینما گلی۔ خان محمد نیوز پیپر سٹال بوہری بازار۔
طاہر نیوز پیپر سنٹر صدر۔ حبیب کیفے ٹیریا نیوز پیپر سٹال ریگل بس سٹاپ۔
شہاب ایم۔ ایس نیوز ایجنسی۔
برنس روڈ :۔ لائٹ آف پاکستان بکسٹال کارنر محمد بن قاسم روڈ۔
چورنگی :۔ ہما بکسٹال۔ ماما شرافت حسین چورنگی
ناظم آباد :۔ غفار سٹی بکسٹال، ناظم آباد نمبر ۲
پاپوش نگر :۔ معز بکسٹال، چاندنی چوک۔
جیلانی منزل :۔ اردو محل، جیلانی منزل۔
لیاقت آباد :۔ ہدایت اللہ بکسٹال۔ لیاقت آباد ڈاکخانہ
اردو بازار :۔ کراچی بک ڈپو

شاہنامۂ اسلام
منظوم تاریخ اسلام
صدا کر چلے
اسلامی انسائیکلوپیڈیا
آپ بیتیاں
سوانح